دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

الندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہو

مرتبہ

سید ابوالحسن علی ندوی

استاذ تفسیر و ادب

عبدالسلام قدوائی ندوی

استاذ تاریخ و اقتصادیات

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۲ محرم الحرام ۱۳۶۰ھ مطابق فروری ۱۹۴۱ء نمبر ۲

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ چندہ دو روپیہ

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر منیجر رسالہ الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہئے

شذرات

جنوری کا رسالہ عرصہ ہوا حاضر خدمت ہو چکا ہے اب نئے سال کا یہ دوسرا پرچہ روانہ ہو رہا ہے اس تیرہ چودہ مہینے کی مدت میں رسالہ نے جو تدریجی ترقی کی اس کے متعلق ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رسالہ آپ کے ہاتھ میں ہے آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں. گذارش صرف یہ ہے کہ آپ اسے اپنی چیز سمجھیں لوگوں کو اس جانب توجہ دلائیں اور اس کی اشاعت کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں ندوہ کے ارکان اور درسگاہوں کے طالب علموں اور ندوی دوستوں سے خصوصیت سے گذارش ہے اور امید ہے کہ وہ اس بارہ میں غیر معمولی توجہ سے کام لیں گے۔

برما کے مدرسہ ندوۃ المسلمین کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے یہ مدرسہ مولوی سکندر احمد ندوی اور مولوی افلاطون احمد ندوی کی کوششوں سے گذشتہ سال قائم ہوا تھا پہلے اس کا مرکز نانگچنگ (NINGOHANG) میں تھا لیکن امسال یہ لوگ اسے ٹیمنگ چونگ، بوتھیڈانگ (TAIMONGCHONG, BOTHIDONG) اکیاب میں لے آئے ہیں متوسطات تک تعلیم کا انتظام ہے نصاب اور طرز تعلیم میں ندوہ ہی کا اصول پیش نظر ہے عربی زبان اور علوم دینی کی نشر و اشاعت کے ساتھ اس مدرسہ کا یہ بھی مقصد ہے کہ برما کے مسلمانوں میں اردو کو رواج دیا جاوے تاکہ انکی ذہنی سطح بلند ہو ان کے خیالات کا دائرہ وسیع ہو اور ہندوستان کی اسلامی برادری سے ان کے تعلقات پیدا ہو سکیں اس غرض سے مدرسہ کے کارکنوں نے ایک دار المطالعہ قائم کیا ہے انکی خواہش ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی اس کام میں انہیں مدد دیں ہمیں امید ہے کہ اردو کی اشاعت گاہیں اور اردو اخبارات و رسائل اس جانب ضرور توجہ کریں گے۔

معین الندوہ کا کام بحمد اللہ ترقی پذیر ہے ملک کی تجارتی ابتری، اقتصادی بدحالی اور سیاسی کشاکش کے باوجود کچھ نہ کچھ کام آگے بڑھ رہا ہے ندوہ کے ہمدردوں کو یہ سنکر مسرت ہوگی کہ پچھلے دنوں بنگال و آسام میں بھی معین الندوہ کا حلقہ قایم ہوگیا ہے مولوی عتیق احمد ندوی اس حلقہ کے ناظم مقرر ہوئے ہیں ہمیں امید ہے کہ بنگال و آسام کے مسلمان اس کام میں حسب حیثیت حصہ لیکر پوری ہمدردی دیں گے ندوہ کے ہمدردوں اور ندوی دوستوں سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ندوہ کا کام خود ان کا کام ہے ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں گے اور پوری قوت سے معین الندوہ کے کام کو آگے بڑھانے کی سعی کریں گے۔

طلبائے قدیم کے تازہ اجلاس نے ایک تجویز منظور کی تھی کہ تمام ندوی اپنے پتوں اور مشاغل سے دفتر کو مطلع کریں اس سلسلہ میں ناظم صاحب ایک یادداشت مرتب کر رہے ہیں جس میں ندویوں کے خود نوشت حالات جمع کئے جائیں گے تاکہ یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ ندوہ کی تعلیم دینی خدمت کے اعتبار سے عملاً ملک و ملت کے لئے کیسی ثابت ہوئی انکی خواہش ہے کہ تمام ندوی اپنے حالات قلمبند کرکے انجمن طلبائے قدیم (مرکزی) دارالعلوم ندوۃ العلماء بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر اولین فرصت میں بھیجدیں تاکہ وہ مجموعہ جلد شایع ہوسکے۔

میری محسن کتابیں

از مولانا عبید اللہ صاحب سندھی

سب سے پہلے جس کتاب نے مجھے اسلام کے متعلق صحیح واقفیت دی اور ہندو سوسائٹی میں رہ کر میں ۱۶ برس کی عمر سے پہلے مسلمان ہو گیا، وہ "تحفۃ الہند" ہے۔ تحفۃ الہند کے (میرے ہمنام) مؤلف نے ہندو مذہب کے مشرکانہ عقائد و رسوم کو نقل کرنے کے بعد ہندوؤں کی طرف سے ایک اعتراض نقل کیا ہے کہ مسلمانوں میں بھی مشرکانہ اعمال و رسوم پائے جاتے ہیں۔ اس کا جواب مؤلف نے مختصر طریقہ پر یہ دیا ہے کہ ہم نے ہندو مذہب کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ انکی مستند مذہبی کتابوں سے ماخوذ ہے لیکن اس کے جواب میں جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ اسلام کی مستند کتابوں سے ماخوذ نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے اعمال و رسوم ہیں، جنکا اسلام ذمہ دار نہیں ہے، اور قرآن و حدیث سے انکی کوئی سند پیش نہیں کیجا سکتی، اس موقع پر میرے ساتھی کو جو میری طرح نومسلم تھے توجہ ہوئی کہ وہ اس بات کی تحقیق کریں کہ کیا واقعی اسلام کی مستند کتابیں اس مسئلہ میں بالکل بے داغ ہیں اور اُن میں ان اعمال و رسوم کا کہیں ثبوت نہیں، اس موقع پر ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس میں صرف قرآن و حدیث کے حوالہ سے اسلام کی توحید پیش کی گئی ہو۔ خوش قسمتی سے تحفۃ الہند کے بعد جو دوسری کتاب ہمارے ہاتھ میں آئی وہ مولانا اسمٰعیل شہید کی "تقویۃ الایمان" تھی جو اس سوال کا جواب شافی تھی اور جس سے ہمکو معلوم ہو گیا کہ اسلام کی توحید بالکل خالص ہے اور قرآن و حدیث مسلمانوں کے ان اعمال و رسوم سے بالکل بری ہیں۔

ان دونوں کتابوں سے میں اسلام کے متعلق ایسا صحیح عقیدہ پیدا کر سکا کہ آجتک شاید میں اسمیں ایک حرف بھی اضافہ نہیں کر سکا

دیوبند کی طالب علمی کے بعد قبلہ نما مولانا محمد قاسم کی کتاب میرے لئے ایک بڑی محسن چیز ہے میں یہ شبہ خود وکبھی دل میں نہیں لا سکا کہ بیت اللہ کے سجدہ میں اور بت پرستی میں کیا فرق ہے؟ مگر جب یہ شبہ میرے سامنے آیا تو میری طبیعت پوری اس کے حل کرنیکی طرف متوجہ ہوئی، میں جب قبلہ نما پڑھ چکا تو گویا میرا سارا بدن نئے ایمانی نور سے بھر گیا اس کے بعض چیدہ چیدہ حصے آجتک میں بے نظیر مانتا ہوں، اس کتاب نے میری ذہنیت میں ایک دوسری تبدیلی پیدا کر دی، دانشمندی حاصل کرنے میں جن مصنفین کی کتابیں مدرسوں میں پڑھی جاتی ہیں ان کے مصنفین کا ایک خاص اثر طالب علم کے دماغ پر پڑتا ہے وہ انکی تحقیقات کو بے نظیر چیزیں سمجھنے لگتا ہے پھر اسی روشنی میں وہ کتاب وسنت سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، مولانا محمد قاسم کو میں نے قبلہ نما میں اسطرح پہچان لیا کہ وہ علامہ تفتازانی، میر سید شریف ایسے بزرگوں سے بہت بڑے ہیں اگر یہ انکی محقق چیزوں کو نہیں مانتے اور اپنا مسلک ان سے جدا مقرر کرتے ہیں اور اپنے مسلک کی پابندی میں اتنے بڑے مشکل مسئلے کو حل کر دیتے ہیں تو ان کا مسلک ان سے میرے نزدیک بہت زیادہ صحیح اور صاف ہے، یہی جراثیم تھے جو آگے چل کر شاہ ولی اللہ صاحب تک پہونچانے کے باعث بنے اگر میں ان درسی کتابوں کے مصنفین کی تقلید سے آزاد نہ ہو جاتا تو کبھی شاہ ولی اللہ کو امام نہ مانتا۔

اس کے بعد میری محسن کتابوں میں "حجۃ اللہ البالغہ" ہے جس کے ذریعے میں قرآن سمجھا، حدیث سمجھا، فقہ سمجھا، حجۃ اللہ کو میں ایک مرکزی حیثیت سے اپنی محبوب کتاب مانتا ہوں ورنہ شاہ صاحب کی ہر سطر میری محسن ہے حجۃ اللہ کے بعد شاہ صاحب کی کتابوں میں سے الفوز الکبیر، فتح الرحمان، بدور بازغہ کی بہت زیادہ اہمیت میرے دماغ میں ہے۔

محسن کتابوں کے سلسلہ میں اگر میں ان کتابوں کے بعد کوئی کتاب لکھوا سکتا ہوں تو وہ مولانا شہید کی عبقات ہے جس نے حجۃ اللہ کے مقدمہ کا کام دیا۔

شاہ صاحب کی تصنیفات کے مطالعہ کی ترتیب اور انکے مقدمات

جس نے سلّم کی شرح پڑھی ہوں اس کا

درجہ تو یہی ہے جو پہلے شرح مطالع پڑھنے والے عالموں کا تھا۔ ایک ذکی نوجوان طالبعلم جب اس درجہ سے فارغ ہوجائے تو اس کو سب سے پہلے شاہ رفیع الدین صاحبؒ کی تکمیل الاذہان پڑھنی چاہئے اسکے بعد عبقات اسکے بعد لمعات، اس کے بعد البدور البازغہ گر مقدمہ چھوڑکر اس کے بعد حجۃ اللہ البالغہ کے بعد الفوز الکبیر اسکے بعد فتح الرحمان ترجمہ القرآن پڑھتے ہوئے تمام تفسیریں جو ممکن ہوں سامنے رکھ لی جائیں ان کا جو فائدہ عجیب اور عام تفسیروں سے ایک علیحدہ سی بات معلوم ہو اس کو خاص طور پر قابل توجہ سمجھا جائے اس نکتہ پر تمام تفسیروں کا مطالعہ کی جائے اس کے بعد تعیین کرنا ہوگا کہ کیا بات تھی کہ شاہ صاحبؒ نے عام مفسرین کا مسلک ترک کردیا جو چیز سمجھ میں آجائے اس کو مستقل محفوظ کرلیا جائے کبھی کسی مخالفت کی کوئی بات نہ مانی جائے۔

اس سلسلہ میں مولانا محمد قاسمؒ کی کتابیں بھی ہمارے نزدیک ان حضرات کی کتابوں کی طرف تقریب کرنیوالی ہیں ایک کالج کا طالبعلم پہلے یہی کتابیں زیادہ دیکھے اور جو اسے اجنبی سے معلوم ہوں انھیں چھوڑتا چلا جائے اور بار بار دیکھے تو وہ شاہ صاحب کی تصنیفات سمجھنے کی استعداد پیدا کرلیگا آخر میں تفہیمات الٰہیہ دنیا کے مختلف معرکۃ الآرا مسائل کو حل کرنے کیلئے ایک اہم تصنیف سمجھنی چاہئے مگر اسوقت ذہنیت اتنی وسیع ہو کہ شیطان سے بھی حکمت سیکھ سکتا ہو۔

شاہ صاحبؒ کا سیاسی مسلک اور ازالۃ الخفاء

ہم نے سب سے پہلے ازالۃ الخفا میں اس آیت کی تفسیر بڑے غور سے پڑھی هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ ودین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون (صف ع ۱) شاہ صاحب کی کتابوں میں ہم نے جتنا زیادہ غور کیا ہے یہی تفسیر انکی ساری حکمت سیاسی کا مرکزی نقطہ معلوم ہوا۔

شاہ صاحب کی ازالۃ الخفا میں فاروق اعظمؓ کے مذہب کا جو رسالہ ہے وہ ایک بے نظیر کتاب ہے میں صحاح ستہ میں سے پانچ کتابوں کو موطا کی شرح بناتا ہوں اس کے بعد موطا کو اس فاروق اعظمؓ کے مذہب کی شرح بناتا ہوں، اس سے میرے تمام شکوک حل ہوگئے اور قانون کے مختلف زبانوں میں تبدیلی کی ضرورت صاف ہوگئی۔

فاروق اعظمؓ کے زمانہ کی جو چیز تھی اسی نے بنی امیہ کے آخر دور میں موطا کی شکل اختیار کرلی اور موطا عباسیوں کے دور میں بخاری مسلم ابوداؤد اور ترمذی کی شکل میں تبدیل ہوگئی ہم ان چار حدیث کی کتابوں کو چار انجیلوں کی طرح صحف الٰہیہ میں شمار کرتے ہیں وہ تورات کی تشریح کرتی ہیں یہ قرآن کی تشریح کرتی ہیں مگر اس میں احتیاط کی ضرورت ہے کہ حجۃ اللہ کے قاعدہ پر تطبیق کے دونوں طریقوں کو ہر روایت میں جمع کرلیا جائے اس کے بعد فقط مستفیض اور متواتر کو سند بنایا جائے آحاد خبر واحد کو رائے کے درجہ پر چھوڑ دیا جائے اس میں تبدیلی بقدر ضرورت آسانی سے ہوسکتی ہے۔

ازالۃ الخفا میں شاہ صاحبؒ نے قرون ثلٰثہ کی تفسیر کی ہے ہم نے آج تک دوسرے عالم سے یہ تفسیر نہیں سنی، ہم اس کو شاہ صاحبؒ کے بہت اعلیٰ علوم میں شمار کرتے ہیں۔

مجھ سے یورپ میں بارہا سوال کیا گیا کہ قرآن کا آپ کے نزدیک کیا مطلب ہے؟ یعنی میں اپنے فلسفی انداز میں کس طرح تفسیر کرتا ہوں، میرا جواب یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت تک جو کچھ مسلمانوں کی جماعت نے کیا (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک) وہ قرآن کا مقصد ہے اسکی تشریح میں جس فلسفہ سے چاہوں کرسکتا ہوں لیکن یہ ہے قرآن کا مقصد یہ ہے۔

شاہ صاحب نے اپنے زمانہ کی رو دیکھکر شیعہ سنی کا مسئلہ ہاتھ میں لیا، اور اسی کو اپنی حکمت بیان کرنیکا ایک عنوان بنالیا وہ کہتے ہیں۔ شیخین انبیاء کے بعد سب سے افضل ہیں اس لئے کہ وہ نبی سے بہت زیادہ مناسبت رکھتے ہیں اب ضرورت پڑی کہ بتایا جائے کہ نبوت کیا کرتی ہے اور انھوں نے کیا کیا؟ تو حکمت کے دونوں باب حل ہوگئے نبوت کا مطلب بھی معین ہوگیا اور خلافت راشدہ کا مضمون بھی صاف آگیا۔

شاہ صاحب کے انداز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابوبکرؓ کے دور کو عمرؓ کے دور کی تمہید سمجھتے ہیں اور عثمانؓ کے دور کو اس کا نتیجہ یا تکمیل اب اس تمام خلافت میں وہ اصلی چیز فاروق اعظم پر توجہ کرتے ہیں اور فاروق اعظم نے چونکہ کسریٰ قیصر کی حکومت فتح کرکے ایک حکومت بنائی تھی جو شاہ صاحبؒ کی تفسیر میں مقصد تھا نزول قرآنی کا

نو فاروق اعظم کے کام کو وہ نبوت کے بعد قرآن کا بہترین مصداق مانتے ہیں اور اسی پر وہ ساری قوت صرف کردیتے ہیں چونکہ وہ فاروقی ہیں اس لئے وہ پوری ہمت سے اس مسئلہ کو واضح کرنے کی طبعی استعداد رکھتے ہیں اور جب ایک فاروق اعظم کی سیرت ایک صدیقی لکھدے تو پھر نبوت کے بعد بزرگوں کے معیار سمجھنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔

شاہ صاحب کی کتابوں میں صاف نمایاں نظر آتا ہے کہ جسقدر وجدانی فیوض اپنے والد ماجد کے ذریعہ اُن کو حاصل ہوئے ان میں زیادہ تر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا واسطہ ہے اس لئے وہ ائمہ اہلبیت سے قلبی محبت صحیح معنی میں رکھتے ہیں مگر انکے طریقہ کو جسقدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت تھی ادھر وہ متوجہ نہیں ہوئے میں نے شاہ صاحب کے تتبع میں اس حصہ کو پورا کرلیا ہے اور وہ میرے خواص علوم میں سے ہے۔

دو اور محسن کتابیں میری ایک محسن کتاب احکام القرآن ابو بکر رازی ہے اسلامی سیاست اجتماعی کے بعض ایسے مسائل جو حجۃ اللہ میں رہ گئے تھے میں اسی کتاب سے حل کرسکا۔

یورپ میں میری سیاست کے لئے مولوی الیاس صاحب برنی کی علم المعیشت بھی ایک محسن کتاب ہے اگر یہ کتاب مجھے نہ ملتی تو میں کسی یورپین کے اقتصادی پروگرام کو سمجھنے کے قابل نہ ہوتا،

شیرازِ ہند پورب[1]

اودھ، جونپور، اور بہار میں علم کی رفتار

از علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

"اسلام ایک ابرِ کرم تھا۔ اور سطحِ خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا لیکن فیض بقدرِ استعداد پہونچا جس خاک میں جسقدر زیادہ قابلیت تھی وہ اسی قدر زیادہ فیضیاب ہوئی۔

ہندوستان کی یہ فضائے بسیط بھی اس ابرِ کرم سے محروم نہ رہی۔ ہجرت کی پہلی صدی کا خاتمہ تھا کہ اس ابرِ کرم کے چھینٹوں نے اڑ کر سندھ کے کناروں اور پہاڑوں کے دامنوں کو بھی سرسبز و شاداب کر دیا بحرِ ہند کے سواحل ملیبار و مدراس سے لیکر گجرات و کاٹھیاواڑ تک مسلمانوں کی نوآبادیاں قائم ہوگئیں۔ دوسری طرف سندھ کی وادی اسکی فوجِ ظفر موج سے معمور ہوگئی تیسری صدی کا خاتمہ تھا کہ غزنی میں ترکوں کی ایک نوجوان تازہ دم قوم نے جو ابھی ابھی اسلام کے نام سے آشنا ہوئی تھی اپنی سلطنت کی طرح ڈالی اس کا پہلا بانی الپتگین اور اس کا جانشین سبکتگین ہوا۔ اور اس کے تخت و تاج کا وارث وہ نامور ہوا جس کے حملوں نے ہمالیہ کے پہاڑوں سے لیکر بحرِ ہند کے کناروں تک تہلکہ برپا کر دیا۔

سلطان محمود نے ہندوستان کی سرزمین کو اسلام کے نعروں سے پرشور کر دیا اور غزنی سے لیکر پنجاب تک مملکت اسلام کی حکومت قائم کر دی چھٹی صدی میں غوری آئے۔ تو انھوں نے اور ان کے غلام افسروں نے سارے ہندوستان کو اسلام کے زیرنگیں کر دیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے کہ یہ ملک اسلام کے مقبوضات میں ہے جس میں نو کروڑ توحید کے حلقہ بگوش اَللّٰہُ اَکْبَر کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔

خلجی اور تغلق عہد کے علمائے خراسان | جس طرح ہندوستان کو خراسان و ماوراءالنہر و عراق و عجم کے

[1] حیاتِ شبلی کا پہلا باب۔

تیغ آزماؤں نے فتح کیا تھا اسی طرح اس کے دل و دماغ کو انھیں ملکوں کے اربابِ کمال نے اپنا باج گزار بنایا تھا علماء و فضلاء عموماً بخارا، بلخ، سمرقند، خوارزم، عراق اور ایران کے شہروں سے ہندوستان چلے آرہے تھے۔ اس زمانہ میں ان اطراف سے آنے والوں کو ہندوستان کا سب سے پہلا شہر ملتان پڑتا تھا اس لئے ان باکمالوں نے اپنا پہلا پڑاؤ ملتان اور سندھ کے شہر بھکر وغیرہ میں ڈالا۔ ملتان اور سندھ کے بعد ان کی دوسری منزل لاہور اور اس کے آس پاس کے شہر سیالکوٹ وغیرہ میں ہوئی۔ سلطان شمس الدین التمش نے جب ۶۰۷ھ میں دلی کو اسلام کا دارالسلطنت بنایا تو ہر طرف سے باکمال علماء سمٹ سمٹ کر دلی میں جمع ہونے لگے۔

غیاث الدین بلبن (۶۶۴ھ – ۶۸۵ھ) کے زمانہ میں شمس الدین خوارزمی، شمس الدین قوشجی، برہان الدین بزاز، نجم الدین دمشقی، کمال الدین زاہد وغیرہ بیسیوں اربابِ کمال تھے جن کے علم و فضل کی رونق سے دلی بغداد اور قرطبہ کی برابری کر رہی تھی۔

علاء الدین خلجی (۶۹۶ھ – ۷۱۶ھ) کے زمانہ میں ظہیر الدین بھکری، فرید الدین شافعی، حمید الدین مخلص، شمس الدین یحییٰ، محی الدین کاشانی، فخر الدین ہانسوی، وجیہ الدین رازی، تاج الدین مقدم وغیرہ چھیالیس علماء دلی میں ایسے تھے جن کی نسبت ضیاء برنی جیسے مورخ کا بیان ہے کہ دنیا میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

محمد شاہ تغلق (۷۲۵ھ – ۷۵۲ھ) کے زمانہ میں معین الدین عمرانی، قاضی عبد المقتدر شریحی کندی دہلوی، مولانا خواجگی، شیخ احمد تھانیسری جیسے باکمال تھے جن کے دامنِ تربیت میں شہاب الدین دولت آبادی جونپوری پرورش پاکر ملک العلماء بن کے نکلے[1]

ہندوستان کے مغربی علاقوں میں علم

اوپر کی سطروں میں زمانوں کی ترتیب اور علماء کی وطنیت کی نسبت پر ایک نظر ڈال لینے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ پہلے اگر بلخ، بخارا، کاشان، قوشنج، ترکستان، رے اور دمشق کے علماء کے نام تھے تو اب ملتان، بھکر، ہانسی، دلی، تھانیسر وغیرہ کے نام ساتھ ساتھ ملتے ہیں۔ ملتان تو اب بھی مشہور شہر ہے

[1] مضمون اسلامی نصاب درس مولانا سید عبد الحئی مرحوم الندوہ فروری ۱۹۰۹ء

بھکر سندھ میں ہے۔ بانسی پنجاب کے موجودہ ضلع حصار میں اب ایک قصبہ ہے۔ اور تھانیسر پانی پت کے پاس ہے۔

مورخ ضیا برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں سلطان علاء الدین خلجی (سنہ ۶۹۶ھ تا سنہ ۷۱۶ھ) کے زمانہ کے علما کے حالات پر چند صفحے لکھے ہیں۔ وہ آج بھی پڑھنے کے لائق ہیں۔

"در تمامی عصر علائی در دار الملک دہلی علمائے بودند کہ اینچناں استاداں کہ ہر یکے علامۂ وقت و در بخارا و سمرقند و بغداد و مصر و خوارزم و دمشق و تبریز و سفاہان و رے و روم و در ربع مسکون نباشند و در ہر علمے کہ فرض کنند از منقولات و معقولات و تفسیر و فقہ و اصول فقہ و معقولات و اصول دین و نحو و لغظ و لغت و معانی و بدیع و بیان و کلام و منطق موئے می شگافتند و ہر سالے چندین طالبان علم ازاں استاداں برآمدہ بدرجۂ افادت میرسیدند و مستحق جواب دادن فتوی می شدند و بعضے ازاں استاداں در فنون علم و کمالات علوم بدرجۂ غزالی و رازی رسیدہ بودند چنانکہ قاضی فخر الدین ناقلہ و قاضی شرف الدین سرپاہی و مولانا نصیر الدین غنی و مولانا تاج الدین مقدم و مولانا ظہیر الدین لنگ و قاضی مغیث الدین بیانہ مولانا رکن الدین سنامی و مولانا تاج الدین کلاہی و مولانا ظہیر الدین بھکری و قاضی محی الدین کاشانی و مولانا کمال الدین کولی و مولانا وجیہ الدین پائلی و مولانا منہاج الدین قاینی و مولانا نظام الدین کلاہی و مولانا نصیر الدین کڑہ و مولانا نصیر الدین صابونی و مولانا علاء الدین تاجر و مولانا کمال الدین جوہری و مولانا حجت ملتانی قدیم و مولانا حمید الدین مخلص۔ و مولانا برہان الدین بھکری۔ و مولانا افتخار الدین برنی و مولانا حسام الدین سرخ۔ و مولانا وحید الدین ملہو۔ و مولانا علاء الدین کرک مولانا حسام الدین ابن شادی مولانا حمید الدین بنیانی۔ و مولانا شہاب الدین ملتانی و مولانا فخر الدین ہانسوی۔ و مولانا فخر الدین سناقل۔ و مولانا صلاح الدین سترکی و قاضی زین الدین ناقلہ و مولانا وجیہ الدین رازی۔ و مولانا علاء الدین صدر الشریعہ و مولانا میراں ماریکلہ و مولانا نجیب الدین ساوی و مولانا شمس الدین تم و مولانا صدر الدین گندہک و مولانا علاء الدین لوہوری و مولانا شمس الدین یحیی۔ و قاضی شمس الدین گازرونی۔ و مولانا صدر الدین تادی۔ و مولانا معین الدین لونی۔ و مولانا افتخار الدین رازی۔ مولانا معز الدین اندہپتی۔ و مولانا نجم الدین انتشار و جہل و

شش استاذ که من القاب و اسامی ایشان نوشته‌ام آنانند که در پیش بعضے تلمذ کرده‌ام و بخدمت بعضے رسیده

و بیشترے را در مسند افادت و در محافل و مجالس دیده و بسیارے از شاگردان مولانا شرف الدین بوشنجی و استادان

که اگر من القاب ایشاں بیاورده‌ام در عہد علائی بر مسند حیات بوده‌اند و دائم سبق میگفتند. در آخر عہد علائی

مولانا علم الدین نبیرۂ شیخ بہاء الدین زکریا که جہان علم و عالم دانش بود در دہلی رسیده. و اگر من خواہم که دریں تاریخ

حکایات وان و متعلمانے که در مثل استاذی رسیده بودند ذکر کنم بتطویل انجامد. از غرض باز مانم. و افسوس ہزار افسوس که

قدر و قیمت بزرگی و فضل آں استادان سلطان علاء الدین ندانست که یک حق از صد حقوق ایشاں نگذارده و نه

معاصران عہد دانستند که خاک قدم آنچناں استادان را در چشم جہاں بیں خود کشند. و نه من که مولف ام دراں ایام

خبرے از جلال و کمال ایشاں ادراک کردم و امروز که قرنی بیشتر گذشته که آں عدیم المثالان بجوار رحمت رب العالمین

پیوسته اند. و بدرگاه قرب حضرت بی نیازی ترقی کرده و بعد از ایشاں نه ہمچو ایشاں و نه دہ ہزارم بجز ذات ایشاں

مرا دیگرے را نظر آمده بعضے از قدر و قیمت ایشاں دریافته‌ام که اگر در کمالات علوم و تفنن ہر یکے مجلدے بنویسم مقصر باشم

و دراں ایام که او ستادان که ہر یکے ابو یوسف قاضی و محمد شیبانی عہد و عصر خویش بودند بر صدر حیات افادت میکردند

اگر مفتی طمطراق اوستاذی بسر کرده از خراساں و ماوراء النہر و خوارزم و یا از شہرے دیگر در دہلی برسیدے کمالات

علوم بزرگان مذکور را مشاہده کردے سبق درست گرفتے و تلمذ پیش ایشاں بزانوے ادب درآمدے. و اگر در حیات آں استاداں

تصنیفے جدید ہر علمے که فرض کنند از بخارا و سمرقند و خوارزم و عراق در شہر آوردندے که اگر استاداں شہر ما آں تصنیف را

استحسان و اعتبار کردندی معتبر شدی و الا مہجور ماندے و مقصود از ذکر ایشاں در تاریخ علائی آنست که چه عصر

و عہدے بود که دراں عہد و عصر چندیں متفننان نفائس علوم بر صدر حیات در افادت علوم مشغول باشد و چگونه آں

عصر مستثنائے عصر و آں شہر مستثنائے شہرہائے ربع مسکوں نباشد"

(فیروز شاہی برنی ص ۳۵۲ تا ۳۵۵ کلکتہ)

۱؎ ملتانی

علم کا قافلہ پورب کو ان بزرگوں کی نسبت وطنی پر غور کی نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں ایک طرف اگر کاشان قاین، رے، گازرون وغیرہ کے نامور تھے تو ان کے پہلو بہ پہلو اب ملتان اور بھکر (سندھ) کے ساتھ لاہور، سنام (پٹیالہ) بیانہ (آگرہ کے پاس) ہانسی (حصار پنجاب) دلی، اندرپت (دہلی کے پاس) اور کڑہ (الہ آباد کے پاس) کول (علی گڑھ) پائل، سترکہ (بارہ بنکی) کے مشاہیر بھی کھڑے نظر آتے ہیں یعنی علم کا قدم اب پچھم سے بڑھ کر پورب کی طرف اٹھ رہا ہے۔ ان بزرگوں کی عظمت و جلالت یہ تھی کہ مورخ ان میں سے ایک کو غزالی و رازی کا ہمسر بتاتا ہے۔ جن کی توثیق و سند سے بخارا و سمرقند و خوارزم و عراق کے اماموں کی تصنیفیں اعتبار اور مرتبہ پاتی تھیں۔

بدایوں غرض خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں جیسے جیسے اسلام کا قدم پورب کی سمت میں بڑھتا جاتا تھا علم کی روشنی بھی آگے کو بڑھتی جا رہی تھی۔ اسلام کے علم و فضل کا موکب جب دہلی سے آگے نکلا تو اس کی پہلی منزل بدایوں معلوم ہوتی ہے۔ حضرت سلطان الاولیا نظام الدین بدایونی دہلوی وہ سیاح معرفت ہیں جنھوں نے بدایوں اور دلی کی منزلوں کو ملا دیا۔ اس زمانہ میں اس سرزمین کے دوسرے نامور مولانا علاء الدین اصولی بدایونی (استاد نظام الاولیا) قاضی جمال الدین بدایونی ملتانی، رکن الدین بدایونی، خواجہ بخشی بدایونی وغیرہ ہیں۔ خواجہ بخشی بدایونی جنھوں نے طوطی نامہ لکھ کر کاغذ کے طوطے اڑائے ہیں۔ تصوف میں انکی دو کتابیں "مسالک السلوک" اور "کلیات و جزئیات" ہمارے کتبخانہ میں ہیں۔

کڑہ بدایوں کے بعد گنگا کے دہانہ پر کڑہ اب بھی ایک قصبہ ہے مگر اس زمانہ میں وہ سلطنت کے مشرقی حصہ کا ایک مرکزی شہر تھا۔ سلطان فیروز شاہ خلجی کے قتل اور سلطان علاء الدین خلجی کی تخت نشینی کا وہ سانحہ جس پر تاریخ اب بھی انگشت بدنداں ہے اسی شہر میں دریا کے کنارے گذرا تھا۔ عہد علائی میں مولانا نصیر الدین کڑہ کا نام پڑھ چکے اور انکے بعد مولانا مطہر کڑہ کا نام آتا ہے جنکے فارسی دیوان کے دو نسخے ابھی لکھنؤ اور علی گڈھ کو ہاتھ آئے ہیں۔ یہ حضرت نصیر الدین اودھی چراغ دہلی کے مرید تھے۔

اودھ بدایوں اور کڑہ سے لاہوا وہ صوبہ ہے جس کو اودھ کہتے ہیں یہ اصل میں اس شہر کا نام تھا جس کو رام اور کرشن

لہ اخبار الاخیار ص۸۲

کے مولد بننے کا فخر حاصل ہے جو اب بھی فیض آباد کے پاس اجودھیا کے نام سے مشہور ہے مسلمانوں نے اوس کو اپنے تلفظ میں اودھ کیا اور ایک پورے صوبہ کا نام رکھا۔

وہ زمانہ میں حضرت نظام الدین سلطان الاولیا کے وجود اقدس سے جگمگا رہی تھی۔ اوسکی کرنیں چھن چھن کر اودھ کے خطہ کو روشن کر رہی تھیں اس مطلع خورشید سے جو سب سے پہلا آفتاب طلوع ہوا اس کا نام شمس الدین یحییٰ اودھی ہے۔ یہ اودھ کے تھے اسی لئے اودھی کہلاتے ہیں۔ اسی زمانہ میں اس تیرہ و تار دیار میں ایک ایسا چراغ بھی جلا جس سے خود دلی روشن ہوئی۔ اس کا نام شیخ نصیر الدین محمود اودھی چراغ دہلی ہے۔

ان سے پہلے مولانا فریدالدین کا نام آتا ہے جو مذہب کے شافعی اور اودھ کے شیخ الاسلام تھے۔ مولانا فریدالدین اودھی اور ظہیرالدین بھکری کے شاگرد شمس الدین یحییٰ اودھی ہیں۔ اور شمس الدین اودھی کے شاگرد شیخ نصیرالدین اودھی چراغ دہلی ہیں۔ اس چراغ سے اور بہت سے چراغ جلے جن سے اودھ کا خطہ چشمۂ نور بنا۔

سید محمد کرمانی سیر الاولیا میں جو حضرت نظام الدین اولیا کے حال میں سب سے پہلی اور پرانی تالیف ہے لکھتے ہیں۔

"مولانا علاؤالدین نیلی کہ خلیفۂ سلطان المشائخ بود ..... در کشف غوامض کشاف و مفتاح مثل نداشت و در مجلس مولانا فریدالدین شافعی کہ شیخ الاسلام اودھ بود۔ قاری کشاف خدمت مولانا علاؤالدین (نیلی اودھی) بود و خدمت مولانا شمس الدین یحییٰ و علمائے اودھ سامع بودند" (ص ۲۷۰)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء کے عہد میں شیخ الاسلام اودھ کی درسگاہ میں اودھ کے علماء کا ایک انبوہ درس و تدریس میں مصروف تھا جن میں سے تین نے خاص امتیاز پایا۔

۱. شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی　　　　المتوفی سنہ ۷۴۷ھ

۲. نصیرالدین محمود چراغ دلی اودھی　　　　المتوفی سنہ ۷۵۷ھ

۳. شیخ علاؤالدین نیلی اودھی　　　　المتوفی سنہ ۷۶۲ھ

اہل تذکرہ نے ان بزرگوں کو اودھ کی خاک سے نسبت دی ہے مگر یہ نہیں معلوم کہ اودھ کی کس خاص سرزمین کو ان کے پیدائش گاہ بننے کا فخر حاصل ہے حضرت سلطان المشائخؒ کے خلفا میں اودھ کے قصبہ گوپاموٗ (ہردوئی) کے رہنے والے ایک بزرگ شیخ مبارک تھے۔ اودھ کے علما جب دلی سے اپنے وطن کو جانے لگے تو حضرت سلطان المشائخ کا حکم ہوا کہ راستہ میں اون سے ملتے جائیں سیر الاولیا کی عبارت یہ ہے۔

"علمائے اودھ چنانچہ مولانا شمس الدین یحییٰ و شیخ نصیر الدین محمود و مولانا علاء الدین نیلی و عزیزاں دیگر چوں از خدمت سلطان المشائخ باز می گشتند فرماں می شد چوں در گوپاموٗ برسید خواجہ مبارک را بہ بینید (ص۲۱)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ بزرگوار گوپاموٗ (ہردوئی) یعنی ادھر ہی کے کسی مقام کے رہنے والے تھے۔

اودھ سے اصل مقصود تو اجودھیا ہے۔ اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اودھ اس زمانہ میں بڑا شہر تھا ایک خان اس کا حاکم (مقطع) تھا (ص۱۹۰) وہاں بعض بزرگوں کے مقبرے بھی ہیں جن میں سے ایک شیخ جمال گوجری المتوفی ۸۵۵ھ ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اجودھیا کے آس پاس اسلامی آبادیاں تھیں ان میں سے ایک مشہور آبادی کا نام کچھوچھہ ہے جس کو حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی المتوفی ۸۰۸ھ کے خوابگاہ بننے کی عزت حاصل ہے۔

قنوج اور کٹرہ دلی اور ممالک پورب کے درمیان دریائے گنگا حائل تھا۔ اوس کی ایک سرحد قنوج (فرخ آباد) اور دوسری کٹرہ (الہ آباد) تھی۔ ممالک پورب کے دونوں بازوں پر یہ دو شہر آباد تھے۔ ان دونوں کو عبور کرنے سے پورب کی سرحد شروع ہو جاتی تھی۔ قنوج سے لکھنؤ کی سمت سے گورکھپور اور ترہت اور پورنیہ ہو کر بنگال۔ اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ کٹرہ سے پار ہو کر جونپور کی طرف سے پٹنہ سے آگے بڑھ کر بنگال یہی دونوں راستے آج بھی ہیں۔ ایک پر۔ ای۔ آئی۔ ریلوے ہے۔ اور دوسری پر بی۔ این۔ ڈبلو۔

ظفرآباد اور جونپور سلطان غیاث الدین تغلق کے نئے دور سے ہندوستان کے مغربی اور مشرقی حصوں میں

---

۱ خلجی اور تغلق بادشاہوں کے سفر بنگالہ (لکھنؤتی) کی منزلیں تاریخوں میں پڑھئے۔

اتصال بڑھتا گیا، سلطان خود بنگال تک گیا اور آیا۔ اس کے چند بیٹوں میں سے ایک کا نام ظفر خاں اور دوسرے کا فخر الدین جونا تھا۔ پہلے کے نام پر غیاث الدین نے ظفر آباد اور دوسرے کے نام پر بعد کو فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ تا ۷۹۰ھ) نے جونپور آباد کیا۔[۱] یہ آبادی ۷۶۱ھ سے پہلے ہو چکی تھی کیونکہ اس سال سلطان فیروز شاہ نے بنگال سے لوٹ کر جونپور میں قیام کیا تھا۔[۲]

غرض آٹھویں صدی کے وسط سے پورب میں اودھ سے آگے بڑھ کر جونپور و ظفر آباد کے حلقہ میں سلامی آبادیوں نے وسعت پائی۔

ملک پورب و مشرق | ۷۹۶ھ میں خواجہ جہاں نے دہلی سے سلطان الشرق کا خطاب پاکر جونپور کو اپنا مرکز بنایا۔ اس سلطان الشرق کی ولایت کی حدیں کہاں سے کہاں تک تھیں، اس کا پتہ مبارک شاہی کے ان لفظوں سے ملے گا۔

"بعدہ بجونپور رفت۔ وابستگی اقطاع قنوج و کڑہ (الہ آباد) و اودھ و سندیہ (سندیلہ) و دلمؤ و بہرائچ و بہار و ترہت را در قبض و تصرف خود آورد۔" (ص[۳] ۱۵۹ کلکتہ)

اس سے معلوم ہوا کہ قنوج بہرائچ، اور الہ آباد سے لیکر بہار اور ترہت (مظفرپور و دربھنگہ وغیرہ) تک ملک پورب کی وسعت تھی۔ آٹھویں صدی سے پوربی بزرگوں میں حسب ذیل نام تذکروں میں ملتے ہیں۔ بدر الدین اودھی تاج الدین کرہ، جلال الدین اودھی، شیخ دانیال سترکھ (بارہ بنکی) اودھ، رکن الدین کڑہ۔ رکن الدین ظفرآبادی (جونپور)، رکن الدین بہاری، زین الدین دیوہ (بارہ بنکی)، قاضی حما الدین بجنور (بارہ بنکی)، صلاح الدین سترکھ (بارہ بنکی)، علاء الدین اودھی، علاء الدین سندیلہ، قاضی فخر الدین سترکھ، شیخ مبارک گوپاموؤ (اودھ)، شیخ محمد معروف امیٹھی (اودھ)، شیخ منہاج الدین بہاری، مخدوم شیخ شرف الدین منیری بہاری وغیرہ۔

---

[۱] آئین اکبری جلد ۲ ص ۱ نولکشور [۲] مبارک شاہی ص ۱۲۵ کلکتہ [۳] فرشتہ میں ۷۹۶ھ [۴] یہ نام نزہۃ الخواطر مولانا سید عبدالحی مرحوم جزء ثانی مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد سے چنے گئے ہیں۔

خواجہ جہاں نے ۸۰۲ھ میں انتقال کیا اور اس کے بیٹے مبارک شاہ شرقی نے خودمختارانہ جلوس کیا یعنی نویں صدی ہجری کے آغاز سے پورب کی آزاد خودمختار سلطنت کی بنیاد پڑی۔ مبارک شاہ ۸۰۴ھ میں مرگیا اور اب اوسکی جگہ پر ابراہیم شاہ شرقی بیٹھا جو اس خاندان کا سب سے بڑا نامور فرمانروا گذرا ہے۔ اس نے جونپور میں چالیس برس حکومت کرکے ۸۴۴ھ میں وفات پائی اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں لاہور ملتان اور دلی سے علم کا مرکز منتقل ہوکر پورب کے اطراف میں آیا۔ گو اس حکومت نے اس کے بعد صرف چالیس برس اور زندگی پائی یعنی ۸۸۳ھ میں بہلول لودی کے ہاتھ سے یہ ست گئی۔ اور یہ زمانہ بھی مشرقی بادشاہوں کی جنگجوئی اور دلی کے لودی بادشاہوں کے دست برد سے امن وچین سے نہیں گذرا تاہم علم وفن کی جو شمعیں روشن تھیں وہ سیاسی حوادث کی ان آندھیوں سے نہ بجھیں بلکہ انکی روشنی روز بروز اور تیز ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ تیموریوں کے عہد میں یہ خطہ اور سراپا نور بن گیا۔ شاہ جہاں فخریہ کہا کرتا تھا کہ "پورب شیراز ماست" علامہ آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان میں لکھا ہے کہ پورب کی وسعت میں تین صوبے تھے۔ صوبۂ الہ آباد، صوبۂ اودھ۔ اور صوبۂ عظیم آباد مغلوں سے پہلے اودھ اور جونپور ایک ساتھ بولے جاتے تھے۔ اور قنوج سے لیکر بہار کی سرحد تک ایک صوبہ کی حیثیت سے ایک حاکم کے ماتحت تھا جس میں اودھ اور جونپور دونوں شامل تھے۔ اور دوسرا صوبہ کڑہ یعنی الہ آباد کا تھا جس میں گنگا کے اس پار کا علاقہ موجودہ کان پور سے لیکر کڑہ مانک پور، فتحپور، موجودہ رائے بریلی، سلون وغیرہ سے گذرتا ہوا غازیپور تک کا علاقہ شامل تھا صوبۂ عظیم آباد موجودہ بہار کا صوبہ ہے۔

یاد ایام

(۲)

از جناب مولانا ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی ایم اے انسپکٹر مدارس عربیہ رجسٹرار امتحانات شرقیہ الہ آباد

سنئے ذرا بہت قصے گزرے زمانے　　میری آپ بیتی اور خود میری زبانی ہے

عام جلسہ کا افتتاح

پرانے دارالعلوم یعنی گولہ گنج کی عمارت میں بڑے ہال کے سامنے ایک بہت بڑا قطعہ آراضی کا دکن جانب تھا جس میں بڑے اہتمام کے ساتھ جلسہ کا انتظام تھا وہ [illegible] کیا گیا اس میں باقاعدہ شامیانہ نصب ہوا۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ علما صوفیا امراء رئیسوں کے بیٹھنے کا [illegible] وہ تو کرسی ہی پر بیٹھے گا اور اس کے ساتھ علما اور [illegible] دار الکرنے اس وقت تک فرش ہی میں [illegible] تھا۔

ادھر یہ ضد ہے کہ لیمنڈ بھی چھو نہیں سکتے　　ادھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مے لا

غرض مجوزہ یہ ہوا کہ ایک چبوترہ ہال کے سامنے اتنا بلند بنایا جائے کہ کرسیوں کی سطح کے برابر ہو جائے اسی (چبوترے پر بعد کو ایک اور ہال اور برآمدہ تعمیر ہوا) کہ کمشنر صاحب بھی بیٹھ سکیں اور صحن کو کسیقدر گہرا کر کے اسمیں کرسیاں ڈالدی جائیں چنانچہ یہ تجویز منظور ہوئی اور جلد اس خدمت پر متعین ہوگئے فراشوں کے دونوں جگہوں دریاں اور قالین بچھائے اور دوسرے شامیانے کھڑے کر دیئے غرض پنڈال شبستان بن گیا عصر کے بعد جلسہ شروع ہوا اور نو بجے شب ختم ہوا۔ ہم تو اتنے تھکے تھے سو گئے تھے جب صبح کو آنکھ کھلی تو کل کی رونق ایک خواب نظر آتی تھی۔ اس وقت تک صرف بیس طالب علم دارالاقامہ میں تھے۔ ایک چکن کا کرتہ سبز [illegible] صدری سر پر سفید بنارسی ٹیکے کا عمامہ پاؤں میں دہلی کا کامدار جوتہ پہنکر ہم پورے مولوی بن گئے تھے [illegible] یہ لباس کا سب کو پہنایا تھا کمشنر صاحب بعد عصر تشریف لائے نماز مغرب اسی چبوترے پر ادا ہوئی بعد مغرب [illegible] استادی مولانا حفیظ اللہ صاحب نے پیش کیا ہم سب کا لباس لنبا کرتہ سبز صدری اور سفید عمامہ تھا اور [illegible] ایک سیاہ عبا در بر اور سفید عمامہ بر سر تھے

خدا بخشے ہمارے منشی سجاد حسین صاحب مرحوم اڈیٹر اودھ پنچ اس جلسہ میں موجود تھے مولنا سے انسے بڑی بے تکلفی تھی انھوں نے آخر انڈے بچے والی مرغی کی اپنر کہی ڈالی۔

دار العلوم

حضرت مولانا محمد علی صاحبؒ ناظم ندوۃ العلماء مسجد کے اوپر کے کوٹھے پر رہتے تھے اس کے سامنے ایک بڑی بھاری چتائی تھی (بعد کو ہماری انجمنوں کے جلسے اکثر وہیں ہوتے تھے اور علامہ شبلی مرحوم نے بھی اسی کو اپنی قرارگاہ بنایا تھا) وہیں سے حضرت تعلیم اور جملہ انتظامات کی رہبری فرماتے تھے۔ انکی نظافت ظاہری اور نفاست طبع کا کیا کہنا حضرت شاہ ابوالخیر صاحب دہلویؒ کے علاوہ کسی اور میں یہ بات نہ دیکھی۔ انکی تعلیمی رہبری پر حیرت ہے نیچریوں کے سایہ سے گریز تھا سید احمد خاں کی تفسیر کا رد لکھا تھا مولویانہ نہیں بلکہ نہایت دقیق اور ناقدانہ۔ مناظرہ کا خاص سلیقہ تھا ۸۰ برس کی عمر میں مونگیر میں جبکہ دماغ بیحد ضعیف ہوگیا تھا اور بعض اوقات ذرا ذرا بھی سمجھ میں نہ آتی تھی اسوقت بھی قادیانیوں کے رد کا تحریری سلسلہ جاری تھا۔

مولانا حفیظ اللہ صاحب مفتی صاحب مولنا عبدالشکور صاحب (النجم والے) عربی کے مدرس تھے منشی محمد علی مرحوم گنتی پہاڑے اور حساب سکھاتے تھے منشی واجد علی مرحوم لکھنوی خوشنویسی کراتے اور فارسی پڑھاتے تھے اور اگر کوئی طالب علم سلام علیکم کہہ دیتا تو بہت خفا ہوکر کہتے کہ یہ کیا جولاہوں کا طریقہ سلام کا سیکھا ہے طلبہ انکے درجہ میں انکو بندگی ہی عرض کرتے بعض طالب علم باہر کے اونچی کتابیں پڑھنے والے بھی تھے ان میں خود ناظم صاحب کے مرحوم صاحبزادے مولوی احمد علی مرحوم اور مولوی منظور النبی سہارنپوری تھے۔ ہماری ابتدا تھی کھیلتے بھی اور پڑھتے بھی ایک مرتبہ دن میں حضرت ناظم صاحبؒ کے پاس ضرور جاتے وہیں جتنی کتابیں رکھی ہوتیں انکو الٹتے پلٹتے اور وہ انکے متعلق کچھ نہ کچھ بتاتے ضرور۔ اقرب الموارد و شرتونی کی پہلے پہل جب ہی دیکھی تھی کبھی کبھی کوئی مصدر لیکر اسکی گردان یا کسی صیغے کی تعلیل بھی کرالیتے مگر اس سزا کو بھگت کر ہم وہاں سے فوراً ایک دو تین ہوجاتے یہ واقعہ ہے کہ جب فیضان ربانی شروع ہوجاتا ہے اور علم لدنی کی رو جاری ہوجاتی ہے تو ذہن بلا تکلف دشوار معاملات میں

جدید ہیئت کو نسبتاً صحیح جانا ہے۔ اصلاح نصاب کا خاکہ اس درس نظامیہ کے پڑھے ہوئے انسان کے ذہن میں فن دانی متقدمین کا طرز تعلیم اور طریقہ املا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خود حضرت کے استاد مفتی عنایت احمد صاحبؒ بھی فن دانی کے ماہر تھے، علم الصیغہ سی جامع اور مرتب کتاب محض ذہن سے کالے پانی میں جہاں بالزام بغاوت غدر کے بعد وہ بھیج دیئے گئے تھے لکھ ڈالی خود فرماتے ہیں "و ... حقیر دراں جزیرہ از نیرنگ تقدیر بودہ و ہیچ کتابے شامل .... نزد خود نداشتم" صرف تو صرف تاریخ حبیب الٰہ بھی یوں ہی لکھی تھی۔ لہٰذا اب جب تعلیم شروع ہوئی تو ابتدائی درجوں کے متعلق حضرت کے ارشادات اور ہدایات بھی شروع ہوئے ہمارے مولانا عبدالشکور صاحب جو آگے چل کر ... تھے حضرت مولانا عین القضاۃ صاحبؒ کے یہاں کے سب سے ذہین مستعد اور محنتی طالب علم کس باپ کے بیٹے تھے؟ حافظ ناظر علی صاحب جنکی بالمینت اور مراتب کی ادنیٰ تفصیل یہ ہے کہ حضرت سیدنا شاہ ابوالخیر صاحب دہلویؒ کو کہتے سنا ہے کہ ارے میاں انھوں نے تو حضرت جبرئیلؑ کی بھی زیارت کی ہے مولانا کا دل حضرت ناظر صاحبؒ کی طرف متوجہ تھا اور وہ ان کی ہدایات کو قبول کر لیتے ہمارے مالا بدمنہ کی تعلیم کے دور میں جو املا کراتے وہی در اصل آگے چل کر بڑا ہو کر علم الفقہ بنکر چمکا جناب مفتی عبداللطیف صاحب ندوۃ العلماء کے دار الافتاء کے مالک تھے (اس ضرورت سے ندوہ کا کتب خانہ بھی بڑا ہو گیا تھا) فقیہ اور فقہ جامع پر نظر وسیع ویسے بھی مدرس زوردار تھے مولانا مفتی لطف اللہ صاحبؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے شفقت بھی فرماتے مگر "تنبیہ الغافلین" کے بہت بڑے عامل تھے مولانا حفیظ اللہ صاحب صاحب علم و ذہن تھے خط بھی اچھا تھا علم مجلس میں اپنے ہم چشموں میں سب سے بالا درسیات کے ماہر تقریر کتابی نہایت درجہ منجھی ہوئی۔ دربار رامپور دیکھے ہوئے مدرسہ عالیہ چلائے ہوئے مولانا عبدالحق خیرآبادی ایسے علامہ اور گھاگ کو نیچا دکھا چکے تھے انتظام اور رعب غضب کا، بڑے بڑے ندوی ان سے اب بھی ڈرتے ہیں۔ مگر درسیات سے باہر قدم رکھنا انکی شان اور مذاق کے خلاف تھا حضرت مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلی کے چوٹی کے شاگرد تھے اور خود مولانا کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ اپنے خویش اور بھتیجے مفتی محمد یوسف مرحوم کی تعلیم کے لئے انہیں کا انتخاب کیا تھا۔ ادب مفتی میر عباس صاحب

سے پڑھی تھی ایک مرتبہ کوئی مدرس خالی نہ تھا دو قصیدے سبعہ معلقہ کے پڑھا دئے۔ پڑھا سب کچھ سکتے تھے۔ تحریر ایسی کہ ایک مرتبہ حضرت استاد علامہ سے اشاعرہ کے متعلق کچھ بحث آگئی خود علامہ کی فرمایش پر ایسا مضمون لکھ ڈالا کہ وہ فرماتے تھے کہ مضمون برابر زور اور گرفت سے پاک ہے پھر وہ کسی وجہ سے الندوہ میں شایع نہیں ہوا۔

یہ سب تھا مگر اس جویائے اصلاح نصاب کے کام کے یہ لوگ نہ تھے۔ اکثر یہ مشورے ہمارے گھر میں بیٹھکر ہوتے اس لئے میں ان سے واقف رہتا تھا۔ تمام لوگوں پر نظر دوڑائی گئی آخر میرے حقیقی محسن اور حقیقی اُستاد حضرت علامہ زمانہ مولنا محمد فاروق صاحب عباسی چریاکوٹی پر نظر گئی جو کتنے مدرسی اور وکالت کے چکر کھا کر اسوقت مدرسہ احیاء العلوم الہ آباد میں مقیم تھے اب حضرت مولنا کا سن ڈھل چکا تھا مگر نیتاں علم کے شیر تھے وارفتہ مزاج تھے ہر قاعدے اور قانون سے بری اور حکومت سے آزاد رہنا چاہتے تھے باوجود ان سب باتوں کے ناظم صاحبؒ نے اپنی افتاد طبیعت کے خلاف ان کا بلانا منظور کیا۔ مدرسہ کا انتظام دار الاقامہ اور سب کچھ مولانا حفیظ اللہ صاحب جانیں وہ آزاد رہ کر جو چاہیں کریں جو چاہیں پڑھائیں انکی شان علم کو سب کچھ شایاں ہے یہی آخری فیصلہ ہوا چنانچہ وہ صدر مدرس بنکر آئے اور مولانا تعلیمی امور میں انکی ہدایات کے پابند مگر با اختیار مہتمم باقی رہے۔ اب دور فاروقی شروع ہوتا ہے میں دار العلوم کی علمی روایات کی نشو و نما کے بیان میں اتنا مصروف ہو جاؤں گا کہ یہ ذکر کر دینا ضروری ہو گیا ہے کہ ہمارے ناظم صاحبؒ کو جسمانی تربیت کا اپنے طلبہ کی بہت خیال تھا چنانچہ یہ تجویز ہوا کہ مغلی ورزشیں شروع کرادی جائیں اتفاق سے کاکوری کے ایک صاحب منشی شمس الدین جو اس فن کے استاد اور لکھنؤ کی اصطلاح میں بانکے اور اکھاڑے الٹے ہوئے تھے اس خدمت کیلئے تجویز ہوئے اور شام کو طلبہ ایک جا نگیہ جو وہ اصل بنکر تھی اور ایک شلوکہ جو آستین دار صدری تھا پہنکر اُن سے یہ کرتب سیکھتے اور آپس میں مشق کرتے منشی شمس الدین بڑی محبت کے آدمی تھے کھانا دال روٹی اور گوشت اور صبح کو ایک روغنی یہ منظور شدہ سب کو ایک دسترخوان پر دار الطعام میں کھلا دیتے۔

بڑی بے انصافی ہو گی اگر اس سلسلہ میں میں منشی محمد علی مرحوم محاسب ندوہ کا ذکر نہ کروں طلبہ کے لئے جو ادا کی

تھے بڑے خوش خلق تھے اور زندہ دلی اپنی ختم تھی مدرسین اور طلبہ ان کو ہر وقت گھیرے رہتے۔ اسی زمانے میں ماڑی تنخواہ سب صرف ہو جاتی حضرت مولانا لطف اللہ صاحبؒ کے عزیزوں میں تھے اور ناظم صاحب کیا ہر ایک کو اپنی اعتماد تھا وضع ولو بہ نہ تھی تدلیسا اور ہاتھ پاؤں بڑے بڑے ان کا کیسٹا بنانا بڑا مشکل تھا ان کا گھنٹہ حساب کا آخریں ہوتا تھا یعنی تین بجے کے بعد لہذا ہم نظر بچا کر کبھی کبھی چائے پیتے کبھی تو ... ہم گرفتار ہو کر آتے اور کبھی دوسرے دن پھر وہ ایک عدد لیٹر پندرہ دن کیلئے کافی ہو جاتا۔

(باقی)

ابتدائی حدیث کا تحریری سرمایہ

از عبد السّلام قدوائی

اکتوبر سنہ ۶۹ کے ندوہ میں محدثین کے حیرت انگیز حافظے کے عنوان سے مولانا احمد اللہ صاحب ندوی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا اس سلسلہ میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ حدیث کے تحریری سرمایہ کے متعلق ایک مضمون شائع کریں گے ذیل کے سطور اسی وعدہ کا ایفا ہیں۔ اب سے پچیس تیس برس پہلے مخالفین اسلام نے اس خیال کو بڑی شدومد سے پیش کیا کہ تیسری صدی ہجری سے پہلے پہلے لوگوں کے حافظے سے باہر حدیثوں کا تحریری شکل میں کہیں وجود نہ تھا لیکن دین کے محافظوں نے پوری قوت سے ان اوہام کی تردید کی اردو میں سب سے پہلے غالباً مولانا شبلی نے سیرت النبیؐ کے مقدمہ میں ان شبہات کے جواب دئے ہیں مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے خطبات مدارس میں اس مسئلہ کی جانب بہت خاص توجہ فرمائی ہے۔ مولانا محمد علی لاہوری اور مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی نے مقام حدیث اور تدوین حدیث کے عنوان سے اچھے رسالے لکھے ہیں حال میں ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی نے التسیر الحثیث اور مولانا مناظر احسن گیلانی نے تدوین حدیث کے نام سے اچھے خاصے رسالے لکھے ہیں لیکن ابھی اس خاص مسئلہ پر اور لکھنے کی ضرورت ہے ذیل کی سطور اسی ضرورت کا احساس ہیں امید ہے کہ یہ مختصر تحریر اس موضوع پر بہت سے مفصل مضامین کا پیش خیمہ ہوگی۔ "سلام"

عہد رسالت

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے جس پر دین کی ساری عمارت قائم ہے اللہ تعالیٰ کے احکام وہدایات کا مجموعہ قرآن مجید کی شکل میں محفوظ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات حدیث کی کتابوں میں مندرج ہیں اس لئے مسلمانوں کیلئے قرآن مجید

کے حفظ و ضبط اور تحریر و ترتیب کے ساتھ احادیث کی نشر و اشاعت اور حفاظت و صیانت کی جانب خاص توجہ کی ان کوششوں کا نتیجہ ہے کہ جس طرح آج سیکڑوں برس گزرنے کے بعد قرآن مجید ہر قسم کے تغیر و تبدل اور تحریف و تبدیل سے پاک ہے اسی طرح غیر معمولی صحت و صداقت کے ساتھ ہزاروں حدیثیں اوراق و صحف میں محفوظ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آخری دین کامل شریعت اور دائمی نمونۂ عمل کے لئے ایسے ہی حفاظت کی ضرورت تھی تاکہ قیامت تک کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو اور خدا کا آخری دین ہمیشہ نوع انسانی کے لئے نمونۂ عمل رہے یہی وجہ ہے۔ کہ قرآن مجید کے ساتھ احادیث کی جانب بھی شروع ہی سے توجہ رہی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا خاص خیال تھا صحابہ کرام کو قرآن مجید کی آیتیں سناتے ان کے معانی و مطالب سے آگاہ فرماتے اور اسلامی احکام کی تشریح کرتے، اجمال کی تفصیل کرتے، ابہام کی وضاحت فرماتے اور پیچیدہ سوالات کا جواب دیتے صحابہؓ کرام آپ کی زندگی کے ایک ایک واقعہ کو یاد رکھتے، خود بھی اس پر عمل کرتے اور دوسروں تک بھی اسے پہونچاتے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکید تھی کہ بلغوا عنی ولو آیۃ. فلیبلغ الشاھد منکم الغائب[1]. ونضر اللہ امرء سمع منا حدیثا فحفظہ وبلغہ غیرہ الخ. صحابۂ کرام نے اس پر پورا عمل کیا ارشادات نبوی کو سننے اور انھیں یاد کرنے کا اس درجہ اہتمام تھا کہ بہت اصحاب نے دنیا کے سارے علائق کو چھوڑ رکھا تھا اور شبانہ روز اسی میں وقت گزارتے تھے اصحاب صفہ کا پورا گروہ اسی قسم کا تھا یہ لوگ گھر بار کی فکروں اور بال بچوں کی ذمہ داریوں میں مبتلا نہ تھے ان کا یہی کام تھا کہ جہانتک ہو سکے آنحضرت سے استفادہ کریں ان بزرگوں کے علاوہ جن لوگوں کو روزمرہ کی خانگی ضرورتوں کی بنا پر اس کا موقع نہ تھا وہ آپس میں باری مقرر کر لیتے تھے اور ہر شخص اپنی باری کے واقعات اپنے ساتھی کو سناتا تھا[2]۔

اسلام کے ابتدائی ایام میں یہی طریقہ رہا کہ لوگ حدیثیں زبانی یاد کرتے اور اسی طرح دوسروں کو پہونچاتے تھے اس

---

[1] بخاری کتاب العلم باب لیبلغ العلم الشاہد الغائب۔

[2] بخاری کتاب العلم باب التناوب فی العلم

روایت میں قرآن مجید کے سوا ہر چیز کے لکھنے کی ممانعت تھی مقصود یہ تھا کہ کلام الٰہی تحریف و تبدیل سے محفوظ رہے اور آیات الٰہی کے ساتھ کوئی چیز خلط ملط نہ ہونے پائے۔

بعد کو جب اسلام لوگوں کے دلوں میں راسخ ہو گیا اور قرآن مجید کا کافی حصہ نازل ہو چکا اور اس کا کوئی خوف نہ رہا کہ حدیث کے الفاظ قرآن مجید میں مل جائیں گے اور تحریف کا امکان پیدا ہو جائے گا۔ تو پھر کتابت حدیث کی اجازت دیدی گئی حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاص کی مشہور روایت ہے۔

کنت اکتب کل شئی اسمعہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارید حفظہ فنھتنی قریش وقالوا اکتب کل شئی تسمعہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتکلم فی الرضا والغضب فامسکت عن الکتاب فذکرت ذلک لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاومی باصبعہ الی فیہ وقال اکتب فو الذی نفسی بیدہ ما یخرج منہ الا الحق لہ	میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتا تھا حفظ کے ارادے سے لکھ لیا کرتا تھا قریش نے مجھے منع کیا اور کہا کہ کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتے ہو سب لکھ لیتے ہو حالانکہ آپ خوشی میں بات کرتے ہیں اور کبھی غصہ کی حالت میں یہ سن کر میں نے لکھنا چھوڑ دیا پھر آنحضرت سے اس کا ذکر کیا آپ نے اپنے دہن مبارک کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا لکھو خدا کی قسم اس سے حق ہی نکلتا ہے

غرضکہ اس طرح عہد رسالت ہی میں سینوں کی امانت سفینوں میں منتقل ہونے لگی اور احادیث کا اچھا خاصہ حصہ کتابی شکل میں مرتب ہو گیا حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاص کا اوپر ذکر ہو چکا ہے ان کا حال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو کچھ سنتے تھے لکھ لیا کرتے تھے اس طرح انھوں نے ایک اچھی خاصی کتاب تیار کر لی اس کتاب کا نام انھوں نے صادقہ رکھا یہ صحیفہ انھیں بیحد عزیز تھا وہ فرمایا کرتے تھے

ما یرغبنی فی الحیاۃ الا خصلتان الصادقہ والوھط لہ	مجھے زندگی کی خواہش صرف دو چیزیں صادقہ اور وہط دلاتی ہیں۔

لہ جامع ص ۳۶ لہ جامع ص ۳۷ سہ ایک زمین کا نام ہے۔

معاذ تھا، یہ نسخہ عرصہ تک ان کے خاندان میں محفوظ رہا، ان کے پوتے عمرو ابن شعیب کے پاس لوگوں نے اسے دیکھا اور ذکر کیا [1]۔

حضرت علیؓ نے بھی آنحضرتؐ سے سنکر کچھ روایتیں لکھ لی تھیں جو ان کے پاس کتابی شکل میں موجود تھیں [2]۔ حضرت انسؓ نے بھی کچھ حدیثیں قلمبند کی تھیں یہ مجموعہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد بھی ان کے پاس موجود رہا چنانچہ جب لوگ زیادہ جمع ہوجاتے تو وہاں سے نکال کر انھیں دکھاتے [3]۔

یہ تو چند خاص اصحاب کی تحریری کوششوں کا ذکر تھا لیکن کتابت وتحریر کا کام صرف اسی حد تک محدود نہ تھا بلکہ آنحضرتؐ کی مجلس مبارک کا عام دستور تھا، دارمی کی مشہور روایت ہے۔

عن ابی قبیل قال سمعت عبد اللہ قال بینما نحن حول رسول اللہ نکتب اذ سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ای المدینتین تفتح اولا قسطنطنیہ او رومیۃ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا بل مدینۃ هرقل [4]	ابو قبیل کا بیان ہے کہ انھوں نے حضرت عبد اللہ سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بیٹھے ہوئے لکھ رہے تھے کہ اتنے میں آپ سے دریافت کیا گیا کہ دونوں شہروں میں سے پہلے کون فتح ہوگا قسطنطنیہ یا رومیہ، اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں بلکہ ہرقل کا شہر

حضرت ابوہریرہؓ کا بھی ایک اسی قسم کا بیان ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں حدیثوں کی روایت کے قلمبند کرنے کا عام رواج تھا [5]۔

صحابہ کرامؓ کی ان تحریری کوششوں کے علاوہ آنحضرت صلعم بھی بعض ضروری احکام وہدایات لکھوادیا کرتے تھے۔ فتح مکہ کے سال میں خزاعہ کے کچھ لوگوں نے بنی لیث کے ایک آدمی کو قتل کردیا تھا رسول اللہ صلعم کو اسکی خبر دی گئی تو آپ نے سواری پر سوار ہوکر ایک خطبہ دیا جس میں مکہ معظمہ کی عظمت وحرمت کا ذکر فرمایا اور لوگوں کو قتل وخونریزی سے باز رہنے کی ہدایت کی، ایک یمنی صحابی (ابوشاہ) نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ یہ خطبہ مجھے لکھدیجیے

[1] تہذیب جلد ۸ صفحہ ۴۹ [2] بخاری کتاب العلم باب کتابۃ العلم [3] تقیید العلم صفحہ ۱۰ [4] دارمی صفحہ ۶۸ [5] خطبات مدارس بحوالہ مسند احمد بن حنبل جلد ۲

آنحضرت نے ان کی درخواست قبول فرمائی اور یہ خطبہ کل لکھوا دیا۔[۱]

حضرت معاذ بن جبل جب یمن کے گورنر مقرر کئے گئے تھے تو روانگی کے وقت آنحضرت صلعم نے انھیں اسلامی مسائل سے متعلق ضروری ہدایات دین اور نظائر و اشباہ پر قیاس اور استنباط مسائل کی تعلیم فرمائی لیکن بایں ہمہ یمن میں انھیں بہت سی باتیں دریافت طلب محسوس ہوئیں چنانچہ انھوں نے اس کے متعلق آنحضرت صلعم سے لکھ کر دریافت کیا جس کے جواب میں آپ نے انھیں ایک تحریر بھیجی دارقطنی[۲] نے اس واقع کو تفصیل سے لکھا ہے

اسیطرح عبداللہ بن الحکیم ایک دوسرے صاحب نے انھیں مردہ جانوروں کے احکام کے متعلق ایک تحریر لکھی تھی[۳]

وائل ابن حجر مشہور صحابی ہیں جب آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشرف باسلام ہوکر اپنے وطن حضر موت واپس جانے لگے تو رسول اللہ صلعم نے نماز روزہ سود شراب وغیرہ سے متعلق اسلامی احکام لکھ کر ان کے حوالہ کئے حضرت عمرو ابن حزم کو جب یمن کا حاکم بنا کر روانہ کیا تو انھیں فرائض صدقات و دیات کے متعلق ایک تحریر لکھ کر حوالہ کی[۴] بعض امراکو زکوٰۃ کے احکام بہت تفصیل سے لکھ کر بھیجے یہ تحریر حضرت ابوبکرؓ بن عمرو ابن حزم اور ان کے بعد اُن کے خاندان کے لوگوں کے پاس عرصہ تک محفوظ رہی چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت کے زمانہ میں یہ تحریر اُن کے خاندان کے یہاں برآمد ہوئی[۵] رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے پاس کچھ حدیثیں لکھی ہوئی رکھی تھیں آپکی وفات کے بعد آپکی تلوار کی میان میں وہ صحیفہ روایات پایا گیا[۶]

یہ تو چند تحریروں اور مشہور حدیثوں کے مجموعوں کا ذکر تھا اس کے علاوہ مختصر طور پر صحابہؓ کو خاص روایات خطوط ملفوظ کئے ... مدینہ منورہ کی مردم شماری کے کاغذات، قبائل کے نام، ہدایت نامے، امراء ولاۃ کے نام احکام

۱ بخاری جلد اول کتاب العلم باب کتابۃ العلم ۲ دارقطنی ص۴۵ ۳ خطبات مدارس بحوالہ طبرانی صغیر ص۲۱۲

۴ خطبات بحوالہ کنز العمال جلد ۳ ص۱۸۶ ۵ ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ اور دارقطنی ص۲۰۵ جلد ۲

۶ جامع بیان العلم ص۳۲

سلاطین واقوام عالم کے نام اسلام کے دعوت نامے، صلح نامے، معاہدے، امان نامے سینکڑوں ہزار ہا چیزیں تھیں جو آنحضرت صلعم کے زمانہ میں اور خود آپ کی رہنمائی میں تحریری شکل میں مرتب ہو گئی تھیں اور مختلف صاحبوں کے پاس محفوظ تھیں[1]

عہد صحابہؓ

عہد صحابہ میں ان تحریری کوششوں میں اور اضافہ ہوا جن بزرگوں نے عہد رسالت میں اپنی روایتیں کتابی شکل میں مرتب نہیں کی تھیں اب انھوں نے بھی اس جانب توجہ کی حافظے کتابت کی شکل اختیار کرنے لگے اور سینوں کی امانت سفینوں میں منتقل ہونے لگی خلافت راشدہ کے ابتدائی عہد میں کچھ دن ارتداد کے ہنگاموں نے اس کا موقع نہ دیا لیکن جب اس طرف سے اطمینان ہوا تو قرآن مجید کے ساتھ حدیث کی جمع وترتیب کی جانب بھی توجہ ہوئی بعض صحابہ کو شروع میں تامل رہا جسکی وجہ ایک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہی ابتدائی ارشاد تھا کہ

لاتکتبوا عنی شیئا سوی القرآن فمن کتب عنی شیئا سوی القرآن فلیمحہ[2]	مجھ سے قرآن کے سوا اور کچھ نہ لکھو جس شخص نے قرآن کے سوا مجھ سے کچھ لکھا ہو اسے چاہئے کہ اس کو مٹادے۔

جن صحابہ کو اس کا نسخ نہیں پہونچا تھا وہ پرانے حکم کی بنا پر کتابت حدیث کے قائل نہ تھے بعض بزرگوں کو خیال تھا کہ اس طرح حفظ وضبط کی طرف توجہ نہ رہیگی، اور سفینوں کا علم سینوں کو خالی کر دیگا۔ آئندہ صرف تحریریں رہ جائیں گی جن کے پس پشت حافظہ کی قوت نہ ہوگی کہ غلطیوں کی تصحیح ہو سکے اور صرف اضافہ کا پتہ چل سکے اس طرح خطرہ تھا کہ تحریف کے دروازے کھل جائیں گے اور منافقین، یہود اور دوسرے مخالفین کو روایات

---

[1] اس موضوع پر خطبات مدارس کا تاریخی خطبہ قابل ملاحظہ ہے۔ مولانا نے اس میں اس قسم کے بہت سے جزئی واقعات جمع کر دئے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط اور معاہدے تحریری شکل میں اس وقت بھی موجود ہیں۔

[2] جامع بیان العلم صـ ۳۳

میں تغیر و تبدل، حذف و اضافہ اور زیادتی نقصان کا موقع مل جائیگا اور دین کی بنیادوں میں رخنہ اندازی کی راہیں کھل جائیں گی ان وجوہ کی بنا پر کچھ دن تک لوگوں کو تذبذب رہا لیکن جب اسلام کی قوت میں اضافہ ہوا اور اس جانب سے اطمینان ہوا تو قرآن مجید کی طرح رفتہ رفتہ حدیثیں بھی کتابی شکل اختیار کرنے لگیں لیکن حفظ وضبط پر اب بھی زور دیا جاتا تھا اور حافظہ کے بغیر کتابیں دیکھ دیکھکر روائتیں بیان کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس زمانہ میں تحریری مجموعوں کو کوئی غیر معمولی اہمیت حاصل نہ ہوسکی تاہم اب اسکی ضرورت عام طور سے محسوس کی جانے لگی تھی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں صحابہؓ کرام کتابت حدیث کی ضرورت و اہمیت پر متفق ہوچکے تھے حضرت عروہ کا بیان ہے۔

ان عمر ابن الخطاب اراد ان یکتب السنن	حضرت عمرؓ کا ارادہ تھا کہ حدیثیں لکھ لی جائیں صحابہ
فاستفتی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ	سے مشورہ کیا انھوں نے لکھنے کی رائے
وسلم فی ذالک فاشاروا علیہ ان یکتب[1]	دی تھی۔

حضرت عمرؓ کا خود خیال ہی ہورہا تھا کہ احادیث وسنن کتابی شکل میں جمع کردی جائیں لیکن پھر اس خیال سے یہ ارادہ فسخ کردیا کہ کہیں اس کی وجہ سے قرآن مجید کی جانب سے بے توجہی نہ ہوجائے لیکن بعد کو یہ شبہ جاتا رہا اور اسکی ضرورت بالکل واضح ہوگئی تو حکم دیدیا قیدو العلم بالکتاب[2] علم کو احاطۂ تحریر میں لاؤ

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی پانچسو حدیثوں کا ایک مجموعہ اپنی زندگی میں مرتب کیا تھا جو حضرت عائشہؓ کے پاس رکھا ہوا تھا انتقال کے وقت خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ اس مجموعہ میں میں نے اپنے اطمینان پر کچھ ایسی روائتیں لکھ لی ہوں جو صحیح نہ ہوں اس لئے اسے ضائع کردیا[3] تاہم چونکہ یہ مجموعہ عرصہ تک حضرت عائشہؓ کے پاس رہا اور ان کا شوق حدیث اور علم و فضل مشہور و معروف ہے اس لئے یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ سارا مجموعہ ان کے حافظہ میں محفوظ ہوگیا ہوگا جو بعد کو ان کے شاگردوں کے ذریعہ کتابی شکل میں آگیا ہوگا

---

[1] جامع ص ۳۳ [2] دارمی ص ۶۸ [3] تذکرۃ الحفاظ ذکر حضرت ابوبکرؓ

کتابت حدیث کا رجحان برابر بڑھتا رہا یہاں تک کہ حضرت علیؓ کے زمانہ میں کافی تحریری سرمایہ کتابی شکل میں جمع ہو گیا تھا[1]

اب روز بروز جمع و ترتیب حدیث کے متعلق شکوک و شبہات ختم ہوتے جاتے تھے اور جو صحابہ پہلے اسے پسند نہیں کرتے تھے وہ بھی اپنی رائے تبدیل کر رہے تھے حضرت عبد اللہ بن عباس جو پہلے کتابت حدیث کے سخت مخالف تھے اور لوگوں کو اس سے روکتے تھے اب اس کے قائل ہی نہیں بلکہ اس پر عامل ہو چکے تھے[2] حضرت عبد اللہ ابن مسعود جو کبھی تحریری روایات کے اتنے سخت مخالف تھے کہ لکھے ہوئے حروف کو پانی سے دھلوا دیتے اور روایتوں کے مجموعوں کو نذر آتش کر دیا کرتے تھے[3] اب وہ خود اور ان کے شاگرد حدیثوں کے لکھنے لکھانے میں مشغول تھے[4]

حضرت عبد اللہ ابن عباس کا اب یہ حال تھا کہ ان کے شاگرد حدیث کی نشر و اشاعت میں پوری توجہ سے مصروف تھے ان کے شاگرد ان کے پاس بیٹھ کر حدیثیں لکھتے تھے حضرت سعید ابن جبیر کا بیان ہے کہ

کنت اکتب عند ابن عباس فی صحیفۃ[5] میں عبد اللہ ابن عباس کے پاس کتاب میں لکھتا تھا۔

اور جب کاغذ میں گنجائش باقی نہ رہتی تو نعلین کو پلٹ کر اس پر لکھتے[6] حالت سفر میں کجاوے کی لکڑی سے یہ کام لیا جاتا[7] غرضکہ سفر و حضر ہر جگہ حدیثیں لکھی جا رہی تھیں یہاں تک کہ ان کے پاس متعدد صحیفے جمع ہو گئے تھے[8] جب ان کا انتقال ہوا تو انھوں نے کتابوں کا اتنا ذخیرہ چھوڑا تھا جو ایک اونٹ کا بوجھ تھا۔

(باقی آئندہ)

---

[1] جامع ص ۔ [2] ترمذی کتاب العلل [3] جامع ص ۲۲ جلد اول [4] جامع ص ۳

[5] سوامی ص [6] ایضاً [7] ایضاً [8] ترمذی کتاب العلل

حالات ندوہ

سال رواں کی پہلی سہ ماہی ختم ہوگئی اس منزل پر پہونچ کر تمام کاموں پر ایک نظر ڈالی جارہی ہے تاکہ اسکی روشنی میں آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کیا جاسکے پہلی سے تیسری نمبر تک سہ ماہی امتحانات کا سلسلہ جاری رہا اس کے بعد محرم کی تعطیل ہوگئی تعطیل کے بعد نتائج مرتب ہوجائیں گے اور غالباً وسط مارچ سے پہلے ہی ان کا اعلان ہوجائے۔

گذشتہ سال اسی مہینے کے رسالہ میں ہم ندوہ کی اقامت گاہوں کا ذکر کرچکے ہیں یہاں روزمرہ کے تمام انتظامات ناظر دارالاقامہ کی رہنمائی میں طلبہ ہی کے ہاتھ میں ہیں تاکہ اتفاق و اتحاد اور یک جہتی و ہم آہنگی کی فضا قائم ہو عزم و حوصلہ کی دبی ہوئی طاقتیں ابھریں فکر و تدبیر کے مدھم نقوش اجاگر ہوں فرائض کا احساس خودداری و خودنگری کی خو پیدا کرے اور ذمہ داری کا بوجھ ارادوں میں عزم و ہمت اور بلندی و پختگی کا باعث ہو امسال یہ انتظامات حسب ذیل طلبہ کے سپرد ہیں۔

نقیب عام (جنرل مانیٹر) محمد نواب خاں

نقیب محمد یونس اقبال وارث

نقیب صلوٰۃ۔ محمد ظہور عنایت اللہ

نقیب صحت۔ شبیر احمد مصلح الدین

نقیب تعلیم۔ ابوالعرفان مجیب اللہ

مطبخ کے انتظامات بھی اسی طرح طلبہ ہی کے سپرد ہیں انکی منتخب مجلس مولانا مفتی محمد سعید ندوی

مہتمم مطبخ کی رہنمائی میں تمام کام انجام دیتی ہے امسال حسب ذیل اصحاب اس خدمت کیلئے منتخب ہوئے ہیں۔

ناظم مجلس طعام۔ رفیق احمد

نائب ناظم۔ احتشام علی

اراکین :۔ عبدالجلیل مجددی، مسیح الزماں، معین اللہ، عبدالحکیم، سید یوسف میسوری، محمد صابر، رفیق اللہ بنگالی، نجم الدین برمی۔

ورزشی کھیلوں کے انتظامات کے لئے حسب ذیل طلبہ منتخب ہوئے ہیں۔

جنرل کپتان۔ محمد یوسف میسوری

نائب کپتان۔ عبدالجلیل مجددی

والی بال کپتان۔ محمد صابر ساٹری

---

۲۸ جنوری کو مولانا محمد عمران خاں انچارج اہتمام دارالعلوم کی جانب سے الاصلاح مجلس طعام مجلس نقبا، مجلس الالعاب الریاضیہ (گیمس کمیٹی) کے منتخب نمایندوں کے علاوہ مطبخ اور دارالاقامہ کے منتظمین اور ندوہ سے متعلق دوسرے اصحاب بھی موجود تھے کھانوں کی خوش ذائقی کے ساتھ باتوں کی لطافت اور تقریروں کی دلچسپی نے اس صحبت کا لطف اور بڑھا دیا تھا۔

ملی اور سیاسی کتابوں کا ذخیرہ

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
آتش پارے	۸ر	بہار جاوداں	[illegible]	چند اہم خطوط	۸ر
آزادی	[illegible]	بھارت تیا	۱۲ر	چیمبرلین	۱۲ر
آزادی	[illegible]	[illegible]	۱۱ر	حالات حسرت	۸ر
آزادی رادل	[illegible]	بیداری ہند	[illegible]	حکومت خود اختیاری	عہ
[illegible]	[illegible]	پیام عمل	[illegible]	حیات غازی	[illegible]
ابن سعود	[illegible]	پکار (سیاسی ڈرامہ)	[illegible]	حقیقت ہنگامۂ پنجاب [illegible]	[illegible]
احیاء اسلام	۵ر	تاریخ تجارت ہند	[illegible]	حیات صلاح الدین	[illegible]
اسٹالن	۱۰ر	تاریخ حریت اسلام	[illegible]	خالد بن ولید (ڈرامہ)	۸ر
اسٹالن کلاں	[illegible]	ترجمان احرار	[illegible]	خالدہ خانم	۱۲ر
اسلامی ہند پر ایک نظر	۸ر	ترک مقالات	۴ر	خطابات کی اصلیت	۴ر
اصلاح قوم و ملت	[illegible]	ترک مقالات	۲ر	خطبات سیاسیہ	۸ر
اعلائے کلمۃ الحق	۴ر	تذکرہ احیاء اسلام	۱۲ر	خطبۂ صدارت تحریری	۶ر
افغان بادشاہ	[illegible]	ترکی میں مغربی و مشرقی کشمکش	[illegible]	خطبۂ صدارت تقریری	۶ر
امتحان کامل	عہ	تعمیر نو	[illegible]	خطبۂ صدارت مولانا محمد علی	۴ر
انسانی قربانیاں	۸ر	تقاریر [illegible]	[illegible]	خطبۂ صدارت مولانا محمود الحسن	۱۲ر
انسداد جو ابکاری	۱۰ر	تقاریر محمد علی ۲ جلد	عہ	خلافت اور مقاطعہ	۲ر
انسداد گداگری	۱۰ر	تلاش حق ۲ جلد	[illegible]	خلافت اور ہندوستان	۸ر
انقلاب افغانستان	[illegible]	تیک مہاراج	۱ر	خواتین انگورہ قسم اول	عہ
انقلاب دہلی	[illegible]	تواریخ کانگریس	[illegible]	خوشحال ہندوستان	عہ
انقلاب [illegible]	عہ	ٹالسٹائی	۴ر	خون کے آنسو حصہ ۱	۴ر
انقلاب فرانس (از عبدالرزاق)	[illegible]	ٹالسٹائی کی کہانی	۸ر	خون ناحق	۸ر
انقلاب فرانس (از عبدالقادر)	۱۲ر	جاپان	[illegible]	خیر الدین پاشا	۸ر
انقلاب فرانس (از باری)	۱۰ر	جانباز ترک	۸ر	دختران شمشیر	عہ
انقلاب روس (از انیس احمد)	عہ	جذبات احرار	۴ر	دختر سمرنا	[illegible]
انقلاب روس	۱۲ر	جذبات جوہر	۱۲ر	داستان زوال	[illegible]
انقلاب میں کسانوں کا ہاتھ	۸ر	جذبات حریت	۱ر	داستان نامہ	۵ر
انقلابی افسانے	۸ر	جلاوطنی کی داستان	۱۲ر	درس عمل	۵ر
انگورہ اور ترک	۱۲ر	جمال الدین افغانی	۱ر	دعوت حق	۶ر
آہنگ رزم	۸ر	جمال الدین افغانی (از ظفر علی خاں)	۴ر	دنیا میں دوزخ	عہ
آئینہ جمہوریت	۴ر	جنگ آزادی	[illegible]	دو خدائی خدمتگار	۱۲ر
آزادی کی جنگ رنگ کے زاویہ سے	[illegible]	جنگ صلیب و ہلال	[illegible]	دولت عزیزیہ	۶ر
آفتاب ترکستان	عہ	جنگ طرابلس	۴ر	دیگر ممالک میں قطع تعلق	۱۰ر
بالشویک شہزادی	۴ر	جنگنامہ اسلام	عہ	رپورٹ کانگریس احمد آباد	عہ
بالشوی شہزادی	۴ر	جواب شکوہ	۲ر	روایات اسلام	۴ر
بالشویک جنرل	۸ر	جواہرات (مشاعرہ آل انڈیا کانگریس)	۸ر	روح سیاست	۸ر
برطانیہ اور افغانستان کے تعلقات	۹ر	جواہر لعل	۳ر	رودولف	۱۲ر
برہمن دیوتا		چمن بے خزاں	۴ر	روسی افسانے	۱۲ر

ملنے کا پتہ

صدیق بک ڈپو لکھنؤ — یا — اسکول بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ

پبلشر سید حامد علی پرنٹر رانکے لال سکسینہ مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ

الندوہ

جلد ۲	ماہ ربیع الاول سنہ ۱۳۲۳ھ	نمبر ۳

مطابق مئی ۱۹۰۵ء

مجلس ندوۃ العلما کا ماہوار علمی رسالہ

جس کا مقصد

علوم اسلامیہ کا احیاء، تطبیق معقول و منقول، اور علوم قدیمہ و جدیدہ کا موازنہ ہے

مرتبہ

شمس العلما مولوی شبلی نعمانی و مولوی حبیب الرحمن صاحب شروانی

فہرست مضامین

باہتمام قاری عبد الولی آسی پرنٹر لکھنؤ میں چھپکر

دفتر ندوۃ العلما لکھنؤ سے شائع ہوا

ضروری اطلاع

الندوہ کا یہ گیارھوان نمبر ہی بارھوین نمبر کے نکلنے پر، خریداری کا ایک سال پورا ہو جائے گا، اسلیے اطلاعاً گزارش ہی کہ بارھوین نمبر کے بعد کا پرچہ تمام خریدارون کی خدمت مین (قدیم خریدار ہون یا جدید) ویلو روانہ ہوگا اگرکسی صاحب کو آیندہ، پرچہ کی خریداری منظور نہ ہو تو ہمکو مطلع فرمائین تاکہ اُن کی خدمت مین ویلو نہ بھیجا جائے۔

دستخط

منیجر الندوہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الندوہ

پردہ اور اسلام

یورپ کی عامیانہ تقلید نے ملک مین جو نئے مباحث پیدا کردیے ہین، ان مین ایک یہ مسئلہ بھی ہی، اگر اس مسئلہ پر صرف عقلی پہلو سے بحث کی جاتی تو ہمکو دخل در معقولات کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ساتھ ہی یہ دعوی کیا جاتا ہی کہ خود مذہب اسلام مین پردہ کا حکم نہین، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ قرون اولی مین پردہ کا رواج بھی نہ تھا، نئے تعلیم یافتہ گروہ کے سب سے مشہور اور مستند مصنف (مولوی امیرعلی) نے ۱۸۹۹ء مین رسالۂ نائن ٹین سنچری مین مسلمان عورتون کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس مین وہ تحریر فرماتے ہین

"یہ لمبا برقع - نقاب - اور خمار، سلجوقیون کے آخری زمانہ مین طائع ہوا اور"

"جس قسم کا پردہ آج کل مسلمانان ہند مین رائج ہو خلفا کے زمانہ مین اس کا"

"کہین نام و نشان نہ تھا، بلکہ برعکس اس کے اعلے طبقے کی عورتین بلا برقع"

"کے مردون کے سامنے آتی تھین۔"

"ساتوین صدی ہجری کے وسط مین جب خلفا ضعیف ہوے اور تاتاریون"

"نے اسلامی حکومت کو درہم برہم کیا تو اُس وقت علما مین اس پر نزاع ہوئی"

"کہ عورتین اپنے ہاتھ مونھ اور پاؤن اجنبیون کے سامنے کھول سکتی ہین یا نہین۔"

اس موقع پر عبرت کے قابل یہ امر ہی کہ اسلام کی تاریخ اور اسلام کے مسائل کی تعبیر کرنے والے دو گروہ ہو سکتے تھے، علماے قدیم۔ اور جدید تعلیم یافتہ۔ علما کا یہ حال ہی کہ اُن کو زمانہ کی موجودہ زبان مین بولنا نہین آتا، جدید تعلیم یافتہ لوگون کے مبلغ علم کا اُس عبارت سے اندازہ ہوسکتا ہی جو ابھی اوپر گزر چکی، لیکن بدقسمتی سے یہی دوسرا گروہ قومی لٹریچر پر قبضہ کرتا جاتا ہی، اور چونکہ غیر قومون کے کانون مین صرف اسی گروہ کی آواز پہنچتی ہی، اسلیے مسائل اور تاریخ اسلام کے متعلق آیندہ زمانہ مین اسی گروہ کی آواز اسلام کی آواز سمجھی جائیگی ہم اس مضمون مین صرف تاریخی پہلو سے بحث کرتے ہین اور یہ دکھانا چاہتے ہین کہ عرب مین اسلام سے پہلے پردہ کی کیا حالت تھی۔ پھر تمام اسلامی دنیا مین پردہ کے متعلق کیا طریق عمل رہا۔

مدت ہوئی ہمنے اس مضمون کے پہلے حصے پر ایک بسیط مضمون لکھا تھا، پہلے اُس کو بعینہٖ اس مقام پر درج کرتے ہین۔

اس سے انکار نہین ہوسکتا کہ قدرت نے مرد اور عورت کو بعض خصوصیتون مین ایک دوسرے سے ممتاز پیدا کیا ہی۔ لیکن تمدن نے اُن قدرتی خصوصیتون

کے علاوہ اور بھی بہت سے امتیاز قائم کر دیے ہین جو ہر قوم- ہر فرقہ- ہر ملک
مین جدا جدا صورتون مین نظر آتے ہین- دنیا کے نہایت ابتدائی زمانہ مین
غالباً مردون اور عورتون کے لباس- وضع- طور- طریقے- بالکل یکسان رہے ہونگے
اور بجز قدرتی خصوصیتون کے کوئی چیز اُنکو ایک دوسرے سے جدا نہ کرسکتی ہوگی
لیکن تمدن کو جسقدر وسعت ہوتی گئی اُسیقدر یہ باہمی امتیازات بڑھتے گئے
رفتہ رفتہ یہان تک بہت بڑھ گئے کہ آج دونون کے طرز تمدن اور معاشرت
مین بہت کم چیزین باقی رہ گئین جو مشترک کہی جاسکتی ہین-

دنیا کی ابتدائی تاریخ بالکل تاریکی کی حالت مین ہے- قدیم سے قدیم
زمانہ جس کے تاریخی حالات معلوم ہوسکے ہین- دو تین ہزار برس سے زیادہ
نہین- یہ وہ زمانہ ہے جب موجودہ تفرقون کی بنیاد پڑچکی تھی اور دونون فریق
کے اصول زندگی مین بہت سی ممتاز خصوصیتین پیدا ہو چکی تھین، اسلیے
آج یہ پتا لگانا قریباً ناممکن ہے کہ اول کن اسباب سے یہ تفرقے قائم ہوے
اور جس زمانہ کو ہم اپنے علم تاریخ کی ابتدا قرار دیتے ہین اُس وقت تک
کیونکر ان تفرقون نے وسعت حاصل کرلی تھی-

اگر ہم بتانا چاہین کہ انسان کو ستر عورت کا خیال کیونکر ہوا اور
مردون اور عورتون مین اُسکے مختلف حدود کس بنا پر قرار دیے گئے تو ہم
کوئی کافی وجہ نہین بتا سکین گے- اسی طرح اور خصوصیتون کی نسبت بھی
ہم کچھ جواب نہین دے سکتے- اسلیے نہایت قدیم تفرقون کی تاریخ قائم کرنی
اور اُن کے وجوہ و اسباب پر غور کرنا تو بے فائدہ ہے- البتہ جو امور

زمانۂ مابعد مین پیدا ہوے اُنکے متعلق تحقیقات کی کوشش کرنی بیجا نہین ہے۔

پردہ کی دو قسمین قرار دی جاسکتی ہین۔

(۱) چہرہ اور تمام اعضا کا ڈھکنا۔

(۲) مردون کی مجلسون اور صحبتون مین شریک ہونا۔

پہلی قسم کا پردہ عرب مین اسلام سے پہلے موجود تھا اور زیادہ تر قدرتی ضرورتین اُسکے ایجاد کا باعث تھین۔ اول اول جب اس رسم کی ابتدا ہوئی تو عورتون کے ساتھ مخصوص نہ تھی کیونکہ زیادہ تر اُسکو قدرتی ضرورتون نے پیدا کیا تھا اور وہ مرد اور عورت سے یکسان متعلق تھین۔ غالباً سب سے پہلے قبیلۂ حمیر مین جو یمن کے رہنے والے اور وہان کے حاکم تھے یہ طریقہ جاری ہوا۔ اسپین مین حمیر کے ایک خاندان کی حکومت قائم ہوگئی تھی جو ملثمین کہلاتے تھے۔ اس خاندان نے نہایت زور اور قوت کے ساتھ حکومت کی اور بہت سی فتوحات حاصل کین لیکن چہرہ پر ہمیشہ نقاب ڈالے رہتے تھے اور اس وجہ سے ملثمین کہلاتے تھے۔ اسمین یوسف بن تاشفین بڑی ہیبت و جبروت کا بادشاہ ہوا علامہ ابن خلکان نے اُسی کے ترجمہ مین اس رسم کے قائم ہونے کی یہ وجہ لکھی ہے۔

و سبب ذلك على ما قيل ان حمير كانت تتلثم	یعنی اس کا سبب جیسا کہ کہا گیا ہے یہ ہے کہ قبیلۂ حمیر گرمی اور سردی کی وجہ سے

لشدة الحر والبرد فتفعله الخواص منهم فکثر ذلك حتی تفعله عامتهم۔	چہرون پر نقاب ڈالے رہتے تھے۔ پہلے خواص ایسا کرتے تھے پھر اُنکو اسقدر ترقی ہوئی کہ تمام قبیلہ مین اُسکا رواج ہوگیا

علامۂ موصوف نے ایک اور سبب بھی لکھا ہے۔ وہ یہ کہ قبیلۂ حمیر کی مخالف ایک قوم تھی جس کا معمول تھا کہ جب حمیر والے کسی ضرورت سے باہر جاتے تھے تو یہ لوگ اُنکے گھرون پر حملہ کرتے تھے اور عورتون کو گرفتار کرلیجاتے تھے۔ مجبور ہوکر اہل حمیر نے یہ تدبیر سوچی کہ ایک دفعہ عورتین مردانہ لباس پہنکر باہر چلی گئین۔ اور مرد چہرون پر نقاب ڈالکر گھرون مین رہے، دشمنون نے معمول کے موافق حملہ کیا۔ یہ لوگ نقاب ڈالے ہوے نکلے اور نہایت دلیری سے لڑکر دشمنون کو قتل کرڈالا۔ چونکہ یہ فتح نقاب کے پردہ مین نصیب ہوئی تھی اسلیے یادگار کے طور پر یہ رسم قائم کرلیگئی۔ یہان تک کہ اسلام کے بعد بھی اس قبیلہ کے مرد اور عورت یکسان نقاب پوش رہتے تھے۔ ایک شاعر نے لکھا ہے۔

لما حووا احراز کل فضیلة		غلب الحیاء علیهم فتلثموا

بعض اور اتفاقی امور سے یہ طریقہ اختیار کیاگیا۔ مثلاً جو لوگ حسین اور خوشرو ہوتے تھے اس خیال سے کہ نظر بد سے محفوظ رہین، چہرے پر نقاب ڈالکر باہر نکلا کرتے تھے۔ اسکی مثالین زمانۂ اسلام مین بھی ملتی ہین۔

مقنع کندی[1] جو دولت بنوامیہ کا مشہور شاعر ہو اسی خیال سے ہمیشہ نقاب ڈالکر باہر نکلتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ طریقہ زیادہ تر مروج ہوگیا اور بڑے مجمعون مین اکثر لوگ برقع پہنکر شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ بازار عکاظ مین جو عرب کی حوصلہ افزائیون کا مشہور دنگل تھا۔ اہل عرب عموماً چہرون پر نقاب ڈالکر آتے تھے۔ علامہ احمد ابن ابی یعقوب جو نہایت قدیم زمانہ کا مؤرخ ہی اپنی تاریخ[2] مین لکھتا ہو کہ

وکانت العرب تحضر سوق عکاظ وعلے وجوهها البراقع فیقال ان اول عربی کشف قناعه ظریف بن غنم العنبری ففعلت العرب مثل فعله	یعنی اہل عرب عکاظ کے بازار مین آتے تھے اور اُنکے چہرون پر برقع پڑے ہوتے تھے۔ کہتے ہین کہ اول جس عربی نے برقع اُتارا وہ ظریف بن غنم تھا اُسکے بعد اورون نے بھی اُسکی تقلید کی

گو بعض وقتون مین خاص اسباب اس طریقہ کے اختیار کرنے کے باعث ہوے۔ لیکن اصل مین جس چیز نے اس طریقہ کی بنیاد قائم کی تھی وہ دو امر تھے۔

(۱) جسمانی حفاظت جسکا ذکر حمیر کے ذکر مین ہوچکا۔ حمیر مین تو عام و خاص سب اس طریقہ کو برتنے لگے تھے لیکن اور قبائل مین

[1] کتاب الاغانی ترجمۂ مقنع کندی۔

[2] تاریخ یعقوبی مطبوعۂ یورپ جلد دوم صفحۂ ۳۱۵

واسطے اُمرا اور اعیان کے ساتھ مخصوص تھا کیونکہ اس قسم کے تکلف اور آرام طلبی کی خواہش صرف امیرون ہی کو ہوسکتی تھی۔ رفتہ رفتہ ضرورت کی قید اُٹھگئی۔ اور صرف اس خیال سے کہ نقاب اور برقع امرا کا امتیازی لباس ہو۔ بے وجہ اور بے ضرورت بھی اُسکا استعمال ہونے لگا

(۲) امتیاز اور خصوصیت کا خیال۔ یہ خیال عجیب تدریج کے ساتھ قائم ہوا۔ اہل عرب محض ابتدائی زمانہ مین تو امیر غریب سب ایک ہی حالت مین رہتے تھے لیکن جسقدر تمدن کو ترقی ہوتی گئی اُسی نسبت سے امتیازات قائم ہوتے گئے۔ ان مین سب سے مقدم یہ تھا کہ اُمرا اور سرداران قوم کے دربار، عام نہ ہونے چاہئیں۔ چنانچہ جاہلیت ہی کے زمانہ مین دربان اور حاجب کے عہدے قائم ہوچکے تھے اور سلاطین اور سرداران قبائل کے دروازون پر اس قسم کی روک ٹوک ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ خیال یہان تک بڑھا کہ بادشاہ دربار مین بھی بیٹھے تو اُسکے جمال کی دولت عام نہ ہونے پائے۔ چنانچہ بعض سلاطین عرب صرف اسی خیال سے برقع کا استعمال کرتے تھے۔

عباسیون کی خلافت مین ایک زمانہ تک جو یہ طریقہ تھا کہ خلیفۂ وقت ایک پردہ کی اوٹ مین بیٹھتا تھا اور تمام شاہی احکام پردہ کی اوٹ سے صادر ہوتے تھے۔ اُسمین اسی خیال کا پرتو پایا جاتا ہے۔ جس زمانہ مین اس طریقہ کی ابتدا ہوئی اُسوقت تو عورتین اس رسم کے ساتھ مخصوص نہ تھین لیکن مردون سے یہ التزام بالالتزام

نبھ نہ سکا۔ چنانچہ جب عکاظ مین ظریف بن غنم نے چہرہ سے نقاب ہٹائی تو تمام عرب اُسکے مقلد بنکر اس قید سے آزاد ہو گئے۔ کبھی کبھی کسیقدر شوقیہ یا فخر کے لحاظ سے استعمال کیا تو وہ رواج عام کے خلاف سمجھا گیا البتہ عورتون مین یہ رسم اسلام کے زمانہ تک باقی رہی جسکو اسلام نے اور بھی باقاعدہ اور لازمی کردیا۔ جس شخص نے عرب جاہلیت کے حالات غور سے پڑھے ہین وہ تو اس سے انکار نہین کرسکتا لیکن چونکہ عام خیال یہ ہی کہ پردہ کا رواج اسلام کے زمانہ سے پیدا ہوا اسلیے ہم متعدد قطعی شہادتین پیش کرتے ہین جن سے ثابت ہوگا کہ اس قسم کا پردہ اسلام سے پہلے بھی موجود تھا۔

عرب جاہلیۃ کے حالات معلوم کرنے کے لیے سب سے عمدہ اور مستند ذریعہ شعراے جاہلیت کے اشعار ہین اسلیے اس دعوے کے ثبوت مین ہم جاہلیت کے متعدد اشعار نقل کرتے ہین

ربیع بن زیاد عبسی جو جاہلیت کا ایک مشہور شاعر ہی، مالک ابن زہیر کے مرثیہ مین کہتا ہی۔

من كان مسرورًا بمقتل مالك	فليأت نسوتنا بوجه نهار
جو شخص مالک کے قتل سے خوش ہوا ہو	وہ ہماری عورتون کو دن مین آکے دیکھے
يجد النساء حواسرًا يندبنه	يلطمن اوجههن بالاسحار
وہ دیکھیگا کہ عورتین برہنہ سر نوحہ کررہی ہین	اور اپنے چہرون پر صبح کو دوہتڑ مارہی ہین
قد كنّ يخبأن الوجوه تسترًا	فاليوم حين برزن للنظار

[illegible] جو پہلے اپنا چہرہ چھپایا کرتی تھین	لیکن آج وہ غیر [illegible] انکے سامنے بے پردہ آتی ہین

تبریزی نے شعرا کی شرح مین لکھا ہو عفۃً وحیاءً ۔ یعنی وہ عفت شرم کی وجہ سے چہرہ چھپایا کرتی تھین ۔

عمرو معدیکرب ایک سخت واقعۂ جنگ کے ذکر مین لکھتا ہو ۔

وبدت لمیس کانہا	بدر السماء اذ اتبدا
اور لمیس کا چہرہ کھل گیا	گویا چاند نکل آیا ہو ۔

عمرو معدیکرب اگرچہ مخضرمی شاعر ہو یعنی اُسنے اسلام کا زمانہ بھی پایا تھا ۔ لیکن یہ اشعار اسلام کے قبل کے ہین ۔

ایک اور جاہلی شاعر جسکا نام سبرۃ بن عمر فقعسی ہو اپنے دشمنون پر طعن کرتا ہو اور کہتا ہو ۔

و نسوتکم فی الروع باد وجوہہا	یخلن اماءً والاماء حرائر[1]
یعنی لڑائی مین تمھاری عورتون کے چہرے کھل گئے تھے	اور اسوجہ سے وہ لونڈیان معلوم ہوتی تھین حالانکہ وہ بیویان تھین

نابغۂ ذبیانی جو زمانۂ جاہلیت کا مشہور شاعر ہو نعمان بن منذر کا بڑا مقرب اور درباری تھا ۔ ایک دفعہ نعمان کی ملاقات کو گیا ۔ اتفاق سے وہان نعمان کی بیوی جسکا نام متجردہ تھا بیٹھی تھی ۔ نابغہ دفعۃً جاپہنچا تو وہ اوٹھ کھڑی ہوئی اضطراب مین دوپٹا گرگیا ۔ متجردہ نے فوراً ہاتھون سے چہرہ کو چھپالیا ۔ نابغہ کو یہ ادا نہایت پسند آئی ۔ اُسنے ایک قصیدہ لکھا جسمین اس واقعہ کو اسطرح ذکر کیا ہو[2] ۔

[1] یہ اور ماقبل کے اشعار حماسہ مین موجود ہین ۔ [2] اغانی ترجمۂ نابغۂ ذبیانی ۔

سقط النصیف ولم ترد اسقاطها	فتناولتہ واتقتنا بالید
دوپٹہ گر گیا اور اُسنے قصدًا نہین گرایا	اُسنے دوپٹہ کو سنبھالا اور ہاتون سے پردہ کیا

ایک اور شاعر عوف نامی یہ ذکر کرکے کہ بہوک کی شدت سے عورتین نکل آئین اور باہر جہان کھانا پک رہا تھا، چولہے کے پاس بیٹھ گئین ۔ کہتا ہی

وکانوا قعودًا حولها یرقبونها	وکانت فتاۃ الحی ممن ینیرها
بمبرزۃ لا یجعل الستر دونها	اذا أخمد النیران لاح بشیرها

حقیقت یہ ہی کہ اہل عرب نے زمانۂ جاہلیۃ مین لباس کے متعلق بہت ترقی کرلی تھی اگرچہ یہ ترقیان صرف اُمرا اور سرداران قبائل تک محدود تھین لیکن جن لوگون مین تھین پوری تہذیب و شایستگی کے ساتھ تھین۔ عورتون کے لیے لباس کے جو اقسام اُسوقت تک ایجاد ہوچکے تھے وہ جسم کے ہر حصہ کے لیے بخوبی پردہ پوش تھے۔ لباسون کا یہ تنوع زیادہ تر فخر و امتیاز کی بنا پر تھا اور یہی وجہ تھی کہ عوام کا طبقہ اُس سے محروم تھا جہان تک ہماری تحقیق ہی عورتون کے لباس کے متعلق دولت بنو امیہ اور عباسیہ کے عہد مین کوئی معتدبہ اضافہ نہین ہوا۔ یعنی زمانۂ جاہلیۃ مین جسقدر لباس ایجاد ہوچکے تھے اُس سے زیادہ اقسام پیدا نہین ہوسکے۔ اس سے ثابت ہوتا ہی کہ پردہ اور ستر بدن کا خیال، جاہلیۃ ہی مین خوب زور پکڑ چکا تھا۔

عورتین مختلف وضع کے کُرتے استعمال کرتی تھین جنکی قسمین

[illegible] ہے [illegible] قسمین اور اسی اعتبار سے انکے مختلف نام [illegible]

[illegible] منب [illegible] - قرقل - صدار - مجول - شوذر - مفضل - انین باہم

[illegible] فرق ہوتا تھا - انکی وضع محرم - کرتی - فتوحی - اور قمیص

سے ملتی جلتی تھی - اشعار جاہلیت مین قریبا یہ سب نام ملتے ہین

لیکن بلحاظ تطویل ہم ان اشعار کو قلم انداز کرتے ہین -

قصابہ - مقنع - وغیرہ بھی استعمال کیے جاتے تھے -

ان کپڑون کی ترتیب یہ تھی کہ سب سے پہلے ایک رومال

سر پر باندھا جاتا تھا جس سے سر کے دونون اگلے اور پچھلے

حصے چھپ جاتے تھے لیکن بیچ کا حصہ کھلا رہتا تھا - اسکو تخنیق

کہتے تھے - اسکے بعد ایک اور رومال باندھتے جس سے یہ مقصود

ہوتا تھا کہ بالون مین تیل لگا ہو تو اسمین جذب ہوکر رہجائے - اور

دوپٹہ مین نہ لگنے پائے ، اسکا نام غفارہ تھا - غفارہ کے اوپر

مختلف طول و عرض کے دوپٹے استعمال کیے جاتے تھے - جنکے

[illegible] نام ہین - صدار - خمار - نصیف - مقنعہ - معجر - رداء - خمار نہایت چھوٹا

ہوتا تھا اس سے بڑا نصیف اور نصیف سے بڑا مقنعہ وہکذا - خمار

وغیرہ کو اکثر اس انداز سے اوڑھتی تھین کہ چہرہ کا اکثر حصہ چھپ جاتا

تھا - اسی بنا پر شاعر کا قول ہے -

سقط النصیف و لم ترد اسقاطہ	فتناولتہ و اتقتنا بالید
[illegible] علی ۷۷ [illegible] لم یسند	و قد کان الدماء لہ خمار

لیکن خاص چہرہ کی حفاظت کے لیے برقع ہوتا تھا جسکی مختلف قسمین تھین، جو صرف آنکھ تک کا ہوتا تھا اُسکو وصواص کہتے تھے اُس سے نیچا نقاب کہلاتا تھا۔ نقاب سے نیچا لفام۔ اور اس سے نیچا لثام کے نام سے موسوم تھا۔ لفام کی حد ہونٹون سے تجاوز نہ تھی۔ سب سے بڑا نقاب جو چہرہ بلکہ سینہ کو بھی چھپاتا تھا اُسکو جنۃ کہتے تھے۔ نقاب کے یہ تمام اقسام جاہلیت مین پیدا ہوچکے تھے اور استعمال کیے جاتے تھے۔ اشعار ذیل سے اسکی تصدیق ہوتی ہو۔

اَرَین محاسنا وکنن اُخری		و ثقّبن الوصاوص للعیون
یَضِئ لنا کالبدر تحت غمامہ		و قد نزل عن غرالثنایا لفامہا

غرض لباس کا پردہ تمام عرب مین جاری تھا۔ اور بجز عوام اور کنیزون کے تمام عورتین اُسکی پابند تھین۔

بعض بعض مثالین اس رسم کے خلاف ملتی ہین مگر وہ نہایت شاذ ہین۔ لیکن دوسری قسم کا پردہ یعنی عورتون کا مردون کی سوسائٹیون مین شریک نہ ہوسکنا زمانۂ جاہلیت مین بالکل نہ تھا۔ عورتین عموماً مجلسون بازارون، لڑائیون مین شریک ہوتی تھین۔ بازار عکاظ مین جہان شعرا طبع آزمائیان کرتے تھے شاعرہ عورتین جاتی تھین اور اُنکے مستقل دربار قائم ہوتے تھے۔ وہ عام مجمع مین قصیدے پڑھتی تھین اور تحسین و آفرین کے صلے حاصل کرتی تھین۔

ایک بار خنساء جو مرثیہ لکھنے مین تمام عرب مین اپنا نظیر نہین رکھتی تھی عکاظ مین گئی اور نابغہ ذبیانی کے سامنے جو استاذ الشعرا تھا، اپنا قصیدہ پڑھا۔ نابغہ نے کہا افسوس! ابھی ایک شخص کو مین اشعر العرب کا خطاب دیچکا ہون ورنہ تجھکو یہ خطاب دیتا۔ تاہم کہتا ہون کہ تو عورتون مین سب سے بڑی شاعر ہو۔ خنساء نے کہا نہین بلکہ مین "اشعر الرجال والنساء ہون"۔

عام قاعدہ تھا کہ کسی گاؤن مین کسی شاعر کا گزر ہوتا تھا تو وہان کی تمام عورتین اُسکے پاس آتی تھین اور شعر پڑھنے کی فرمایش کرتی تھین اور چونکہ وہ عموماً سخن فہم ہوتی تھین شعرا بھی بڑے ذوق سے انکو اپنے اشعار سناتے تھے۔ غرض مشاعرہ۔ مناظرہ۔ میلے۔ بازار۔ دنگل میدان جنگ۔ کوئی ایسا مجمع اور مجلس نہ تھی جسمین عورتین بے تکلف شریک نہ ہوتی تھین۔

یہ زمانۂ جاہلیت کا حال تھا، اسلام کے زمانہ سے نیا دور شروع ہوا، اس عہد مین جو تغیرات اور اصلاحین ہوئین انکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

اسلام نے سب سے پہلی اصلاح یہ کی کہ جاہلیت مین کُرتون کے گریبان بہت چوڑے ہوتے تھے جن سے سینے نظر آتے تھے اسپر ذوقعدہ سنہ ۵ھ مین یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ		اور چاہیے کہ وہ اپنے دوپٹے اپنے گریبانون پر ڈال لین

عینی نے بخاری کی شرح مین اس موقع پر لکھا ہو -

و ذلك لان جيوبهن كانت واسعة تبدو منها نحورهن وصدورهن وما حواليها وكن يسدلن الخمر من ورائهن فتبقى مكشوفة فامرن بان يدلنها من قدامهن حتى يغطينها -	یہ آیت اسلیے نازل ہوئی کہ اُنکے گریبان چوڑے ہوتے تھے جن سے اُنکے سینے اور اُنکے اطراف نظر آتے تھے، اور وہ دوپٹون کو پشت کی طرف ڈالتی تہین اسلیے سینے کھلے رہجاتے تھے اسلیے انکو حکم ہوا کہ سامنے ڈالین تاکہ سینہ چھپ جائے -

نقاب اور برقع کا طریقہ اگرچہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہین پہلے سے جاری تھا لیکن مدینۂ منورہ مین یہود کے اختلاط کی وجہ سے اس کا رواج کم ہوچلا تھا، اکثر عورتین کھلے مونہ نکلتی تہین اسپر یہ آیت اُتری -

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ -	ای پیغمبر اپنی بیویون اور بیٹیون اور مسلمان بیویان سے کہدو کہ اپنے اوپر اپنی چادرین ڈال لیا کرین (یعنی چادرون سے اپنا مونہ چھپالیا کرین)

اس آیت کے متعلق تین حیثیت سے بحث ہوسکتی ہو -

آیت کا شان نزول کیا ہو -

آیت کے معنی کیا ہین -

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد صحابہ کا طریق عمل کیا رہا

شان نزول کے متعلق تفسیر ابن کثیر مین جو محدثانہ تفسیر ہو یہ تصریح ہو -

كان ناس من فساق اهل المدينة يخرجون بالليل حين يختلط الظلام الى طرق المدينة فيعرضون للنساء و كانت مساكن اهل المدينة ضيقة فاذا كان الليل خرج النساء الى الطرق فيقضين حاجتهن فكان اولئك الفساق يبتغون ذلك منهن فاذا رأوا المرأة عليها جلباب قالوا هذه حرة فكفوا عنها و اذا رأوا المرأة ليس عليها جلباب قالوا هذه امة فوثبوا عليها۔

مدینہ میں بدمعاشوں کا ایک گروہ تھا جو رات کی تاریکی میں نکلتا تھا اور عورتوں کو چھیڑتا تھا۔ مدینہ کے مکانات چھوٹے اور تنگ تھے، رات کو جب عورتیں قضاے حاجت کے لیے گھروں سے نکلتی تھیں تو یہ بدمعاش اُنسے بُرا ارادہ کرتے تھے جس عورت کو دیکھتے تھے کہ چادر میں چھپی ہوئی ہو اُسکو شریف زادی سمجھکر چھوڑدیتے تھے ورنہ کہتے تھے کہ یہ لونڈی ہے اور اُسپر حملہ کرتے تھے۔

طبقات ابن سعد جو نہایت قدیم یعنی تیسری صدی کی تصنیف ہو۔ اُسمین بھی یہی شان نزول لکھا ہو۔ چنانچہ اُسکے الفاظ یہ ہین۔

كان رجل من المنافقين يتعرض لنساء المؤمنين يؤذيهن فاذا قيل له قال كنت احسبها امة فامرهن الله ان يخالفن زي الاماء ويدنين عليهن من جلابيبهن تخمر وجهها الا

ایک منافق تھا جو مسلمان عورتوں کو چھیڑتا تھا تو جب اُس سے کہا جاتا تھا تو کہتا تھا کہ مین نے اُسکو لونڈی سمجھا تھا۔ اس بنا پر خدانے حکم دیا کہ لونڈیون کی وضع نہ بنائیں اور اپنے اوپر چادریں ڈال لیں اسطرح کہ بجز ایک آنکھ کے

ادنیٰ علیہن۔	اپنی سب چہرہ چھپ جائے۔
تفسیر کشاف مین ہے	
فامرن ان یخالفن بزیہن عن زی الاماء بلبس الاردیۃ والملاحف وستر الرؤس والوجوہ ۔	اسلیے انکو حکم ہوا کہ لونڈیون کی وضع سے الگ وضع اختیار کرین یعنی چادرین اور برقع استعمال کرین اور سر اور چہرہ چھپائین ۔

ان تصریحات مین ایک خاص امر یاد رکھنا چاہیے ۔ وہ یہ کہ ابن کثیر کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ بیبیون اور لونڈیون کے لباس اور وضع مین فرق تھا، اور وہ یہ تھا کہ بیبیاں، چادرون سے چہرہ چھپاتی تھین، اور لونڈیاں کھلے مونھ نکلتی تھین،

اشعار جاہلیۃ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے

ونسوتکم فی الروع باد وجوھہا	یخلن اماءً والاماء حرائر
تمھاری عورتون کے چہرے لڑائی مین کھل گئے تھے	اسلیے وہ لونڈیان معلوم ہوتی تھین، حالانکہ وہ لونڈیان نہ تھین

ابن کثیر کی عبارت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے زمانہ مین بھی یہ فرق قائم تھا اور اسی وجہ سے جب کوئی بی بی کھلے مونھ نکلتی تھی تو بدمعاشون کو انکے چھیڑنے کے لیے یہ عذر ہاتھ آتا تھا کہ ہمنے انکو لونڈی سمجھا تھا۔

آیت کے معنی کے متعلق دو لفظ بحث طلب ہین

جلباب اور **اِدناء** - جلباب کے معنی مین اگرچہ متاخرین مفسرین نے بہت سے اقوال نقل کیے ہین لیکن محقق یہ ہو کہ جلباب ایک مقنع یا چادر تھی جو تمام کپڑون سے زیادہ وسیع ہوتی تھی اور اسلیے سب کے اوپر استعمال کیجاتی تھی جسطرح آجکل ترکی خاتونین فراجہ استعمال کرتی ہین، تفسیر عماد بن کثیر مین ہو-

والجلباب هو الرداء فوق الخمار قاله ابن مسعود وعبيدة والحسن البصری و سعيد بن جبير و ابراهيم النخعی و عطاء الخراسانی و غير واحد -

جلباب چادر کو کہتے ہین جو خمار کے اوپر استعمال کیجاتی ہو- عبد اللہ بن مسعود- عبیدہ- حسن بصری- سعید بن جبیر- ابراہیم نخعی- عطاء خراسانی وغیرہ نے جلباب کے یہی معنی بیان کیے ہین-

دوسرا لفظ جو بحث طلب ہو وہ اِدناء ہو- اِدناء جلباب کے معنی تمام مستند مفسرین نے جو فن لغت کے بھی امام ہین مونھ چھپانے کے لکھے ہین-

حضرت عبد اللہ بن عباس جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور تمام صحابہ مین فن تفسیر کے اعتبار سے ممتاز ہین- ان کا قول تفسیر ابن کثیر مین علی بن طلحہ کی روایت سے نقل کیا ہو کہ

امر اللہ نساء المومنين اذا خرجن من بيوتهن فی حاجة ان يغطين وجوههن من فوق رؤسهن

خدا نے مسلمان عورتون کو حکم دیا کہ جب گھر سے کسی کام کو نکلین تو سر سے چادر اوڑھ کر چہرون کو چھپالین اور ایک آنکھ

بالجلباب ویبدین عینا واحدۃ۔	کُھلی رکھیں۔
تفسیر معالم التنزیل مین اس آیت کی تفسیر مین لکھا ہو۔	
قال ابن عباس و ابو عبیدۃ امر نساء المومنین ان یغطین رؤسھن و وجوھھن بالجلابیب الا عینا واحدۃ۔	ابن عباس اور ابو عبیدہ کا قول ہو کہ خدا نے مسلمان عورتون کو حکم دیا کہ چادر سے اپنا سر اور چہرہ چھپالین بجز ایک آنکھ کے۔
طبقات بن سعد مین ہی[1]۔	
محمد بن عمر عن ابی بسرۃ عن ابی صخر عن ابن کعب القرظی قال کان رجل من المنافقین یتعرض لنساء المومنین یوذیھن فاذا قیل له قال کنت احسبھا امۃ فامرھن اللہ ان یخالفن زی الاماء ویدنین علیھن من جلابیبھن تخمر وجھھا الا احدی عینیھا۔	محمد بن عمر نے ابو بسرہ سے اُنھون نے ابو صخر سے اُنھون نے ابن کعب قرظی سے روایت کی ہو کہ مدینہ مین ایک منافق تھا جو مسلمان خاتونون کو چھیڑا کرتا تھا اور جب اُسکو ٹوکا جاتا تھا تو کہتا تھا کہ مین نے لونڈی سمجھا تھا۔ تو خدا نے حکم دیا کہ لونڈیون کی وضع ترک کرین، اور اپنے اوپر اسطرح سے چادر ڈال لین کہ چہرہ چھپ جائے بجز ایک آنکھ کے۔
تفسیر کشاف مین ادنا، جلباب کی یہ تفسیر کی ہو۔	
یرخینھا علیھن ویغطین بھا وجوھھن۔	چادر کو اپنے اوپر ڈال لین اور چہرہ کو چھپالین۔

[1] جلد ہشتم صفحہ ۱۲۷ مطبوعہ یورپ۔

حضرت عبد اللہ بن عباس - ابو عبیدہ - ابن کعب قرظی، بغوی ابن کثیر - اور زمخشری - اس درجہ کے لوگ ہین کہ انکے مقابلہ مین اگر کسی مخالف کا قول ہوتا بھی تو اسکی کیا وقعت ہوسکتی، لیکن جہان تک ہمکو معلوم ہو شاذ و نادر کے سوا، تمام اہل لغت اور مفسرین نے یہی معنی بیان کیے ہین -

اس صورت مین صرف شاہ ولی اللہ صاحب کے مبہم ترجمہ سے ایسے معرکۃ الآرا، مسئلہ مین استدلال کرنا کسقدر تعجب انگیز ہو۔

پردہ کے متعلق تمام دنیا مین مسلمانون کا جو طریق عمل رہا۔ وہ یہ تھا کہ کبھی کسی زمانہ مین عورتین بغیر برقع اور نقاب کے باہر نہین نکلتی تھین اور بجز کسی خاص حالت کے، نامحرمون سے ہمیشہ مونہ چھپاتی تھین - یہان تک کہ یہ امر معاشرت کا سب سے بڑا، مقدم مسئلہ بنگیا تھا۔

تصدیق اسکی واقعات ذیل سے ہوگی -

ایک دفعہ مغیرہ بن شعبہ نے آن حضرت سے اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ مین فلان عورت سے شادی کرنی چاہتا ہون، آپ نے فرمایا کہ پہلے جاکر اُسکو دیکھ آؤ، اُنھون نے جاکر اُس عورت کے والدین سے اپنا ارادہ ظاہر کیا اور آنحضرت کا پیغام سنایا - صحابہ جسقدر آن حضرت کے حکم کی اطاعت کرتے تھے، محتاج بیان نہین تاہم والدین کو ناگوار ہوا، کہ لڑکی اُنکے سامنے آئے اور یہ اسپر

نظر ڈال سکین ۔ لڑکی پردہ مین سے یہ باتین سن رہی تھی ، بولی کہ اگر آنحضرت نے حکم دیا ہو تو تم مجکو آکر دیکھ لو ، ورنہ مین تمکو خدا کی قسم دلاتی ہون کہ ایسا نہ کرنا ۔ یہ واقعہ سنن ابن ماجہ باب النکاح مین مذکور ہو ۔

محمد بن مسلمہ ایک صحابی تھے ، اُنھون نے ایک عورت سے شادی کرنی چاہی اور اسلیے چاہا کہ چوری چھپے کسی طرح عورت کو دیکھ لین ، لیکن موقع نہین ملتا تھا ، یہان تک کہ ایک دن وہ عورت اپنے باغ مین گئی اُنھون نے موقع پاکر اُسکو دیکھ لیا ۔ لوگون کو معلوم ہوا تو نہایت تعجب سے لوگون نے اُن سے کہا کہ آپ صحابی ہوکر ایسا کام کرتے ہین ۔ اُنھون نے کہا کہ مین نے آنحضرت سے سنا ہو کہ جب کسی عورت سے شادی کا ارادہ ہو تو اس مین کچھ مضایقہ نہین کہ پہلے اُسکو دیکھ لیا جائے ۔ (سنن ابن ماجہ باب النکاح)

صاحب اغانی نے اخطل کے تذکرہ مین لکھا ہو کہ ایک دفعہ اخطل ، سعید بن ایاس کا مہمان ہوا ، سعید نے بڑے تپاک سے مہمانداری کی ، یہان تک کہ اُسکی دونون لڑکیان جنکا نام زعوم و امامہ تھا ، اخطل کی خدمتگزاری مین مصروف رہین ۔ دوسری دفعہ جب اخطل کو یہ موقع پیش آیا تو یہ لڑکیان جوان ہوچکی تھین اسلیے اخطل کے سامنے نہ آئین ، اغانی کے خاص الفاظ یہ ہین :

...ـر شؤل عليه ثانية وقد ...ـجـ محجبتا فسأل عنهما وقال ...ـى ابنتاى فاخبر بكبرهما۔

...خطل دوباره سعید کا مہمان ہوا تو لڑکیان بڑی ہو چکی تھین اسلیے اُنھون نے پردہ کیا، اخطل نے پوچھا کہ تیری لڑکیان کہان ہین۔ سعید نے کہا اب وہ بالغ ہو گئی ہین۔

پردہ کا اسقدر عام رواج ہو گیا تھا کہ جب کبھی کوئی واقعہ ...ـکے خلاف پیش آیا ہو تو مورخین اور واقعہ نگارون نے ایک مستقل واقعہ کی طرح اُسکا ذکر کیا ہو۔ ابن بطوطہ نے سفرنامہ مین جہان ترکون کا ذکر کیا ہو ایک عورت کا ذکر کرکے لکھتا ہو۔

وهى بادية الوجه لان نساء الاتراك لا يحتجبن،

اُسکا چہرہ کھلا ہوا تھا کیونکہ ترکی عورتین پردہ نہین کرتین۔

صاحبِ اغانی نے اخطل کے تذکرہ مین ایک ضمنی موقع پر لکھا ہو۔

وكان اهل البدو اذ ذاك يتحدث رجالهم الى النساء لا يرون بذلك باسا۔

اس زمانہ مین صحرانشین عربون مین مرد عورتون کی صحبتون مین شریک ہوتے تھے اور اُن سے بات چیت کرتے تھے اور اسکو معیوب نہین خیال کرتے تھے۔

اسی کتاب مین جمیل کے تذکرہ مین جو ایک بدوی شاعر تھا۔ لکھا ہو۔

ان جميل بن معمر خرج فى يوم عيد و النساء اذ ذاك يتزين ويبدو بعضهن لبعض ويبدون للرجال فى كل عيد۔

جمیل بن معمر ایک دفعہ عید کے دن نکلا۔ اس زمانہ مین عید کے دن، عورتین آراستہ ہو کر، ایک دوسرے سے ملتی تھین اور مردون کے سامنے آتی تھین۔

ان تمام واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں کا پردہ کرنا اور مونھ چھپانا، مسلمانوں کی عام معاشرت تھی، اسکے خلاف کوئی واقعہ ہے تو وہ خاص کسی قوم یا کسی خاص زمانہ سے تعلق رکھتا ہے اور کتابوں میں بطور ایک مستثنےٰ واقعہ کے ذکر کیا جاتا ہے

اس موقع پر ہم دوبارہ اپنے قومی نامور مصنف (مولوی امیر علی) کے ان الفاظ پر توجہ دلاتے ہیں کہ ۔

" خلفا کے زمانہ تک اعلے طبقہ کی عورتیں بلا برقع کے "

" مردوں کے سامنے آتی تھیں ۔ "

ذلك مبلغهم من العلم۔

صدر اول کی کتابیں

عام خیال ہو کہ ہجرت کی پہلی صدی مین کوئی کتاب تصنیف نہین ہوئی، اور اسلامی تعلیمات کا وہ دلچسپ مجموعہ جس کو "حدیث" اور "اخلاق" کہتے ہین، قریبًا سو برس تک غیر مرتب رہا۔ سب سے پہلے تصنیفات کی ابتدا ابن جریج سے ہوئی۔ اور پھر امام مالک نے موطا لکھکر آنے والے گروہ کے لیے تصنیف و تالیف کا راستا صاف کردیا۔ لیکن تصنیف کی ابتدا اگر انھین بزرگون سے ہو، تو ابن جریج نے ۱۵۰ھ مین وفات پائی ہو اور امام مالک نے ۱۷۹ھ مین، لہذا کتاب ابن جریج اور موطا دوسری صدی کی تصنیفات ہین۔

مذہبی تعلیمات کا ایک قرن تک یون غیر منضبط رہنا ایک نکتہ سنج کی نگاہ مین ضرور کھٹکتا ہو۔ اور اسی بناپر اہل یورپ نے اسلام پر صدہا اعتراضات کیے ہین، لیکن حقیقت یہ ہو

کہ اسلام مین دوسری صدی کے قبل کی کتابین اگر نہین ملتین تو یہ کیا بات ہو، یہودیون کی کتب مقدسہ (عہد قدیم) کے نسخے سنہ ۹۰۰ء سے قبل کے نہین ملتے اور تاریخ بتا رہی ہو کہ عیسائیون کی کتب عہد جدید بھی سنہ ۳۵۰ء کے بعد کی ہین -

سیفورِیم (عہد ماثورین[1]) کی کتابین سنہ ۵۰۰ء سے بعد کی ہین، تلمود سنہ [illegible] مین تصنیف ہوئی، عزرا (عہد عزیر) کا سنہ تصنیف ولادت مسیح علیہ السلام سے ۵۰۰ برس قبل ہو، اسفار سامری سنہ [illegible] مین لکھی گئین، اور سپٹواجنٹ (ترجمۂ سبعینیہ) غالباً سنہ ۲۸۰ قبل مسیح کا لکھا ہوا ہو -

عہد جدید کے ہزار سے زیادہ نسخون مین فقط تین نسخے ایسے دریافت ہوسے ہین جو اب سے ۱۵۰۰ برس پہلے لکھے گئے تھے - اناجیل اربعہ کے سب سے قدیم چار نسخے بتائے جاتے ہین، جن کا سنہ ۲۵۰ــــ۵۰۴ کے درمیان کا زمانہ قرار دیا جاتا ہو، ویٹیکان کوڈکیس اور سیناٹک کوڈکیس ولادت مسیح علیہ السلام کے ۳۴۰ برس بعد کے ہین اور الیگزنڈرین کوڈکیس اور دی کوڈکیس افرائم سنہ ۴۵۰ء کے ہین، لیکن ان سب کے مقابلہ مین صرف اسلام ہی یہ دعوی کرسکتا ہو کہ اُس کا مذہبی نسخہ "صحیفۂ عثمانی" اب بھی دنیا مین موجود ہو -

[1] عبرانی زبان مین حدیث و تفسیر کو "ماثور" کہتے ہین اور محدث و مفسر کو "ماثوری" ۱۲

اہل یورپ کی غلط فہمی رفع کرنے کے لیے میں اس مضمون میں مسلمانوں کے سلسلۂ روایت کی توثیق نہیں کرنا چاہتا، میرا موضوع بیان محدود ہے اور صرف صدر اول کی کتابوں سے متعلق ہے۔ مسلمان ہمیشہ مذہبی تعلیمات کے متعلق قرآن کو کافی سمجھتے رہے ہیں اس کا یہ منشا نہ تھا کہ وہ قانون تمدن کی پہلی دفعہ (تصنیف و تالیف) سے بے خبر رہیں۔

بے شبہہ عرب میں کتابت کا عام رواج نہ تھا۔ ملک بھر میں ۱۷ شخصوں کے علاوہ کسی کو لکھنا نہیں آتا تھا، اور جو لکھنے کے ساتھ تیر اندازی اور پیرنا بھی جانتا ہو وہ صاحب کمال سمجھا جاتا تھا۔ سارا عرب اسی جہالت میں مبتلا تھا، لیکن آفتاب اسلام کے طلوع ہوتے ہی تاریکی کافور ہوگئی اور تمدن کی مختلف شاخوں میں مسلمانوں نے اتنی جلدی ترقی کی جسے دیکھ کر اس دور ترقی کو بھی حیرت ہے۔

اس کی تعیین تو نہیں کی جاسکتی کہ سب سے پہلے کس کو تصنیف و تالیف کا خیال پیدا ہوا، لیکن یہ امر یقینی ہے کہ ہجرت کو فقط ۲۵ یا ۳۰ برس گزرنے پائے تھے کہ مسلمانوں کو کتابت کی طرف توجہ ہوئی اور مختلف عنوانات پر کتابیں لکھنا شروع کیں قاعدہ بن قدامہ نے جو حسن بن عطیہ کے ساتھ جنگ روم (سنہ یا سنہ) [illegible]

[1] فتوح البلدان بلاذری صفحہ ۲۷۹ -

مین شہید ہوے، فن حدیث، تفسیر، تجوید اور اخلاق مین کئی کتابین لکھین جن مین علامۂ ابن الندیم نے کتاب السنن کتاب القرآت، کتاب التفسیر، کتاب الزہد، اور کتاب المناقب کا تذکرہ کیا ہو۔

امیر معاویہ کے حکم سے عبید بن شریۂ جرہمی نے دنیا کی مختلف قومون کی ایک تاریخ طیار کی اور عوانہ بن حکم نے خاص عرب کی ایک تاریخ لکھی۔ عوانہ نے فن بایوگرفی مین بھی ایک کتاب لکھی اور امیر معاویہ کی لائف مین بھی اُن کی ایک تصنیف ہو، لیکن کتاب الفہرست کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہو کہ دونون کتابین ایک ہین۔

تفسیر کی ابتدا بھی اُسی مبارک عہد مین ہوئی حضرت علیؓ اکثر اوقات قرآن کے مطالب بیان کیا کرتے تھے۔ ابوحمزۂ ثمالی کو یہ سُن سُن کر تفسیر قرآن لکھنے کا شوق ہوا، چنانچہ قرآن کے جستہ جستہ مقامات کی جو تفسیر اُس نے لکھی تھی وہ کئی جز مین تھی[1]

عجیب بات یہ ہو کہ ان کتابون کے عنوانات ہمیشہ نئے نئے ہوتے تھے۔ مسائلِ خلافت کے متعلق ابن میثم کی کتاب الامامہ و کتاب الاستحقاق، تاریخی حیثیت مین اشتانی کی کتاب

[1] ایک جز مین بسا اوقات دو دو سو یا اس سے زیادہ ورق ہوتے تھے۔ دیکھو کتاب الفہرست مطبوعۂ لیپزگ (جرمنی) صفحۂ ۱۰۷ واللہ اعلم ۱۲

منقال ہی و منقول حسن بن علی اور علم کلام مین کتاب سلیم بن
قیس ہلالی مین یہ جدت کسی قدر وضاحت سے نظر آتی ہو۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ محض حدیث، تفسیر، کلام، اور سیرۃ مین
تصنیف و تالیف کا اُٹھتا ہوا جوش محدود ہوتا۔ نہین۔ بلکہ
حسب اقتضاے زمانہ اکثر علوم کی طرف توجہ ہوئی اور خاص کر
فن طب و کیمیا مین کئی کتابین لکھی گئین۔

غیر زبانون سے ترجمہ کی بنیاد بھی اسی عہد مین
پڑی، جس کے لیے صاحب کتاب الفہرست لکھتے ہین کہ سب
سے پہلے خالد بن یزید کے لیے عربی مین کتابین ترجمہ کی گئین
لیکن واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ اس اولیت کے مستحق
خالد کے دادا معاویہ ہین، جن کے حکم سے شام کے ایک
عیسائی طبیب ابن آثال نے طب کی کتابین عربی مین
ترجمہ کین۔

سب سے زیادہ جس علم مین مسلمانون نے وقت
صرف کیا، مشہور ہوے، اور صاحب فن و مجتہد کہلائے
وہ علم کیمیا ہو۔ ابن الندیم نے صفحۂ ۳۵۱ سے ۳۶۰ تک
اسی کا تذکرہ کیا ہو اور کیمیاوی تصنیفات و تراجم کی ایک
طویل فہرست دی ہو، جس مین بہت سی کتابین پہلی صدی
کی ہین۔ مثلاً کتاب الحرارات کتاب الوصیت وغیرہ وغیرہ۔

خاتمۂ سخن مین ہم یہ بھی کہنا چاہتے ہین کہ جس قوم کو کتابون کی جانب اس قدر انہماک ہوگا اُس کے لیے کتبخانہ قائم کرنا بھی ایک طبعی امر ہی۔ لیکن یہ امر کہ کتبخانے کی ابتدا کس سے ہوئی ؟ ایک امر مشتبہ ہی۔ عام رائے مین خالد بن یزید کا خزانۃ الکتب پہلا اسلامی کتبخانہ سمجھا جاتا ہی اور ہم بھی اُس کتبخانے کی وسعت، خوش انتظامی، کتابون کی فراوانی اور حسن و خوبی کو دیکھکر اس رائے کو تسلیم کرتے ہین، لیکن فی نفسہ کتبخانے کا وجود اس کے قبل بھی ثابت ہی۔ تاریخ ہم کو بتا رہی ہی کہ ابن ابی بعرہ کا کتبخانہ ہر حیثیت سے قابل وقعت تھا۔ محمد بن اسحاق صاحب مغازی متوفی ۱۵۰ھ نے اس کتبخانے کو خود جاکر دیکھا تھا۔ اُن کا بیان ہی کہ ابن ابی بعرہ کو اُن کے ایک دوست نے جو کوفہ کے سربرآوردہ شخص تھے، مرتے وقت یہ کتبخانہ ہبہ کردیا تھا، اور قرینہ سے معلوم ہوتا ہی کہ ۱۲۰ھ کے بعد یہ کتبخانہ قائم ہوا تھا واللہ اعلم بالصواب۔

خادم قوم
عبد اللہ عمادی

علمی خبرین

اورینٹل کانفرنس۔ علماے یورپ نے مشرقی علوم اور زبانون کی تحقیقات کے لیے ایک انجمن قائم کی ہو۔ جس کا چودھوان سالانہ اجلاس اس سال الجزائر مین ہوا تھا۔ اس اجلاس مین ایک رزولیوشن یہ پاس ہوا ہو کہ ضرورت زمانہ سے عربی مین جس قدر غیر زبانون کے الفاظ دخیل ہوگئے ہین، بجاے اُن کے خاص عربی اصطلاحین قرار دینی چاہیین۔ اس غرض کے لیے ایک کمیٹی قائم ہوگی جس کی شاخین مصر و شام وغیرہ مین بھی ہونگی۔

تمدن اسلام۔ اورینٹل کانفرنس کے اہتمام سے تمدن اسلام کے متعلق ایک سائیکلوپیڈیا طیار ہو رہی ہو، جس کی تالیف مین یورپ کے ۵۰ عالم شریک ہین۔ یہ کتاب ۱۵ برس مین مرتب ہوگی۔

شکار کرنے والے نباتات۔ قریبًا ۴۰۰ ایسے نباتات

دریافت ہوے ہین جن کا خاصہ کیڑے مکوڑون کا شکار کرنا ہی
ان نباتات کی اصلی قسمین ۱۸ ہین -

ٹوکیو - جاپان کے دارالسلطنت ٹوکیو مین ایک کالج عورتون کے لیے مخصوص ہی، جس مین ۵۸۲ لڑکیان تعلیم پاتی ہین- مدت تعلیم تین برس ہی، اور اسی تھوڑی سی مدت مین اکثر ضروری علوم، حفظ صحت، علم النفس، تاریخ فنون، اخلاق، کیمیا، طبعیات اور حسن معاشرت وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہی-

مسٹر کارنجی - امریکہ کے مشہور سخی مسٹر کارنجی نے امریکہ کالجون کے پروفیسرون کو سالانہ ۵ لاکھ ڈالر انعام دینا منظور کیا ہی- یہ انعام صرف قومی کالجون کی حوصلہ افزائی کے لیے ہی- گورنمنٹ کالج کو اس سے مطلب نہین -

ہیڈروسکوپ - رانٹجن صاحب کی شعاعون سے تو زمین پر کی چھپی ہوئی چیزین جو نظر نہ آتی ہون دکھائی دیتی ہین لیکن مسٹر پنو کی ہیڈروسکوپ سے سمندر کی تہ کا حال معلوم ہوجاتا ہی یہ آلہ اگر پانی مین لگادیاجائے اور ایک اخبار ۲۶۰ فیٹ کی گہرائی مین رکھدیاجائے تو پانی کی سطح کے اوپر سے صاف طور سے پڑھ سکتے ہین -

برقی روشنی - تجربہ کیا گیا ہی کہ زرد رنگ کی برقی روشنی سے اعمال جراحی مین آرام ملتا ہی- کلورافارم کی طرح اسس روشنی

ہے۔ بھی مریض بے ہوش ہوجاتا ہو اور عمل یا ئید کی تکلیف کا احساس نہین ہوتا۔

مچھلی۔ خراب مچھلی کھانے سے اکثر خون مین فساد ہوجاتا ہو، اور جن لوگون کا معدہ ضعیف ہو اور مزاج مین سوداویت بلغمیت غالب ہو، اُن کو مچھلی کی کثرت زیادہ مضر ہو اور جذام برص پیدا ہونے کا خوف ہو۔

کنز العلوم۔ مصر کے مشہور فاضل ڈاکٹر فرید وجدی اسلامی علوم کی ایک سائیکلوپیڈیا کر رہے ہین۔ اس کا نام کنز العلوم ہوگا۔

تصنیفات سے آمدنی۔ ہندوستان مین اول تو مفید کتابین کم لکھی نہین جاتین اور اگر کسی نے لکھین بھی تو ملک کی عام ناقدروانی سے اُسے کوئی فائدہ نہین ہوتا۔ لیکن یورپ مین یہ کیفیت نہین ہو۔ وہان ایک کتاب سے ہزارون کی آمدنی ہوتی ہو۔ سر والٹر سکاٹ کو صرف اپنی کتابون کی وجہ سے ۸۰ ہزار لیرہ (لیوری) کی آمدنی ہوئی۔ مس جارج الیٹ کو صرف ایک ناول "رومولا" کی وجہ سے ۱۰ ہزار لیرہ ملے۔ لارڈ رابرٹس و مسٹر جون مصنف لائف آف گلیڈسٹون اور مسٹر سٹینلی کو ایک ایک کتاب مین دس دس ہزار لیرہ کی آمدنی ہوئی۔ مس میری کارلی کو ناول "زسکا" کی اشاعت سے ہزار لیرہ ملے۔ اور مسٹر ہل کائن کو فقط ایک کتا

"دی کریچین" کی تصنیف سے ایک لاکھ لیرہ کا فائدہ ہوا۔

کائنات اور زندگی۔ ڈاکٹر رسل ولیس کی راے مین تمام کائنات کی خلقت انسان کے لیے ہوئی ہی۔ اہل یورپ کائنات کی وسعت کے مقابلہ مین سمجھتے تھے کہ زمین ایک نقطہ کے برابر ہی۔ ڈاکٹر صاحب نے ثابت کیا ہی کہ یہ نقطہ مرکز کائنات مین واقع ہی، اور زندگی صرف مرکز کائنات مین ممکن ہی اطراف مین ممکن نہین۔ لہذا بجز کرۂ زمین کے کواکب وغیرہ مین حیوانات کی آبادی خلاف واقع ہی۔

انگلستان اور دیوانگی۔ انگلستان مین دیوانون اور پاگلون کے علاج کے لیے ہر سال ۴۰ لاکھ پونڈ صرف ہوتے ہین، لیکن پھر بھی نتیجہ حسب خواہش نہین نکلتا۔ اس وقت انگلستان مین ایک لاکھ ۵۷ ہزار پاگل موجود ہین، جن کی دیوانگی کا سبب کثرت زنا و شرابخواری ہی۔

راز تندرستی۔ تندرستی کا راز یہ ہی کہ کھانا اوقات معینہ پر کھایا جائے اور کبھی بے وقت نہونے پائے۔ غذا نہایت سادی اور معتدل ہو۔

حفظ صحت کی تدبیر۔ حفظ صحت کی سب سے اچھی تدبیر ریاضت جسمانی ہی، لیکن کسی سبب سے ریاضت کا اتفاق نہ پڑے تو دوسری تدبیر یہ ہی کہ حتی الوسع گوشت کھانا کم کیا جائے کیون کہ اس سے بہت سے نقصانات پیدا ہوتے ہین جن کی مضرتین ضعیفی مین محسوس ہوتی ہین۔

چندہ ندوۃ العلماء من ابتداے یکم محرم لغایت سلخ صفر ۱۳۱۲ھ

چندہ ندوۃ العلماء

نمبر	اسمائے گرامی	تعداد رقم
۱	جناب منشی تفضل حسین خانصاحب و منشی محمود علیخانصاحب رئیس بھرپور ضلع بارہ بنکی	عہ
۲	جناب مسٹر محمد سعید صاحب بیرسٹر ایٹ لا پرتاب گڈھ	عہ/
۳	جناب مولوی فدا حسین صاحب رئیس موضع رتنی ضلع گیا	عہ
۴	جناب محمد حسن و نبی بخش صاحب تاجر سلطان پور	ع/
۵	جناب شیخ کفایت اللہ صاحب رئیس پرتاب گڈھ	عہ/
۶	جناب شیخ باقر صاحب برادر خرد شیخ صاحب موصوف	عہ
۷	جناب احکام الدین صاحب ناظر کلکٹری سلطان پور	ع/
۸	جناب حاجی رحیم بخش صاحب پنشنر انسپکٹر پولیس سلطانپور	ع/
۹	جناب منشی بشیر الدین صاحب محافظ دفتر کلکٹری سلطان پور	ع/
۱۰	جناب الٰہی بخش صاحب کوتوال شہر سلطان پور	ع/
۱۱	جناب خداداد خانصاحب معلم پٹواریان سلطان پور	ع/
۱۲	جناب کلن صاحب لالہ پورہ سلطانپور	عہ
۱۳	جناب سید اشرف حسین صاحب رئیس خیرآباد ضلع سلطان پور	ع/
۱۴	جناب شیخ بنیاد حسین صاحب نقل نویس کلکٹری سلطان پور	ع/
۱۵	جناب منشی ولی صاحب عرائض نویس سلطان پور	ع/
۱۶	جناب عبد الولی خانصاحب سلطانپور	ع/
۱۷	جناب منشی محمد باقر خانصاحب ڈپٹی کلکٹر سلطان پور	ع/
۱۸	جناب مولوی شیخ عبد السلام صاحب وکیل سلطانپور	ع/
۱۹	جناب میاں محمد ہادی صاحب محرر	ع/

نمبر	نام	رقم	نمبر	نام	رقم
	شیخ عبدالسلام صاحب وکیل سلطان پور	عہ ر		جناب منشی احسان الحق صاحب محرر وکیل	صہ ر
۲۰	جناب منشی عظیم اللہ صاحب سررشتہ دار کلکٹری سلطان پور	عہ ر	۳۰	جناب مولوی محمد حسین صاحب قبلہ	صہ ر
۲۱	جناب شیخ تفضل حسین صاحب ریونیو ایجنٹ سلطان پور	عہ ر	۳۱	جناب حافظ شکر اللہ صاحب طبیب میونسپلٹی پرتاب گڈھ	صہ ر
۲۲	جناب داروغہ الفت علی خاں صاحب سلطان پور	عہ ر		جناب منشی مخدوم خاں صاحب ماسٹر پرتاب گڈھ	صہ ر
۲۳	جناب مولوی محمد اسمعیل صاحب تاجر و سکرٹری معین الس.. سلطان پور	عہ ر	۳۴	جناب منشی سید احمد صاحب محرر جوڈیشل تحصیل پرتاب گڈھ	صہ ر
۲۴	جناب سید فخر الحسن صاحب اسپیشل اسسٹنٹ سردار شہر ریاست بیکانیر	صہ ر	۳۵	جناب منشی مختار احمد صاحب کلرک پولیس پرتاب گڈھ	صہ ر
۲۵	جناب مولوی اکرام الدین صاحب مدرس مدرسہ چترال	سے ر	۳۶	جناب شیخ نور محمد صاحب عطار پرتاب گڈھ	صہ ر
۲۶	جناب شیخ مبارک احمد صاحب ریونیو ایجنٹ پرتاب گڈھ		۳۷	جناب شیخ فضل الدین صاحب عرائض نویس پرتاب گڈھ	صہ ر
۲۷	جناب شیخ رجب علی صاحب پنشنر سب انسپکٹر	عہ ر	۳۸	جناب منشی حیات علی صاحب محرر تھانہ پرتاب گڈھ	صہ ر
۲۸	جناب منشی یعقوب شاہ خاں صاحب منصرم سب ججی پرتاب گڈھ	عہ ر	۳۹	جناب آلہی صاحب موکیری	ہہ ر
			۴۰	جناب موسٹی صاحب موکیری	ہہ ر
			۴۱	جناب حافظ عاشق علی صاحب امام مسجد پرتاب گڈھ	صہ ر

۴۲	صرف موسوف الصدر	۵۰ر	۵۲	جناب مراد صاحب تباکو فروش کمندر د گنج	۸ر
۴۳	منشی نند لوہ پرشاد صاحب سباورسیر	۱۰ر	۵۴	جناب ماسٹر فضل حسین صاحب	۸ر
۴۴	جناب شیخ کفایت اسد صاحب جاقادلتر دیوانی پرتاب گڈھ	۵ر	۵۵	جناب شیخ علی حسین صاحب گرداور قانون گو	۶ر
۴۵	جناب منشی شرف الدین صاحب اہلمد منصفی پرتاب گڈھ	۵ر		جناب منشی غیاث الدین صاحب کلرک خزانہ پرتاب گڈھ	عہ ر
۴۶	جناب سید شاہ صاحب ابن رشید الدین صاحب وکیل	۵ر	۵۷	جناب محسن خانصاحب زمیندار بہلول پور ضلع پرتاب گڈھ	۵ر
۴۷	جناب عبد اسد خان صاحب رئیس پرتاب گڈھ	۳ر	۵۸	جناب میر تصدق حسین صاحب بورڈنگ محمدن پرتاب گڈھ	۴ر
۴۸	جناب عبد الصمد صاحب ملازم عبد اسد خانصاحب	۵ر	۵۹	جناب نظام الدین صاحب بورڈر محمدن پرتاب گڈھ	۲ر
۴۹	جناب شیخ حمایت حسین صاحب رئیس پرتاب گڈھ	۵ر	۶۰	جناب اشتیاق حسین صاحب بورڈر محمدن پرتاب گڈھ	۲ر
۵۰	جناب خورشید حسین صاحب نقل نویس	۴ر	۶۱	جناب وکیل احمد صاحب بورڈر محمدن پرتاب گڈھ	۲ر
۵۱	جناب محمد خان صاحب سوداگر کمندر د گنج	۴ر	۶۲	جناب مرتضی حسین صاحب بورڈر محمدن پرتاب گڈھ	۲ر
۵۲	جناب علی حسن صاحب اسٹامپ فروش بازار کمندر د گنج	۴ر	۶۳	جناب ممتاز حسین صاحب امین عدالت بوارہ	۵ر

۶۴	جناب حسینی صاحب کبری کندرو گنج	۴ر
۶۵	جناب منشی خلیل احمد صاحب سب انسپکٹر پولیس پرتاب گڈھ	عہ
۶۶	جناب بھگوتی صاحب تاجر چرم کندرو گنج	سے ر
۶۷	جناب منشی سورج بلی صاحب مور پنڈت شیوراج صاحب	عہ
۶۸	جناب پنڈت دوارکا پرشاد صاحب مہاجن	صہ ر
۶۹	جناب شہو پرشاد صاحب ٹھیکہ دار کندرو گنج	عار
۷۰	جناب منشی رگھو پرشاد صاحب اہلمد سب جج	۸ر
۷۱	جناب منشی ابوسعید صاحب اہلمد سب جج	صہ ر
۷۲	جناب منشی الٰہی بخش صاحب نقل نویس سب جج	عہ ر
۷۳	جناب منشی احمد علیخان صاحب مدرس	عہ
۷۴	جناب شیخ عبدالعلی صاحب مدرس	عہ
۷۵	جناب محمد صدیق صاحب مدرس	۸ر

۷۶	جناب سید مومن علی صاحب مدرس	۴ر
۷۷	جناب دلدار حسین صاحب نائب داروغہ جیلر	عار
۷۸	جناب منشی محمد حسین صاحب کلرک	صہ ر
۷۹	جناب منشی مولوی خیرالعلی صاحب مدرس	صہ ر
۸۰	جناب شیخ ممتاز حسین صاحب اہلمد منصفی	عہ ر
۸۱	جناب شیخ محمد علی صاحب محرر بیرسٹر صاحب	صہ
۸۲	جناب منصب خانصاحب چپراسی سب جج پرتاب گڈھ	سے ر
۸۳	جناب محمد شفیع صاحب نائب ناظر فوجداری	صہ ر
۸۴	صاحبزادہ سید رشید الدین صاحب بی۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل پرتاب گڈھ	عہ ر
۸۵	جناب شیخ سلطان حسن صاحب داروغہ جیل پرتاب گڈھ	سے ر
۸۶	جناب عبدالہادی صاحب لازم سب جج پرتاب گڈھ	۸ر

[illegible]	جناب مولوی اصلاح الدین حیدر صاحب وکیل	صہ/
[illegible]	جناب عظیم خان چپراسی	۴/
۸۹	جناب نجم الدین چپراسی	۴/
۹۰	جناب نثار علی صاحب چپراسی	۲/
۹۱	جناب محمد اسمٰعیل صاحب	۲/
۹۲	جناب منشی احمد حسین صاحب اوورسیر	عہ/
۹۳	جناب احمد حسین خانصاحب قرق امین بستی	عہ/
۹۴	ایک متنفس	۵/
۹۵	جناب شیخ محمد اسحاق صاحب	۴/
۹۶	جناب ضیاء الحق صاحب مختار راجہ صاحب	۸/
۹۷	جناب شیخ احمد اسد صاحب	۲/
	میزان کل	الہ

چندۂ خزانۂ محمدیہ

۱	جناب منشی محبوب الٰہی صاحب سب انسپکٹر پولیس کوہ جراہ	ے
	حافظ محمد سعید صاحب شہر کہنہ بارہرہ	ہے
	میزان کل	ہے

چندۂ اشاعت اسلام

۱	جناب سید امام علی صاحب ضلع ہردوئی	صہ
۲	جناب غلام علی صاحب یک آنہ ماہوار	۶/
	میزان کل	ہے

چندہ زکوٰۃ

۱	جناب منشی امام الدین صاحب ہیڈ کلرک انجنیرنگ آفس پرتاب گڈھ	ہے
۲	معرفت مولوی شاہ محمد حسین صاحب بہاری وستہ ضلع پٹنہ بابت چندہ متفرق	عہ
	میزان کل	سے

چندۂ یتیمخانہ کانپور

جناب سید امین الدین صاحب ہردوئی	۱۲/

چندۂ دار العلوم من ابتدائے یکم محرم ۱۳۲۳ھ لغایت سلخ صفر ۱۳۲۳ھ

چندہ دار العلوم

جناب مسٹر غلام حسین صاحب عارف رئیس	

	و تاجر امرتسر ... کلکتہ	الت	۱۵	جناب بہادر علیصاحب چپراسی	
۲	جناب منشی سرفراز علیصاحب رئیس			سلطان پور	عہ/
	منلپورہ فیض آباد	عہ۵/	۱۶	جناب شیخ تفضل حسین صاحب سوڈفیو	
۳	جناب منشی باقر رضا صاحب ڈپٹی کلکٹر سلطانپور	سے/		ایجنٹ سلطان پور	عہ
۴	جناب مولوی شیخ علیہ السلام صاحب وکیل سلطانپور	سے/	۱۷	جناب الٰہی بخش خانصاحب سلطانپور	عہ/
۵	اہلیہ جناب عبد السلام صاحب وکیل سلطانپور	سے/	۱۸	جناب داروغہ الفت علیصاحب	
۶	جناب شیخ ثناء الرحمن صاحب ساکن			سلطان پور	صہ/
	براگاؤں ضلع بارہ بنکی	صہ/	۱۹	جناب کولئی صاحب سلطانپور	عہ/
۷	جناب بابو نظیر حسن صاحب سلطانپور	عہ/	۲۰	جناب سعید الدین صاحب جوتہ فروش	
۸	معلوم الاسم	۸/		سلطان پور	۶/
۹	جناب مرزا عبد الجبار صاحب سوداگر		۲۱	جناب زین محمد صاحب سوداگر سلطان پور	۶/
	سلطانپور	عہ/	۲۲	جناب حافظ عبد الغنی صاحب سلطانپور	عہ
۱۰	جناب منشی عظیم اللہ صاحب سررشتہ دار		۲۳	جناب منشی ریاض الدین صاحب سلطانپور	عہ
	کلکٹری سلطانپور	۶/	۲۴	جناب مصاحب علیصاحب سلطانپور	عہ
۱۱	جناب محمد رضا صاحب سوداگر سلطانپور	صہ/	۲۵	جناب حکیم حمید الدین صاحب سلطانپور	صہ/
۱۲	جناب مولوی محمد عمران صاحب انسپکٹر		۲۶	جناب حاجی محمد حسین صاحب بساطی	عہ/
	آبکاری سلطانپور	عہ/	۲۷	جناب حکیم آباد حسین صاحب مجتہد پرتاب گڈھ	صہ/
۱۳	جناب منشی احکام الدین صاحب ناظر کلکٹری		۲۸	جناب شہاب الدین صاحب سب	
	سلطان پور	عہ/		انسپکٹر سلطان پور	عہ
۱۴	جناب الٰہی بخش خانصاحب پلٹن بازار		۲۹	جناب سیف اللہ صاحب خیرآباد	عہ/
	سلطانپور	عہ/	۳۰	جناب قادر بخش صاحب سلطانپور	۸/

۳۱	جناب عبدالغفور صاحب بزازہ سلطانپور	۸ر		سلطان پور	صہر
۳۲	جناب ولی محمد صاحب بزازہ سلطانپور	۸ر	۴۶	جناب جعفر خانصاحب سلطان پور	سہر
۳۳	جناب فیض اللہ صاحب بزازہ سلطانپور	۸ر	۴۷	جناب نور محمد صاحب عطار سلطانپور	صہر
۳۴	جناب منشی ارشد علیصاحب عرائض		۴۸	جناب رعایت علیخاں صاحب کانسٹبل	
	نویس سلطانپور	عہر		سلطان پور	عہر
۳۵	جناب شیخ عبدالصمد صاحب سلطانپور	۲ر	۴۹	جناب منشی ظہورالحق صاحب سلطانپور	صہر
۳۶	جناب بہادر حسین صاحب سلطانپور	۲ر	۵۰	جناب صدرالدین صاحب سلطانپور	۸ر
۳۷	جناب حاجی علی بخش صاحب خیاط		۵۱	جناب میران بخش صاحب سوداگر سلطانپور	عہر
	سلطانپور	صہر	۵۲	جناب محمد یوسف صاحب حجام سلطانپور	۸ر
۳۸	جناب برخوردار صاحب سلطانپور	۱ر	۵۳	جناب محمد ابراہیم صاحب حجام سلطانپور	۸ر
۳۹	والدہ صاحبہ ابوالبرکات	۳ر	۵۴	جناب ضمیر احمد صاحب کانسٹبل سلطانپور	۸ر
۴۰	معلوم الاسم صاحب	۱ر	۵۵	جناب محمد بخش صاحب سوداگر مٹھ	۸ر
۴۱	جناب منشی عبدالرحیم صاحب اسٹامپ		۵۶	جناب شیخ شہاب الدین صاحب	
	فروش سلطانپور	۸ر		محرر رجسٹری	۸ر
۴۲	جناب صاحب دین صاحب		۵۷	جناب شیخ چھیدی لالہ پورہ سلطانپور	صہر
	عرائض نویس سلطانپور	۴ر	۵۸	جناب چھنگا صاحب لالہ پورہ سلطان پور	صہر
۴۳	جناب عالم علیصاحب عرائض نویس		۵۹	جناب محمد کاظم صاحب مختار دہوردا	
	سلطانپور	۴ر		سلطانپور	عہر
۴۴	جناب سید راحت حسین صاحب		۶۰	جناب رحیم بخش صاحب لالہ پورہ سلطانپور	۴ر
	ٹھیکہ دار سلطانپور	۶ر	۶۱	جناب ثابت علیصاحب لالہ پورہ سلطانپور	۴ر
۴۵	جناب منشی کریم صاحب محرر کوتوالی		۶۲	جناب ملو علیصاحب عرائض نویس سلطانپور	۴ر

۴۳	حسبینہ شیخ عبدالسلام صاحب وکیل سلطان پور	عا ر
۴۴	جناب نور محمد خانصاحب سلطانپور	۸ ر
۴۵	جناب سید منظور احمد صاحب	عہ
۴۶	جناب شیخ مبارک اللہ صاحب ریونیو ایجنٹ پرتاب گڈھ	عا ر
	میزان کل	۱۱۸۱ صہ / ۲۶.۱۵
	سرمایہ دارالعلوم	
۱	جناب مولوی ممنون حسن خانصاحب تحصیلدار بریلی	صہ ر
۲	جناب منشی میر حسن خانصاحب اسسٹنٹ مجسٹریٹ رامپور	عا ر
۳	جناب جمعہ خانصاحب جر رامپور	عہ ر
۴	جناب امراء الدولہ خانصاحب ریاست رامپور	عہ ر
۵	جناب دولہ خان صاحب مجسٹریٹ رامپور	عا ر
۶	جناب محمد فاروق صاحب رامپور	صہ
۷	جناب منشی شیرزمان خانصاحب بہادر ممبر کونسل رامپور	عا ر
۸	جناب محمد محمود شاہ صاحب کپتان ریاست رامپور	صہ ر
۹	جناب سید مرتضی حسین صاحب کورٹ انسپکٹر ریاست رامپور	عا ر
۱۰	جناب منشی ہدایت اللہ خانصاحب اسٹیشن ماسٹر کچھا ضلع نینی تال	صہ ر
۱۱	جناب منشی نصرت اللہ خانصاحب زمیندار موضع دوریا تحصیل کچھا	عا ر
۱۲	جناب نصیر الدین صاحب موضع کرد تحصیل کچھا	عا ر
۱۳	جناب حافظ محمد خلیل صاحب قصبہ ہندولی ضلع نینی تال	صہ ر
۱۴	جناب قاضی محمد اسحاق صاحب محرر تحصیل کچھہ	صہ
۱۵	جناب سید اطہر علی صاحب نائب تحصیلدار کچھہ	سے ر
۱۶	جناب منشی یاور حسین صاحب سب اوورسیر کچھہ	سے
۱۷	جناب بابو امام الدین صاحب سب اوورسیر کچھہ	
۱۸	جناب فدا علی صاحب میس کندرکی ضلع مرادآباد	صہ ر
۱۹	جناب منشی محمد نور الحسن صاحب ڈپٹی کلکٹر	

[illegible] آن کی [illegible]

[illegible] اور [illegible]

[illegible] حضرات [illegible]

[illegible] اُن کی [illegible]

[illegible] حال میں مراد [illegible]

[illegible] کاغذ بعض [illegible]

[illegible] آئینہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

دستور العمل

(۱) یہ رسالہ ہر مہینے کے پہلے ہفتے مین شائع کیا جائے گا

(۲) اس رسالہ کی ضخامت [illegible] صفحے ہوگی۔

(۳) اس رسالہ کا مقصد علوم اسلامیہ کا احیاء اور علوم قدیمہ جدیدہ کی اشاعت ہے اسکے ساتھ حسب ذیل مضامین

(۱) عربی زبان کی نادر الوجود کتابون پر تقریظ و تنقید۔

(۲) ممالک اسلامیہ مین آجکل جو کتابین لکھی جا رہی ہین اُنپر تقریظ۔

(۳) اکابر سلف کی سوانح عمریان جسمین زیادہ تر انکے اجتہادات سے بحث ہوگی۔

(۴) نصاب تعلیم مروجہ پر بحث۔

(۵) ندوۃ العلما کے متعلق حالات۔

(۶) علمی خبرین۔

(۴) چونکہ دقیق مضامین سے عام لوگون کو دلچسپی نہین ہوسکتی اسلیے ہر پرچہ مین ایک دو
دقیق مضامین اور باقی عام فہم و آسان ہونگے۔

(۵) یہ رسالہ دو قسم کے کاغذ پر چھپے گا۔ اول قسم کی قیمت مع محصول ۳ر اور دوسری قسم کی
مع محصول دو روپیہ سالانہ ہوگی۔ نمونہ کا پرچہ قسم اول ۴ر اور قسم دوم ۳ر آنے پر روانہ کیا جائے گا۔

(۶) کل خط و کتابت منیجر رسالہ کے نام "دفتر ندوۃ العلما۔ لکھنؤ" کے پتہ سے کی جائے
اور روپیہ بھی اسی پتہ سے بھیجا جائے۔

(۷) جسکے پاس کسی مہینے مین رسالہ نہ پہونچے تو اُسی مہینے مین اطلاع دینی چاہیے ورنہ
تعمیل نہ ہوسکے گی۔

(۸) جو صاحب خط لکھین وہ اپنا نام صاف و واضح خط مین لکھین اور قیمت کا نمبر بھی ضرور درج کر دین

سید عبدالحی

منیجر رسالہ

اب ندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتبہ

سید ابو الحسن علی ندوی

استاذ تفسیر و ادب

عبد السلام قدوائی ندوی

استاذ تاریخ و اقتصادیات

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۲ صفر المظفر ۱۳۶۰ھ مطابق مارچ ۱۹۴۱ء نمبر ۳

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے

تمام خط وکتابت اور ترسیل زر منیجر الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہیے

شذرات

تعلیم و تربیت سے مقصود یہ ہے کہ طلبا کو مستقبل کے لئے تیار کیا جائے تاکہ وہ زندگی کے نشیب و فراز سے واقف ہو سکیں اور آیندہ جب ان کے ہاتھ میں قوم کی باگیں آئیں تو ماضی کی یہ تربیت ان کے لئے مشعل راہ کا کام دے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضرورت ہے کہ تعلیم گاہوں کے محدود دائرہ میں وسعت پیدا کی جائے طلبا کو موقع دیا جائے کہ وہ درسگاہوں کے باہر بھی زندگی کی حقیقتوں کا مشاہدہ کر سکیں، اس خیال کے ماتحت ندوہ میں مشاہیر قوم کو دعوت دیجاتی ہے کہ وہ اپنے خیالات و افکار سے طلبا کو مستفید کریں کبھی کبھی طلبا کو ملک کے مختلف تعلیمی اور تمدنی مرکزوں کی سیر بھی کرائی جاتی ہے تاکہ اس سیاحت سے انھیں علمی و عملی تجربے حاصل ہوں۔

امسال فروری کی ابتدائی تاریخوں میں اس سفر کا آغاز ہوا، بیس طلبہ ساتھ تھے۔ اس قافلہ کی پہلی منزل آگرہ میں ہوئی۔ اب گو اکبر آباد اور سیکری کا پچھلا جاہ و جلال ایک قصۂ ماضی بن چکا ہے اور بابر و اکبر اور جہانگیر و شاہجہاں کی پرشکوہ داستانیں صرف تاریخ کے اوراق کی زینت ہیں۔ لیکن بزرگوں کے آثار اب بھی عظمت ماضی کے ترجمان ہیں، تاج کے مرمری گنبد، قلعہ کے فلک بوس اور پرشوکت ایوان و قصور اعتماد الدولہ کے دلفریب نقش و نگار اور سکندرہ کے پرشکوہ اور دل افروز مناظر نے تھوڑی دیر کے لئے زمان و مکان کی حدبندیاں ختم کر دیں اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ زمانہ دو تین سو برس پیچھے ہٹ گیا ہے اور ہم مغلوں کے شاندار دور میں چل پھر رہے ہیں، کہیں بابر چند ہزار جاں نثاروں کے ساتھ رانا سانگا کی دل بادل فوجوں کے سامنے کھڑا نصرت ایزدی کا تماشا دیکھ رہا ہے، شراب کے پیالے ٹوٹے جا رہے ہیں، توبہ کا عہد دلوں میں ہمت پیدا کر رہا ہے۔

کہیں راجپوت سردار اکبر کے جلو میں چل رہے ہیں اور راجگان ہند سے قرابت کے رشتے قائم ہو رہے ہیں۔ کہیں جہانگیر کے عدل و انصاف کے چرچے ہیں، زنجیر عدل کھل گئی، بازاروں سے فلک نما ہی ہے۔ اور بیکس ولاچار، مظلوم و ستم رسیدہ براہ راست بادشاہ کے حضور میں عرض و معروض کر رہے ہیں کہیں شاہجہاں تخت طاؤس پر جلوہ افروز ہے اور لاجواب و بےمثال عمارتوں کے نقشے پیش ہو رہے ہیں۔ کسی جگہ ابوالفضل و فیضی کے محل نظر آ رہے ہیں جہاں علم و حکمت اور سیاست و تدبیر کے رموز حل ہو رہے ہیں۔ کہیں عالمگیری جاہ و جلال اور سطوت و جبروت کے مناظر نظر آ رہے ہیں، باطل کے نقش مٹ رہے ہیں اور قرون اولیٰ کی یاد تازہ ہو رہی ہے۔

کچھ دیر تک ہم خیالات کی اس دنیا میں گم رہے۔ دفعتہ رفتہ ماضی کے پرشکوہ جلوے نگاہوں سے اوجھل ہوئے اور حال کا دردناک اور یاس انگیز مرقع سامنے آیا، دل میں ٹھیس لگی، آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور بے اختیار زبان سے نکل گیا۔ ؎

ایک وہ تھے کہ جہانگیر و جہاندار زمن　　ایک ہم ہیں کہ غلام اور غلامی پہ نثار

آگرہ سے چل کر ہمارا قافلہ کچھ دیر کے لئے علی گڑھ ٹھیرا، اور وہاں سے دہلی پہونچا، دہلی کا چپہ چپہ ایک جہان عبرت ہے، ہزاروں برس کی تاریخ سطح پر بکھری پڑی ہے کہ اگر کوئی آنکھیں بند کر کے گذرنا چاہے تو ناممکن ہے۔ شکستہ قلعے، منہدم محل، سنسان مقبرے، اور ویران کھنڈر قدم قدم پر دنیا کی بے ثباتی اور زمانے کے انقلاب کی داستان سنا رہے ہیں کہ ؎

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو　　میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

دہلی کے آثار قدیمہ ویسے تو سبھی کے لئے باعث عبرت ہیں، لیکن مسلمانوں کے لئے یہ شکستہ آثار سامان نوحہ و ماتم بھی ہیں۔ اللہ اکبر کہاں اسلاف کی یہ ہمت کہ مٹھی بھر آدمی ایک لق و دق

ملک میں قدم رکھتے ہیں اور گنتی کے چند برسوں میں مالک تاج و اورنگ ہو جاتے ہیں اور کہاں اخلاف کا یہ حال کہ ہر کہ و مہ کے سامنے لرزہ براندام۔ ایک وہ تھے کہ صرف اٹھارہ سواروں سے صوبے کے صوبے فتح کر ڈالتے تھے اور ایک ہم ہیں کہ نوکر رہ کر بھی مستقل سو ہراساں اور ہجرت پر آمادہ،

دہلی کے اس قیام میں آثار قدیمہ کے علاوہ مختلف تعلیمی اداروں اور علمی مرکزوں کی زیارت کا بھی موقع ملا۔ اس سلسلہ میں جامعہ ملیہ، مدرسۂ فتحپوری، دار الحدیث رحمانیہ اور ندوۃ المصنفین خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ جامعہ میں پروفیسر محمدؐ مجیب اور مولانا اسعد الدین ندوی کی عنایت سے مختلف تعلیمی اور تربیتی شعبوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ شام کو ایک فٹ بال میچ ہوا لیکن نتیجہ برابر رہا۔ رحمانیہ اور فتحپوری میں مدرسہ کے عام مشاہدہ کے علاوہ مولانا عبید اللہ اور مولانا اشفاق الرحمٰن کی عنایت سے درس حدیث میں بھی شرکت کا موقع ملا۔

دہلی کے اس سفر میں جناب مولانا محمدؐ الیاس کی خدمت میں بھی حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا بڑے خلق و محبت سے ملے اور دیر تک ہم لوگوں کو استفادہ کا موقع دیا۔ اس سلسلہ میں مولانا کے صاحبزادے مولوی محمدؐ یوسف سے بھی ملاقات ہوئی۔ آجکل امام طحاوی کی شرح معانی الآثار کی شرح لکھ رہے ہیں، کئی سو صفحوں کا مسودہ تیار ہو چکا ہے۔ موصوف نے از راہ عنایت جا بجا سے کتاب کے مختلف حصے پڑھ کر سنائے۔

دہلی سے ہم لوگ لاہور پہونچے اور مولانا احمدؐ علی امیر انجمن خدام الدین کی عنایت سے مدرسۂ قاسم العلوم میں قیام ہوا۔ لاہور میں ہمارا یہ پہلا اتفاق تھا لیکن مولانا سید محمدؐ طلحہ، شیخ محمدؐ العربی، برادر عزیز مولوی احمدؐ الحسنی، اور عزیزی محمدؐ ثانی کی بدولت زیادہ اجنبیت محسوس نہیں

ہونے پائی۔ احمد صاحب کی صحت ان دنوں کچھ خراب تھی، آنکھوں کے سلسلہ میں ابھی آپریشن ہو چکا تھا، اور ہنوز علاج کا سلسلہ جاری تھا، لیکن یہ کوئی چیز بھی انکی محبت کی راہ میں حائل نہ ہو سکی۔ شب و روز کا اکثر حصہ ہمارے ساتھ گذرتا، ضعف و نقاہت کے باوجود میلوں سفر کرتے مگر کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتے بلکہ اور اُلٹے معذرت کرتے۔ شیخ عربی اور مولانا طلحہ نے بیحد مشغولیت کے باوجود یہی نہیں کہ ہمارے ساتھ کافی وقت صرف فرمایا بلکہ اس قافلہ کو اپنی مہمانی کا شرف بھی بخشا،

لاہور کے آثار قدیمہ میں جامع مسجد، قلعہ، جہانگیر و نورجہان کے مقبرے اور شالامار باغ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یوں تو سکھ شاہی کے اثرات ہر جگہ نمایاں ہیں، لیکن جامع مسجد، قلعہ اور نورجہاں کے مقبرہ کو دیکھکر تعصب و بدمذاقی کی ایک عجیب تصویر نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے، خدا معلوم اس عہد کے مسلمانوں نے اس ذلت کو کیونکر انگیز کیا۔ ان تاریخی عمارتوں کے علاوہ لاہور کا میوزیم بھی قابل دید ہے۔ یہاں ہمیں قدیم تاریخ ہند کا اچھا سامان نظر آیا، پتھر کے زمانہ سے بدھ کے دور تک بہت سا قیمتی سامان موجود ہے جس کی مدد سے تاریخ کے ٹوٹے ہوئے رشتے جوڑے جاسکتے ہیں، پروفیسر محمود شیرانی کی عنایت سے عہد ساسانی اور عہد اسلامی کے قدیم سکوں کی زیارت ہوئی۔ خسرو کے سکوں، عہد فاروقی کے بسم اللہی سکوں اور بنی اُمیہ کے ابتدائی درہم و دینار سے لے کر ہندوستان کے آخری مغل بادشاہ ابوظفر بہادر شاہ کے زمانہ تک کے ہزاروں سکے دیکھے جنمیں عالمگیر کا درم شرعی اور محمد تغلق کا تانبے کا سکہ بھی تھا۔ مولانا سید طلحہ کی عنایت سے لاہور کی رصدگاہ بھی دیکھنے کا موقع ملا، گو آسمان پورے طور پر صاف نہ تھا تاہم مشتری اور زحل دُوربین سے بخوبی دیکھے گئے۔

لاہور سے واپسی میں دیوبند، سہارنپور اور رامپور کے دیکھنے کا موقع ملا دیوبند میں یہ ہمارا پہلا اتفاق تھا، لیکن دارالعلوم کے بزرگوں اور دوستوں کی عنایت سے ذرا بھی

اجنبیت محسوس نہیں ہونے پائی۔ ناشکری ہوگی اگر جناب مولانا حسین احمد صاحب مولانا شبیر احمد صاحب مولانا محمد طیب صاحب مولانا اعزاز علی صاحب مولانا محمد ابراہیم صاحب اور مولانا سلطان الحق صاحب کی عنایتوں اور کرم فرمائیوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ یہ حضرات اس محبت و خلوص اور عنایت و مہربانی سے پیش آئے کہ ہم لوگوں کو مسافرت میں گھر کا مزہ آیا۔ مولوی محمد سعید نے اپنا قیمتی وقت صرف کرکے گوشہ گوشہ کی سیر کرائی۔ برادرم عبدالستار ملتانی مولوی منور حسین، مولوی عبدالرزاق، مولوی عبدالسمیع مولوی عبدالشکور اور مولوی عبدالوالی ہر وقت ہمارے ساتھ رہے اور خود تکلیف اٹھا کر ہمیں آرام پہونچایا۔ طلبہ نے ادب و حدیث کے اسباق میں شرکت کی اور کئی گھنٹہ تک دورہ میں حدیث کے علمی مباحث کی سماعت کی۔

سہارنپور میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب اور مولانا محمد اسعد اللہ صاحب کی عنایت سے مظاہر العلوم میں قیام رہا۔ مدرسہ کے طلبا، اساتذہ اور کارکنوں کی دینداری، سادگی اور اخلاص وللہیت کا خاص اثر پڑا، ہم لوگوں کا قیام اتنا مختصر تھا کہ اسباق میں شرکت کا موقع نہیں ملا، لیکن شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی عنایت سے شب میں طلبہ کو استفادہ کا موقع مل گیا۔ اور کئی گھنٹہ تک حدیث و رجال کے اہم مباحث پر گفتگو ہوتی رہی۔ سہارنپور میں مولانا منظور النبیؒ صاحب ندوی سے بھی ملاقات ہوئی، مولانا بڑی محبت سے ملے اور باصرار ندوہ کے اس قافلہ کو اپنے یہاں مدعو کیا۔

سہارنپور سے روانہ ہوکر ہم لوگ رام پور پہونچے، اسٹیشن پر قاری محمد اسمٰعیل صاحب مجددی موجود تھے انکی رہنمائی میں ہم لوگ شہر پہونچے۔ قاری صاحب اور مولانا عبدالودود ندوی پرنسپل مدرسۂ عالیہ نے قلعہ اور کتبخانہ میں داخلہ کی اجازت حاصل کر لی تھی، لیکن افسوس کہ وقت کی تنگی کی بنا پر کتبخانہ پورے طور پر نہ دیکھا جا سکا۔ شب میں مولانا عبدالودود صاحب نے ایک پرتکلف دعوت دی اور ہم لوگ لکھنؤ روانہ ہوگئے۔

میری محسن کتابیں

از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

خاکسار کا خاندان چند پشتوں سے مولویوں کا خاندان ہے، میرے جد امجد مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم صوبہ بہار کے مشہور معقولی مدرس تھے، دادا مرحوم تو نہیں لیکن میرے عم مغفور مولانا حکیم حافظ سید ابوالنصر گیلانی درس نظامیہ کے عالم تھے، درس و تدریس کا مشغلہ تو ان کا کم تھا لیکن مطالعہ میں مسلسل منہمک رہتے تھے، اس زمانہ کے عام مولویوں کے اعتبار سے ان کے مطالعہ کا دائرہ وسیع تھا، عربی، فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کی علمی کتابوں کا پڑھ لینا اپنی کسر شان نہیں سمجھتے تھے، اس لئے مولانا شبلی، سر سید، حالی، ڈپٹی نذیر احمد، وغیرہ جیسے لوگوں کی کتابوں تک کا مطالعہ بہ شوق کرتے تھے، اگرچہ ان لوگوں کے مستغربانہ میلانات سے متفق نہیں تھے، میں نے ان ہی کے آغوش تربیت میں آنکھیں کھولیں، چونکہ خود لاولد تھے، اس لئے بجائے بیٹے کے مجھے مانتے اور چاہتے تھے، تین ہی سال کی عمر میں جب الفاظ کے تلفظ پر زبان کو نہ قادر ہو چکی تھی، سینکڑوں فارسی کے الفاظ مجھے یاد کرا دئے تھے، یہ واقعہ ہے کہ ایک زمانہ تک کتے کو "سگ" کے سوا میں نہیں جانتا تھا کہ کچھ اور بھی کہتے ہیں بعض دفعہ گھر کی عورتوں کو میری اس فارسی دانی سے کافی مشقت میں مبتلا ہونا پڑا[1]، اسی زمانہ میں دادا مرحوم کے ایک پنجابی شاگرد ملا عبد اللہ مرحوم میرے گاؤں میں توطن پذیر ہو گئے تھے، اور مختلف مؤثرات کے تحت دہلی جا کر مولانا نذیر حسین مرحوم کے حلقہ میں پہونچ کر حنفی مسلک کو چھوڑ کر عمل بالحدیث

---

[1] اپنی ننھیال موضع استھانواں میں تھا، عورتیں کسی تقریب میں باہر گئی ہوئی تھیں، اکیلا میں ہی گھر میں تھا، یا اور کوئی کھلائی بھی ہو بہرحال میں نے باورچی خانہ میں کتے کو کھاتے دیکھا، عورتیں جب آ گئیں تو میں نے اپنی نانی صاحبہ کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا "سگ آیا تھا بھات کھا گیا" وہ بیچاری حیران کہ ساگ بھات کو کھا گیا کیا مطلب ہے، والدہ مرحومہ میری اصطلاحوں سے واقف تھیں، جب وہ آئیں تب مسئلہ حل ہوا۔ ۱۲

یا غیر مقلدیت کا مسلک اختیار کر لیا تھا، چچا مرحوم سخت غالی حنفی تھے، ملا عبداللہ سے حالانکہ انھوں نے
کچھ پڑھا بھی تھا لیکن تقلید و غیر مقلدیت کی بحث میں الجھ کر دونوں میں مختلف کلی اور جزئی مسائل کے
متعلق رات دن مباحث کا بازار گرم رہتا تھا خصوصاً طلاق ثلثہ مجلس واحد مغلظہ ہے، یا نہیں اس مشہور
نزاع میں تو رسالہ بازی بلکہ کی نوبت آئی، طرفین سے متعدد رسالے تھوڑے تھوڑے وقفہ سے شائع
ہوتے رہتے تھے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا اور چچا مرحوم ہی سے مکتبی تعلیم کا آغاز ہوا، تو میرا علمی ماحول
یہی تھا، ابن حجر ابن قیم ابن تیمیہ شوکانی ان باتوں کی بار بار تکرار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم ان ہی
لوگوں میں پیدا ہوئے ہیں، اور جب ان لوگوں کی یہ حالت تھی۔ تو پھر بخاری مسلم امام ابوحنیفہ ابو یوسف
ابوہریرہ ابن عمر کے متعلق اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کیا حال ہوگا، اس مکتبی دور میں مجھ پر سب سے زیادہ کس
کتاب کا اثر پڑا، عجیب ہے، فطرتاً میں سخت بدشوق بچوں میں شمار ہوتا تھا چچا مرحوم نے مار مار کے مری کھال
تک بعض دفعہ ادھیڑ دی لیکن پڑھنے کی چوری سے کبھی باز نہ آتا تھا، اتفاقاً ایک اردو کی کتاب جس کے
ابتدائی صفحات غائب تھے کہیں گھر میں مل گئی، یہ کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ تھا، اب بھی نہیں معلوم کہ اس
کا نام کیا تھا، لیکن اس کا اثر اب تک تازہ ہے۔ قصہ کی کتاب تھی، پورا قصہ تو اب یاد نہیں رہا اتنا یاد
رہ گیا ہے کہ ایک پادری اپنے باغ میں رہتا تھا بچوں کو کچھ پڑھاتا بھی تھا اور نجاری وغیرہ جیسی بعض
صنعتیں بھی سکھاتا تھا، طلبہ کو اپنے باغ کے میوے رس بھری وغیرہ کھلاتا تھا، بچوں میں ہری اور ٹامی دو
خاص کیرکٹر کے لڑکے تھے، ان میں ہری سعادت کا اور ٹومی شقاوت کا نمونہ تھا، ہری کے جو حالات اس
کتاب میں درج تھے ان سے غیر شعوری طور پر میرا دل متاثر ہوا۔ اور اس کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا گیا تھا
ایسا محسوس ہوا کہ کاش ایسی زندگی مجھے بھی میسر آتی، اور اب مجھ میں کچھ پڑھنے کا شوق گدگدی لینے لگا
لیکن چچا مرحوم کی بدگمانیوں کا شکار تھا، پٹائی کا سلسلہ مسلسل جاری تھا، اور اب اس کے بعد میرے لئے
یہ مار دھاڑ بجائے نفع کے باعث نقصان بنتی چلی جارہی تھی اسی عرصہ میں چند دوستوں نے مجھے داستان

امیر حمزہ دکھائی، اسکی دلچسپیوں نے مجھے ہوش رُبا کے طلسم میں گرفتار کر دیا مجھ پر تو جو گذرنی تھی گذر گئی، لیکن عبرۃ لاولی الابصار میں ان نتائج کا اظہار ثواب سمجھتا ہوں جو اس طلسم میں گرفتاری کے بعد مجھ پر طاری ہوئے میری عمر اس وقت غالباً دس گیارہ سال کی ہوگی، جب اس مرض میں گرفتار ہوا، گاؤں کے ایک رئیس بابو ظہور محسن مرحوم کو بھی قصہ کہانیوں کی کتابوں سے حد استغراق تک دلچسپی تھی، میری بدقسمتی تھی کہ انھوں نے نول کشور پریس کے ان سارے خرافات کو جن کا داستان امیر حمزہ سے تعلق ہے، منگوا لیا تھا، کوچک باختر بالا باختر، ہفت پیکر، نورافشاں، ایرج نامہ، اور خدا جانے کیا کیا اب تو سب کے نام بھی یاد نہیں، ہر ایک کتاب تک میری رسائی باسانی ہورہی تھی، متعلقہ مکتبی اسباق سب بالائے طاق ہوگئے، صرف ان ہی داستانوں میں غرق ہوگیا، چچا صاحب کو میرے اس انہماک کا احساس ہوا، کچھ نگرانی کرنے لگے، یہ واقعہ ہے کہ بیت الخلا میں کتاب کو چھپا کر رکھ آتا، اور پھر قضائے ضرورت کے حیلہ سے اسی بدبوکدہ میں بیٹھا ان کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا، رات رات بھر میں نے مدتوں یوں گذاری کہ صبح ہوگئی، اور میں ہوں میری یہ داستان ہے، خیر یہ تو چنداں مضرات نہ تھی اس سے زیادہ اس کتاب نے ہم پر حملہ کیا، اور طبیعت ان واقعات کی نقل اپنی زندگی میں اتارنے کی کوشش کرنے لگی، جن سے یہ کتاب مملو ہے، کیا کیا لکھوں کہ پھر اس راہ میں مجھ پر کیا گذری، مدعا یہ ہے کہ عیاری جو اس کتاب کا ایک مخصوص حصہ ہے، اور مکروفریب، دھوکہ، چالاکی بھی اس کا اعلا حصہ ہے، میں نے مدتوں بطور فضائل کے خود اسکی مشق کی، اور اپنے ہمجولیوں میں جو غریب اس کتاب سے ناواقف تھے ان کا امام بن کر مختلف طریقوں سے ان عیاریوں کی عملی مشق میں مصروف ہوگیا، وہ تو خدا کا فضل ہوا کہ پرواز بہ مقدار عمر تھی، گاؤں کے باغ اور کھیت میری اور میرے شاگردوں کی عیاریوں کی جولانگاہ تھے، غریب رکھوالوں کو طرح طرح سے ستایا کرتا، اور ان کی چیزوں کو برباد کرکے خوش ہوتا کہ عیاری خوب کامیاب رہی، ابھی شباب اور شبابیات سے بیگانہ تھا، اگرچہ تبدریج اُن کے آثار چپکے چپکے ابھر رہے تھے، اور شاید میری بربادی یقینی تھی، اگر ٹھیک عنفوانِ شباب ہی میں قدرت مجھے اپنے دیہاتی ساتھیوں سے الگ نہ کر لیتی، پہلے

انگریزی تعلیم کا چرچا تو خیال تھا، سعاگل پور اسکول میں نام لکھانے کے لئے بھیجا بھی گیا، انگریزی کی ابتدائی ایک دو کتابیں دیہات ہی میں ختم ہو چکی تھیں لیکن کسی لطیفۂ غیبی نے میری رفاقت کی ایسے قدرتی واقع پیش آئے کہ یکایک میری تعلیم کا پروگرام بدل گیا۔ اچانک اس طلسمی قید سے نکل کر قدرت نے مجھے بہار سے سیکڑوں میل دور راجپوتانہ کے ریگستانوں میں پہونچا دیا، یعنی ریاست ٹونک کے مشہور منطقی و معقولی عالم حضرت مولانا برکات احمد بہاری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رشتہ داری کے تعلق سے چچا مرحوم نے پہونچا دیا، کچھ میں نہیں کہہ سکتا کہ کن نامعلوم اسباب کے تحت ماحول کے اس انقلاب نے میرے دل و دماغ کو بدل دیا، ہوش ربا کی داستان کا قصہ ختم ہو گیا، جو جادو اس کتاب نے مجھ پر چلایا تھا، اس کے اثر سے خود بخود شفایاب ہو گیا اب میرا شمار مولانا مرحوم کے شوقین محنتی ذہین طلبہ میں ہونے لگا، حالانکہ چچا مرحوم کے زد و کوب نے مجھے یقین دلا دیا تھا میں سخت کوڑھ مغز واقع ہوا ہوں۔ ورنہ صبح و شام اتنی مار کیوں کھاتا، اس سلسلہ میں داستان امیر حمزہ کے عیبوں کے ساتھ اس کے ایک ہنر کا بھی ذکر نہ کرنا ناشکری بھی اور رشاید کو نہ حق پوشی بھی ہو گی، داستان کے اس طویل سلسلہ کا اگر تجزیہ کیا جائے تو کل تین اجزاء پر ساری کتابیں مشتمل نظر آئیں گی، (۱) ایک تو وہی عمرو عیار اور ان کے تلامذہ کے عیارانہ کرتب (۲) امیر حمزہ اور ان کے احفاد و اولاد در اولاد بلکہ عیاروں کے حسن و عشق کے افسانے (۳) فرضی کفار کے مقابلہ میں فرضی مسلمانوں کا فاتحانہ استیلاء، جیسا کہ میں نے عرض کیا، کہ پہلے جز کے ساحرانہ نتائج کا تو میں شکار ہی ہو گیا خود بھی ہوا اور اپنے ساتھ کتنوں کو اس فتراک کا نخچیر بنایا، خود تو خیر کمسنی کی وجہ سے صرف باغوں اور کھیتوں تک محدود رہا لیکن میرے ایک ہمجولی میاں معین الدین عرف منا جو گیلان ہی میں میرے بعد کچھ دن رہے، اور اب تقریباً بیس پچیس سال سے مفقود الخبر ہیں، بعضوں سے معلوم ہوا کہ ڈھاکہ کے علاقہ میں پہونچ کر ان پر جذب طاری ہو گیا اور اب ان کا شمار اس علاقہ کے مستجاب الدعوات فقراء میں ہے، ان بیچارے کو ٹونک سے واپسی کے بعد پایا کہ گاؤں کی مرغیوں اور بکریوں پر اپنی عیاریوں کی مشق کر رہے ہیں، داستان امیر حمزہ کے شروع میں عمرو عیار کی طرف مرغی پکڑنے کی جو عیاری منسوب کی گئی ہے یہ اسی کی تجلی تھی جو اس بیچارے کے عمل میں آکر جلوہ گر

ہوئی تھی، رہا دوسرا جز تو اس وقت ان واقعات سے متاثر ہونے کی پوری صلاحیت ہی نہیں پیدا ہوئی تھی البتہ تیسرے جز کا اگرچہ بظاہر عملی طور پر مجھ پر کچھ اثر نہ تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ غیر شعوری طور پر میری طبیعت نے اس کا اثر کچھ ضرور جذب کیا تھا، اور کفر کے مقابلہ میں اسلام کے اعتلاء و سربلندی کے جذبہ سے میرا دماغ اگر کبھی خالی نہ رہا تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس میں اس داستان کے اس جز کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہے، اگرچہ اسی زمانہ میں چچا مرحوم کے اصرار سے واقدی کی فتوح الشام و مصر وغیرہ کا بھی میں نے مطالعہ کیا تھا، اور گو آغاز جبراً ہوا تھا لیکن آخر میں چچا مرحوم کی مرضی کے مطابق کسی چیز کو شوق سے کچھ دن میں نے پڑھا تو واقدی کی یہی کتابیں تھیں اور اس جذبہ میں ان کتابوں کی تائید بھی ضرور شریک ہے، یہ بات کہ اردو ادب کے اس طویل سلسلہ کے مطالعہ نے میری ادبی قابلیت پر کچھ اثر ڈالا یا نہیں، میرے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے کہ اس زمانہ میں لکھنے پڑھنے کا مجھ میں کسی قسم کا کوئی سلیقہ پیدا نہیں ہوا تھا، اور تھوڑا بہت اگر تھا تو وہ چچا مرحوم کی جبری تعلیم کا اثر تھا۔

اس ہوش ربائی داستان سرائی میں طوالت سے میں نے قصداً کام لیا ہے، کیونکہ اپنے ان ہی ذاتی تجربات کی بنیاد پر میں ان مسموم ادبی کتابوں اور رسالوں کو نوخیز بچوں اور نوجوانوں کے لئے سم قاتل قرار دیتا ہوں جو حشراتی کیڑوں کی طرح آج آسمان و زمین سے ہر ہر گھر میں برس رہے ہیں، بچوں سے آگے بڑھکر بچیوں تک کی تباہی و بربادی میں بے پناہ طوفانوں کا کام کر رہے ہیں، نسلیں برباد ہو رہی ہیں اور گھرانے اجڑ رہے ہیں، مگر اس شکل میں کہ ان کاغذی سانپوں اور بچھوؤں سے ماں باپ بخوشی اپنے بچوں کو ڈسا رہے ہیں، حکومت مدد کر رہی ہے، قوم کے لیڈر، ایجوکیشن سوسائٹیاں اور خدا جانے کن کن شکلوں سے زہر کے یہ پیالے قوم کے نونہالوں کو بلیغ نقشوں، اور فصیح اسپیچوں کے ذریعہ سے پلا رہے ہیں، فانا للہ وانا الیہ راجعون، کہ تباہی کے اس طوفان کے انسداد کے سارے وسائل ختم ہو چکے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ ہونے والا ہے، وہ ہو کر رہے گا، ما قدر اللہ فسوف یکون، واذا اراد اللہ بقوم سوءً فلا مرد لہ وما لہم من وال،

بہرحال یہ میری جاہلیت کا دور تھا، جو ٹونک پہونچنے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا، اب واقعی علوم و فنون کا شوق

مجھ پر سلط تھا شوق کی یہ حد تھی کہ باوجود مطبوع ہونے کے میں نے شدت ذوق میں منطق کی بعض کتابیں خود اپنے قلم سے لکھ لکھ کر پڑھیں، اور ان ہی دنوں میں السامو جی قلمی پر اپنے استاد کی تقریروں کو اردو میں بطور حاشیہ کے لکھا جاتا تھا، جو اب تک میرے کتب خانہ میں بطور یادگار کے محفوظ ہے، مولنا برکات احمد پر مولنا عبدالحق خیرآبادی کے رشید شاگرد ہونے کی وجہ سے خیرآبادی اسکول کے اثرات غالب تھے، منطق و فلسفہ ان ہی دونوں علوم کا انکے حلقۂ درس میں غلبہ تھا، مجھ پر بھی ان ہی کا تسلط قدرتی طور پر ہونا چاہئے تھا سو ہوا لیکن اسی کے ساتھ چچا مرحوم کی تاکید تھی کہ خطوط میں بعض خاص علمی و ادبی رسائل واخبار کے مطالعہ کی تاکید فرماتے رہتے اور گو برکاتی ماحول اس مذاق سے قطعاً ناآشنا بلکہ مخالف تھا لیکن اس عرصہ میں میرا یہ شغل برابر جاری رہا چچا مرحوم نے اسی وقت سے "الندوہ" کو میرے نام جاری کرا دیا تھا اور اسی بنیاد پر علامہ سید مجھے ندویوں میں شریک فرماتے ہیں، کہ درساً نہ سہی "قلماً" میں ندوہ کا شاگرد رہا ہوں، ایک حیثیت سے سید صاحب کا یہ خیال درست بھی ہے، مولنا برکات احمد کو میری اخبار بینی اور رسائل خوانی کا اگر کبھی علم ہو جاتا تو بہت برہم ہوتے اور فرماتے ان سطحیات کے دیکھنے سے تو اپنی استعداد بگاڑ رہا ہے، لیکن "چندانکہ مرا شیخ ابوالفرج ابن جوزی" کا جو قصہ سعدی نے گلستاں میں لکھا ہے، میرا وہی حال تھا، تین چار سال تک اس عرصہ میں مجھے کسی مصنف یا کسی تصنیف سے کوئی خاص لگاؤ پیدا نہیں ہوا، البتہ جب شرح عقائد شروع ہوئی تو میرے ایک پنجابی ملتانی استاد مولنا محمد اشرف مرحوم نے شرح عقائد کی ایک گمنام شرح کا پتہ دیا، اس کا نام نبراس ہے، اور اب بھی لوگ اس سے ناواقف ہیں، یہ ملتان ہی کے ایک غیر معروف بزرگ مولنا عبدالعزیز کی تصنیف ہے، اور ملتان ہی سے شائع بھی ہوئی ہے کتاب منگائی گئی، واقعہ یہ تھا، کہ اس کتاب میں عام درسی مذاق سے زیادہ مفید چیزیں مجھے ملنے لگیں، اور اس کے مطالعہ میں لذت ملنے لگی، میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ علم کلام کا تعریف کے نظری حصہ سے جو تعلق ہے سب سے پہلے اس کا سراغ مجھے نبراس ہی کے چراغ کی روشنی میں ملا، اس میں کتابی الجھنوں سے زیادہ واقعات سے دماغوں کو قریب کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اسی عرصہ میں جلالین شروع ہوئی، چچا مرحوم نے لکھ بھیجا کہ جلالین کے ساتھ رازی کی تفسیر کا مطالعہ جاری رکھو، تفسیر کبیر نے میری آنکھیں کھول دیں، اور مدرسے کے

عام طلبہ میں حاشیہ و شرح کے دور از کار نکات کے حل کرنے کا جو عام مذاق پایا جاتا تھا، اور میں بھی اسی مذاق میں مبتلا تھا، اس سے رہائی میسر آئی، حاشیہ نگاروں، شرح بازوں کی وقعت نگاہوں میں کم ہونے لگی، امام رازی میرے پہلے رہنما ہیں جنھوں نے بعد میں علم کا صحیح مذاق پیدا کیا، لیکن اس وقت تک صرف دماغی راحت کے سامان کے تلاش میں رہتا تھا، دل و روح کی غذاؤں کا نہ شوق تھا، نہ کسی نے ادھر توجہ دلائی تھی، چچا مرحوم پر بھی مولویانہ مذاق غالب تھا اور گو مفتی برکات احمد پر تصوف کا اچھا خاصہ رنگ تھا، لیکن ان کا درس اس رنگ سے بیگانہ تھا، اس لئے مجھ تک ان کے تصوف کا اثر منتقل نہ ہو رہا تھا کہ اچانک بلقان کی جنگ چھڑی، ندوہ کے ایک عالم نے ٹونک میں چندہ کی تحریک کی، غالباً سید محمد الٰہی بریلوی نام تھا، بیچارے کی طرف کسی نے توجہ نہ کی، متعدد مجمعوں میں ان کا وعظ ہوتا تھا، لیکن صحرا کی صدا بنکر رہ جاتا تھا، مجھے ایک دن کچھ غیرت سی آئی اور افسوس بھی ہوا، اس زمانہ میں الہلال نکل چکا تھا، ٹونک میں سب سے پہلا پرچہ اس کا میں نے ہی منگایا تھا، ایک جماعت کے ساتھ الہلال کے دلدادوں میں تھا، مولانا ابوالکلام کے الفاظ طرز بیان کی نقل اتارنے کی صلاحیت محسوس کرتے ہی اچانک پہلی دفعہ پبلک کے سامنے تقریر کیلئے کھڑا ہو گیا، ٹونک کی تاریخ میں وہ یادگار دن تھا، جامع مسجد بھری ہوئی تھی، "وامتازوا الیوم ایہا المجرمون" کے ساتھ میری کڑکتی ہوئی تقریر کا آغاز ہوا، جو جہاں تھا ٹھہرا کر رہ گیا، کیا کہیے خود نہیں معلوم کہ کیا کہا، پچیس تیس منٹ کے بعد ہوش آیا تو دیکھتا ہوں کہ خود رو رہا ہوں اور ساری مسجد میں کہرام برپا ہے، روپیہ کا ڈھیر میرے قدموں کے سامنے ہے، لوگ واقعۃً کپڑے پھاڑ رہے تھے، بال نوچتے تھے، منہ پر تھپڑ مارتے تھے، ساری مسجد دیوانی ہو رہی تھی، میں خود حیران تھا کہ قصہ کیا ہے؟ اور آجتک اسکی توجیہ میری سمجھ سے خارج ہے، شاید میرے دبے دبائے جذبات یکایک ابھر پڑے یا کیا ہوا، میں تقریر بھی کر سکتا ہوں نہ صرف دوسروں کو بلکہ خود مجھے پہلی دفعہ اس کا علم ہوا، اتفاق سے حضرت الاستاذ ٹونک میں نہیں تھے، رہتے تو روک دیا جاتا، مجھے کھلا میدان ملا، عوام نے مجھے اپنا واعظ بنا لیا، اور اب ہر ہر محلے میں جلسے ہونے لگے، اور مجھے تقریر پر مجبور کیا جانے لگا، دو تین تقریروں تک تو داخلی مواد سے کام لیتا رہا، لیکن اس کے بعد ذخیرہ ختم ہو گیا، بنی ہوئی بات بگڑتی نظر آئی، مجبوراً خیال گزرا کہ وعظ کی

کوئی کتاب دیکھوں خدا کی شان اس راہ میں پہلی نظر امام غزالی کی احیاء العلوم پر پڑی، اب تک جو رازی کو دنیا کا خاتم العلماء سمجھتا تھا، چند ہی ابواب کے بعد میرا حال ہی دوسرا ہو گیا، دوسروں کو وعظ سنانے کے لئے کتاب کھولی تھی، لیکن معاملہ دوسرا ہوا غزالی کی ہر سطر تیر و نشتر کا کام کرنے لگی اور

شد غلامے کہ آب جو آرد   آب جو آمد و غلام ببرد

اور دل جو اب تک گونگا بہرا بنا ہوا سینہ میں سویا ہوا تھا تڑپ اٹھا، میر زاہد سید شریف، ملا باقر، ملا محمود اور آخر میں امام رازی تک نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، اب مجھ پر امام غزالی سوار تھے، وہی دورہ جو طلسم ہوشربا کے مطالعہ میں ابتدائی زندگی میں پڑا تھا، اب عین جوانی میں جب میری عمر انیس۱۹ بیس۲۰ کے درمیان تھی پڑا، اور سخت پڑا، اب تک گیلان کی زندگی جاہلیت معلوم ہوتی تھی، لیکن اب ٹونک کا عہد بھی قریب قریب اسی شکل میں نظر آنے لگا معقولات کا نشہ اتر گیا، زندگی اور تمہ زندگی کے حل کا سودا سر پر سوار ہوا، کچھ دن اس کے بعد جبراً قہراً میں نے ٹونک میں گذارے، نوا جنون میں ایک دفعہ ہر چیز سے الگ ہو کر اجمیر شریف بھاگ گیا، خدا غریق رحمت کرے مولانا معین الدین مرحوم کو میری اس حالت کو دیکھ کر ان کو ترس آیا، اور خاص ترکیبوں سے انہوں نے پھر ٹونک واپس کر دیا، مگر جی نہ لگا، اور دوسرے سال وطن سے بجائے ٹونک کے[1] اس آخری قتل گاہ میں پہونچ گیا، جہاں میری شہادت مقدر تھی یعنی دیوبند پہونچ گیا، دیوبند جس لفظ کو سلفیت کے مرادف خیال کرتا تھا، اب حقیقت کے تلاش میں اسی دیوبند کی طرف

میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

جاننے والے دیوبندی و خیر آبادی کی لاگ ڈانٹ سے واقف ہیں، سینہ پر پتھر رکھ کر اس مدرسہ میں داخل ہوا

---

[1] ٹونک سے رخصت ہوتے ہوئے مولانا برکات احمد کے مدرسہ خلیلیہ کی دیواروں پر کوئلہ سے یہ لکھ کر روانہ ہوا۔

روزگارم بشد بنادانی   من نکردم شما حذر بکنید

میری روانگی کے بعد کسی نے مولانا تک یہ بات پہونچا دی بہت خفا ہوئے ۱۲

خدا جزائے خیر دے غزالیؒ کو امیر ابن سینا و باقر کو اس نے حضرت شیخ الہند کے حلقۂ حدیث میں پہونچادیا
کچھ دن کشمکش میں گزرے، عجب کٹھن دن تھے، آخر میں جنکی غلامی کی سرفرازی نصیب ہوئی، تعجب ہو سنئے گا کہ
تین مہینے تک اسکے مصافحہ سے کراہتہً یا احتیاطاً محروم رہا۔ ایمان و یقین کے الفاظ سے آشنا تھا، لیکن حقیقت
سے بیگانہ، حق تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس دولت کی سعادت میسر آئی۔ ابتک مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ
کے متعلق سنا تھا کہ شعر و خطابت میں اچھے تھے، لیکن ٹوٹی پھوٹی سہارنپوری اردو میں ان کے چند رسائل
نظر سے گذرے، ایسا معلوم ہوا کہ اس زمانے میں جس علم کلام کی حاجت ہے حضرت پر اسی کا الہام ہوا ہے
زبان سے قطع نظر کر کے مطالعہ میں مصروف ہوا، اور اسلام کا ایک جدید نظام سامنے آگیا مولانا کی کتابوں
کے بعد حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت شاہ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات کا بھی مجھ پر اچھا اثر پڑا، اور
قرآن و حدیث کی روشنی میں جو فلسفہ ان بزرگوں نے تیار کیا تھا، اس کا مذاق غالب ہوا، اسی مذاق کے
سلسلہ میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی فتوحات پر بھی نظر پڑی، ایسا معلوم ہوا کہ میری
کھوئی چیزیں سب اسی میں ہیں، حالانکہ اس کتاب کے فقروں پر فقرے میرے لئے ناقابل فہم ہوتے
تھے، مگر میں مطالعہ سے نہیں گھبراتا تھا اور خواہ اُنکی مراد کچھ ہو۔ لیکن میری سمجھ میں اسلامی حقائق سے
متعلق کوئی نہ کوئی بات ضرور آجاتی تھی، اور میری عقلی سیر کی انتہا شیخ اکبر ہی کی کتابیں ہیں۔ مجھ پر
فصوص کا اتنا اثر نہیں ہے جتنا فتوحات کا، اس کتاب کے مطالعہ میں ہر چیز کا سمجھنا میں نے کبھی
مقصود نہیں رکھا، بلکہ جو سمجھ میں آجائے اسی کو مقصود قرار دیا۔ شیخ اکبر کے بعد مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ
کی کتاب طبقات سے اس سلسلہ میں مجھے خاص دلچسپی رہی اور فائدہ پہونچا۔ شیخ اکبر کے متعلق یہ عجیب
بات ہو کہ ان کے خاص موضوع بحث وحدت الوجود سے مجھے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ خیرآبادی اسکول
کے طالب علم ہونے کی وجہ سے تقلیداً اس خیال کو اچھا سمجھتا تھا لیکن خواہ مخواہ سمجھنے کی کوشش نہیں
کرتا تھا بلکہ سچ یہ ہے کہ اندرونی طور پر میرے میلانات اس کے خلاف تھے، اگرچہ اب یہ مسئلہ

میرے لئے بدیہی ہے اور جو بجائے چند وجودوں مثلاً اہرمن ویزداں یا مادہ روح خدائے عالم سرچشمہ ذات واحد کو سمجھتے ہیں اسکی ایک خاص تعبیر وحدت الوجود کو قرار دیتا ہوں، شہود وجود کے اختلافات کو لفظی اختلافات سمجھتا ہوں، بہرحال شیخ اکبر کا معتقد اس مسئلہ کے سوا دوسرے دینی حقائق میں تھا، جیسا کہ میں نے عرض کیا، جس ماحول میں میں نے ہوش سنبھالا تھا اسمیں مقلد و غیر مقلد کی بحث چھڑی ہوئی تھی، اسلئے ایک بالکل تعلق مجھے اسلامی فروع کے اس اختلاف سے بھی کچھ دن رہا۔ مگر بہت جلد شیخ عبدالوہاب شعرانی کی کتابوں خصوصاً میزان الکبریٰ سے طبیعت سنبھل گئی۔ اور مفتی عبداللطیف صاحب رحمانی کی کتاب تذکرۃ العلم سے بھی خیالات میں اصولی ترمیم میسر آئی، نیز دیوبند کے دورۂ حدیث خصوصاً شیخ الہند اور علامہ کشمیری کے درس کا بھی اثر یہی ہوا کہ غیر متعصب حنفی ہو گیا۔ اور بحمداللہ اسوقت تک یہی حال ہے غیر متعصب کا مطلب یہ ہے کہ شافعی، حنفی اختلافات میری نگاہوں میں چنداں نہیں ہے ہر سلسلہ کے بزرگوں کا احترام دینی حیثیت سے کرتا ہوں اور خواہ مخواہ بلا ضرورت فتنہ پردازی کے لئے عوام کے سامنے ان فروعی اختلافات کو چھیڑ کر تفریق بین المسلمین جیسے کبیرہ کے ارتکاب کو مذہبی جرم خیال کرتا ہوں۔ مقلدیت غیر مقلدیت کے سوا اور دوسرے عصری خیالات مثلاً نیچریت یا انکار حدیث والی قرآنیت یا انکار تصوف والی وہابیت، ان چیزوں کا مجھ پر کبھی اثر اسلئے نہیں ہوا کہ حکیم مرحوم کی صحبت ہی میں سارے سوالات سے واقف ہو چکا تھا، اسلئے مجھے صرف جواب سوچنا پڑتا تھا۔ بہتوں کو دیکھتا ہوں کہ یہ سوالات اچانک ان کے سامنے آتے ہیں، ایک مدت سوالات ہی میں بسر کرتے ہیں، پھر توفیق رفیق ہوتی ہے تو جواب تک انکی رسائی ہوتی ہے۔ بحمداللہ سوال کی منزل میری طے شدہ تھی اسلئے جواب تک آسانی رسائی ہوتی رہی۔

دیوبند میں میرا قیام کچھ دن تو طالب العلمی کی حیثیت سے رہا، اور کچھ دن مدرسہ کی ملازمت و خدمت میں گذرے کہ اچانک مقادیر نے مجھے حیدرآباد پہونچا دیا۔ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی قرآن دانی کا شہرہ سن چکا تھا، خدا نے انکی صحبت کی سعادت سے سرفراز فرمایا۔ اور قرآن کے چند جدید

سے پھر مولانا کی صحبت میں کھلے کہ اسی عرصہ میں حیدرآباد کے ایک وکیل جناب ناظم (ایج) ہیں، اور مولانا محمد حسین امم گرامی جو ان کی ملاقات میسر آئی، حضرت کے طفیل میں قرآن مجید کی آیتوں کے استعمال کی ایک نئی راہ معلوم ہوئی، بالآخر تھک تھکا کر اب جبکہ میری عمر انچاس کے قریب ہو طلسم ہوشربا کی داستانوں سے شروع کرکے: ذالک الکتاب لاریب فیہ " کو اپنے مطالعہ کی آخری کتاب قرار دیے ہوئے ہوں، یوں چونکہ مولویت اور مدرسیت میرا پیشہ ہو اسلئے پڑھنے پڑھانے، لکھنے لکھانے کے لئے ہر قسم کی کتابیں دیکھنی پڑتی ہیں، لیکن ذوق مطالعہ و مراقبہ کی تکمیل صرف اسی کتاب سے ہو رہی ہو، اور حق تعالیٰ سے دعا ہو کہ اب اسی پر خاتمہ ہو، غالبا اب اسکے اظہار میں شاید کچھ مضائقہ نہیں کہ اسی قرآنی ذوق میں بحمداللہ قرآن کا ایک بڑا حصہ بڑھاپے میں محفوظ ہو چکا ہو۔ خدا کرے کہ اسی مشغلہ میں عجیب و غریب تجربات والی یہ زندگی ختم ہو۔

ربنا انک تعلم ما نخفی وما نعلن وما یخفی علی اللہ من شیء فی الارض ولا فی السماء انت ولیّ فی الدنیا والآخرۃ توفنی مسلما والحقنی بالصالحین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

ایک لطیفہ۔ کتابوں کے مطالعہ کے سلسلہ میں ایک بات دماغ سے کبھی نہیں نکلتی، بچپن میں جب انگریزی شروع کی اور انگریزی کے حروف تہجی کو پہچاننے لگا تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا، میرے ماسٹر صاحب کے پاس انگریزی کی کوئی موٹی سی کتاب تھی جسے وہ پڑھ رہے تھے پھر کسی ضرورت سے وہ گئے، میں نے کتاب اٹھالی اور دیکھنے لگا چونکہ انگریزی کا ہر حرف دوسرے سے جدا ہوتا ہوا ہے جو میں نے دیکھا تو کتاب کے ہر ورق کی ہر سطر پڑھ رہا ہوں یعنی اسکے حروف پہچان رہا ہوں، میری مسرت کی اس دن انتہا نہ رہی کہ چند ہی دنوں میں انگریزی کی اتنی بڑی کتاب میری سمجھ میں آنے لگی، مگر بہت جلد اپنی غلط فہمی معلوم ہو گئی، لیکن یہ ایسا مغالطہ ہو جو مجھے اکثر اب بھی اسلئے یاد آتا ہے کہ جن چیزوں کے سمجھنے کی اسوقت مسرت حاصل ہو گئیں اسوقت بھی وہی مغالطہ پیش آیا ہو کتابوں کی حد تک ہی نہیں بلکہ زندگی کے تمام حقائق کے متعلق مجھے کبھی کبھی اس قسم کا خواہ مخواہ غرہ ہوتا ہو اور طفلی کا یہ مغالطہ باعث عبرت بنا ہوا ہو خیالات کی ذہن تک بیجر بھول گیا، میری طرح ڈاکٹر اقبال مرحوم اور مولانا محمد علی مرحوم کے بعد ان فاضل مرحومین کے بعض خیالات نے میری مذہبی فہم کی تصحیح میں مدد کی جو اندازہ سے کہیں زیادہ ہوتی اگر ان کا ذکر قصداً ترک کر دیا۔ اسی طرح حضرت تھانوی ظلہ العالی کے بعض اقوال نے بعض اسلامی حقائق کے سمجھنے میں میری بڑی رہنمائی کی ہو، جزاہم اللہ خیر الجزاء، قاضی سلیمان منصورپوری کی کتاب رحمۃ للعالمین کا بھی ممنون ہوں، سیرت طیبہ کے بعض اہم رخ انہیں کے ذریعہ سے میرے سامنے آئے۔ ایک خاص نسبت جس کا اظہار مناسب نہیں ہے انہیں مولانا جامی مرحوم کی غزل سرائیوں کو بڑا دخل ہے۔ قدس اللہ سرہ۔

شیراز ہند پورب

(۲)

از علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

صوبۂ الہ آباد و اودھ یہاں ہم کو صرف صوبۂ الہ آباد اور صوبۂ اودھ سے غرض ہے متنبی کا مشہور مصرع ہے

؎ مصائب قوم عند قوم فوائد

یعنی ایک کی مصیبت دوسرے کی مسرت کا ذریعہ ہوتی ہے جس زمانہ میں خراسان و ایران تاتاریوں کے حملے سے زیر و زبر ہو رہے تھے، ہندوستان میں خلجیوں کا زمانہ تھا۔ ساتویں صدی کے اخیر سال گذر رہے تھے، دو بزرگ ایک صفی الدین جو حضرت امام ابو حنیفہ کی اولاد سے تھے اور دوسرے شمس الدین زادلی اپنے اہل و عیال کیساتھ ہندوستان آئے۔ اور دلی میں سکونت اختیار کی[1] صفی الدین کے پوتے نظام الدین و شمس الدین کے بیٹے شہاب الدین نے علمائے دلی کے سامنے زانوئے ادب تہ کئے اور نامور ہو کر دلی میں ہنگامۂ درس بلند کیا۔ اور شہاب الدین ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے نام سے سربلند ہوئے۔

جونپور دلی بگڑ کر پورب کئی دفعہ آباد ہوا، دو آبادیاں تو آنکھوں کے سامنے ہیں دلی پر جب نادر شاہ درانی و احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کی چڑھائی ہوئی تو کتنے باکمال لکھنؤ اور عظیم آباد کو چلے آئے۔ پھر ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب انگریزوں نے دلی کو تباہ کیا تو پھر دلی بگڑ کر پورب آباد ہوا۔ اسیطرح اس سے پہلے نویں صدی ہجری کے شروع میں جب تیمور نے پنجاب اور دلی کو غارت کیا تو ارباب فن و کمال نے پورب کا رخ کیا اس وقت خوش قسمتی سے پورب میں ایک خود مختار شرقی حکومت کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ شیخ نظام الدین اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے پورب کی سمت حرکت کی اور جونپور آکر رخت اقامت ڈالا۔ بادشاہ وقت نے بیش از بیش قدر دانی کی۔

قاضی شہاب الدین نے شیخ نظام الدین کو اپنی دامادی میں قبول کیا۔ ان سے تین لڑکے ہوئے صفی الدین

---

[1] تاریخ علمائے ہند ص ۹۶

فخرالدین اور رضی الدین تینوں نے اپنے نانا کے درس وکمال سے فیض پایا۔ شیخ صفی الدین نے درس وافادہ کا بازار گرم کیا اور عربی صرف ونحو کی مشہور ابتدائی فارسی کتاب دستور المبتدی انھیں کی تصنیف ہے۔ شیخ صفی الدین اس زمانہ میں ردولی جاکر سید اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی سے جو ان دنوں وہاں مقیم تھے مرید ہوئے۔ شیخ رضی الدین ردولی کے قاضی مقرر تھے۔ ان بھائیوں کی اولادوں نے ردولی ہی میں سکونت اختیار کی جن کے سلسلے میں ابتک نعمانی شیوخ کی آبادی اس قصبہ میں قائم ہے۔ شیخ صفی الدین نے ۸۱۹ھ میں وفات پائی شیخ صفی الدین کے دو بیٹے تھے۔ ایک ابوالمکارم اسماعیل المتوفی ۸۶۰ھ یہ وہی ہیں جن کے لئے صفی نے دستور المبتدی لکھی اور انھیں کے بیٹے مشہور بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے جونپور کو اپنی فیوض وبرکات کا مرکز بنایا۔ اور یہیں ۸۴۹ھ میں وفات پاکر سلطان ابراہیم شرقی کی جامع مسجد میں جس کا نام مسجد اٹالہ ہے دفن ہوئے

یہ پورب کی سرزمین میں علم کی پہلی کاشت تھی۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی یہ پودا دلی سے لائے تھے دلی میں انھوں نے مولانا خواجگی اور قاضی عبدالمقتدر شریحی کندی سے جن کا عربی قصیدہ لامیہ مشہور یادگار ہے تحصیل علم کی جونپور کی مسند پر جب آکر وہ بیٹھے تو ان کے فیض وکمال سے مشرق کی ساری سرزمین لہلہا اٹھی کڑہ سے لیکر غازی پور تک یکساں یہ فیض جاری ہوا۔

اودھ صوبہ اودھ کا پرانا مرکز تو اجودھیا تھا۔ اجودھیا کے پاس ہی ایک گاؤں تھا جو بعد کو فیض آباد مشہور ہوا حضرت شاہ ابوالعباس المتوفی ۸۰۳ھ اور شیخ بہاؤالدین اکبر المتوفی ۸۸۰ھ شیخ سراج الدین چشتی المتوفی ۸۹۹ھ وغیرہ بہت سے بزرگ یہاں آرام کررہے ہیں اودھ کی نوابی کے زمانہ میں نواب شجاع الدولہ نے اس کو اس صوبہ کا دارالسلطنت بنایا ۱۱۹۴ھ میں نواب آصف الدولہ المتوفی ۱۲۱۲ھ کے عہد میں سلطنت کا مرکز فیض آباد سے لکھنؤ کو منتقل ہوا مگر لکھنؤ کی علمی مرکزیت اس سے صدیوں پہلے قائم ہوچکی تھی

لکھنؤ لکھنؤ پہلے گومتی کے کنارے ایک گاؤں تھا چونکہ قنوج اور جونپور کے بیچ میں وہ ایک منزل تھی اس لئے

رفتہ رفتہ اوسکی آبادی بڑھنے لگی۔ تاریخوں میں سب سے پہلے اس کا نام میری تلاش میں تیمور کے حملے کے بعد [illegible]ھ میں ملتا ہے تیمور کی واپسی کے بعد جب ملک میں طوائف الملوکی کا دور ہوا۔ اور ظفر خاں نے گجرات میں خواجہ جہاں کے بیٹے مبارک شاہ نے قنوج و اودھ و کٹرہ اور جونپور میں۔ اور خضر خاں نے لاہور و دیبالپور و ملتان میں اپنی اپنی حکومتیں قائم کیں۔ تو ملا اقبال خاں نے دوآبہ میں اپنی ریاست جمانی چاہی مبارک شاہ نے پورب میں اسکے پاؤں جمنے نہ دیے۔ اس سلسلہ میں لکھنؤ کا نام پہلی دفعہ سننے میں آتا ہے۔ فرشتہ میں ہے۔

"ملا اقبال خاں بقنوج رفتہ خواست کہ بہ جونپور و لکھنؤ در آید" (ص ۱۰۹ نولکشور)

اس سے معلوم ہوا کہ جونپور کے بعد لکھنؤ کی مرکزیت اس زمانہ میں توجہ کے قابل ہو چکی تھی۔ اسلام کی بہت سی آبادیاں ان نفوس قدسیہ کی یادگار ہیں جو آبادیوں سے دور ویرانوں اور سنسان میدانوں کی تلاش میں رہتے تھے لکھنؤ کی ابتدائی اسلامی آبادی کا سراغ بھی اسی اثر کا پتہ دیتا ہے۔

مخدوم جہانیاں سید جلال الدین بخاری جو سلاطین تغلق کے زمانے میں تھے۔ اور جنھوں نے ۷۸۵ھ میں وفات پائی ہے۔ ان کے مرید و خلیفہ شیخ قوام الدین تھے۔ محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ مقبرہ او در لکھنؤ است بزار و یتبرک بلو" سنہ ۸۴۰ھ میں وفات پائی۔ ان کے مرید و خلیفہ شیخ سارنگ تھے جنھوں نے ۸۵۵ھ میں رحلت کی۔ ان دونوں بزرگوں کا فیض مخدوم شیخ مینا ہیں۔ جن کا مزار لکھنؤ میں (موجودہ میڈیکل کالج کے پیچھے) ہے مخدوم شیخ مینا نے سنہ ۸۸۴ھ میں انتقال فرمایا۔

ایک پتہ اس سے پہلے کا بھی چلتا ہے۔ کہتے ہیں کہ سمرقند کے کوئی بزرگ ہندوستان آکر گومتی کے کنارے لکھنؤ میں بسے تھے۔ تاتاریوں کے فتنہ کے زمانہ میں (ساتویں صدی) شیخ ضیاء الدین کرمانی کرمان سے ہندوستان آئے اور شیخ معروف سے ملنے کے لئے وہ لکھنؤ وارد ہوئے۔ اور یہیں کے ہو رہے۔ ان کے پرپوتے شیخ اعظم لکھنوی ہیں۔ جو بڑے عالم ہوئے ہیں جنھوں نے لکھنؤ کو علم و فضل کا مرکز بنایا۔ وہ اس تحفہ کو جونپور سے لائے۔

[illegible]

محمد بن تغلق کے زمانہ میں جو لوگ دلی سے جونپور گئے تھے۔ ان میں سے قاضی عبدالمقتدر دہلوی کے پوتے شیخ ابوالفتح بھی تھے جو اپنے دادا ہی کی طرح مشہور فقیہ و شاعر و مدرس تھے۔ اور قاضی شہاب الدین کے معاصر و ہم استاد تھے ۸۵۴ھ میں وفات پائی۔ ان کے دامن تربیت میں شیخ اعظم پل کر جوان ہوئے۔ اور لکھنؤ میں جا کر مسند درس بچھائی۔ شیخ اعظم کے تلامذہ ملا ضیاء لکھنوی اور شیخ سعد الدین خیرآبادی المتوفی ۹۲۲ھ ہیں۔

لکھنؤ کے مرکز کا ایک اور تیسرا خاندان شیخ سماء الدین لکھنوی کا ہے ان کے صاحبزادے شیخ الاسلام سعد اللہ فراز کندوری ہیں جن ۹۰۲ھ میں وفات پائی! ان کے جانشین ان کے صاحبزادے شیخ امین الدین لکھنوی ہیں۔ اس گھر میں ظاہر و باطن دونوں کے فضل و کمال کی شمعیں روشن تھیں ہمارے کتب خانہ میں شیخ ابن حق کے مکتوبات اور ان کے رسالہ موعظۃ المسترشدین کے نہایت پرانے نسخے ہیں! ان کے دوسرے فرزند شیخ سعد الدین لکھنوی ہیں جنہوں نے ۹۹۰ھ میں وفات پائی تاریخ علمائے ہند کا بیان ہے۔

"تمام بدرس و افادہ علوم دینیہ اشتغال داشت و در مدرسہ وی طلبہ مستعد رجوع می کردند[2]

شیخ امین الدین کے صاحبزادے شیخ حامد تھے جن کے نام مکتوبات میں متعدد خطوط ہیں۔ اس نسخہ کے آخر میں خاندان کے ایک یادگار نے اپنا حسب ذیل نام و نسب لکھا ہے:۔

شیخ الاسلام شیخ پیارہ بن شیخ حامد بن شیخ امین الدین بن شیخ الاسلام شیخ سعد الدین بن
زائر الحرمین الشریفین شیخ سماء الدین بن بندگی حضرت مخدوم قاضی فخر الدین بجلوی (؟)

لکھنؤ کے پاس کسمنڈی ایک چھوٹا سا قصبہ ہے یہاں ایک بزرگ شیخ عبدالقادر بن شیخ سلطان جو مولانا قطب الدین محدث بن مولانا خضر محدث کی اولاد سے تھے پیدا ہوئے۔ انھوں نے لاہور جا کر علم کا فیض حاصل کیا۔ اور لکھنؤ آکر درس و افادہ کی نہر بہائی۔ اور چالیس[3] برس تک یہ روانی جاری رہی لکھنؤ کے اطراف میں انکے ذریعہ بڑا علم پھیلا۔ ان کا

۱؎ منتخب الاخبار ص ۱۹۳ ۲؎ تاریخ علمائے ہند ص ۲۳

۳؎ تاریخ علمائے ہند ص ۵۸

نیلا رہو پر ہندی ہجری کا واقعہ ہے۔ ان کے شاگردوں میں سب سے مشہور نام شاہ پیر محمد صاحب کا ہے جنکی نسبت یہ لکھنؤ میں گومتی کے کنارے شاہ پیر محمد صاحب کا ٹیلہ اور مسجد مشہور ہے۔ سنہ ۱۰۸۵ھ میں وفات پائی۔ ان کا اصل وطن دہنوں کے ضلع کا مشہور قصبہ سندیلہ ہے۔ مگر عمر لکھنؤ میں گذاری۔ اور یہیں دفن ہوئے۔ شاہ پیر محمد صاحب کے شاگرد و خلیفہ شیخ محمد آفاق لکھنوی۔ محمد رضا لکھنوی اور میر محمد شفیع دہلوی ہیں۔ شیخ محمد آفاق لکھنوی دراصل ٹپنہ کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ تقدیر لکھنؤ کھینچ لائی۔ اور اپنے پیر کے پائنتی آسودہ ہیں۔

موجودہ اعظم گڈھ اور غازی پور کے بیچ میں ایک مشہور قصبہ گھوسی ہے جو اس وقت اعظم گڈھ کے ضلع میں ہے یہاں کی خاک سے ایک نامور شیخ عطاء اللہ گھوسی اٹھے۔ ان کے صاحبزادے شیخ غلام نقشبند گھوسی ہوئے میر محمد شفیع بھی شیخ عطاء اللہ کے شاگرد تھے۔ شیخ غلام نقشبند نے پہلے اپنے والد سے پھر میر محمد شفیع سے اور آخر میں سند فراغ شاہ پیر محمد صاحب سے حاصل کیا۔ اور شیخ غلام نقشبند لکھنوی کے نام سے مشہور روزگار ہوئے اور یہ رتبہ پایا کہ بڑے بڑے جلیل القدر علما نے اونکی شاگردی پر ناز کیا۔ اور شاہ عالم بہادر شاہ اونکی ملاقات کا مشتاق ہوا[1] سنہ ۱۱۲۶ھ میں وفات پائی۔ اور لکھنؤ کی خاک میں ہمیشہ کے لئے آرام کیا۔[2]

فرنگی محل | اب آخر میں اس مقدس خانوادہ کا ذکر ہے جو لکھنؤ کے افق پر ایسا چمکا جس کے آگے سارے ستارے ماند پڑ گئے اور نظر آنے لگا کہ لکھنؤ کے علمی مطلع پر انکے سوا کوئی ستارہ کبھی چمکا ہی نہ تھا۔ یہ خاندان اصل میں سہالی میں آباد تھا یہ انصار کرام کا خاندان تھا جس کا ایک حصہ پانی پت میں رہ گیا جس میں مولانا حالی وغیرہ اشخاص پیدا ہوئے اور دوسرا خاندان اودھ آکر سہالی میں آباد ہوا۔ ملا قطب الدین شہید سہالوی اس خاندان کے پہلے نامور ہیں اس خاندان کا علمی سلسلہ بہت دور سے چلتا ہے۔

میر فتح اللہ شیرازی | میر فتح اللہ شیرازی اکبر کے زمانہ میں معقولات کا دفتر لیکر ہندوستان وارد ہوئے اور سنہ ۹۹۰ھ میں اکبر شاہ تک پہونچے اکبر نے بڑی بڑی قدر کی۔ سنہ ۹۹۷ھ میں یہ پھول کشمیر میں ہمیشہ کیلئے مرجھا گیا اور اقبا

---

[1] تاریخ علمائے ہند ص ۱۲   [2] ماثر کرام آزاد ص ۲۱۱

یادِ ایّام

(دورِ فاروقی)

از جناب مولانا ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی ایم، اے انسپکٹر مدارس عربیہ و رجسٹرار امتحانات شرقیہ الہ آباد

خاندان بنی عباس کی ایک شاخ ایک زمانہ سے قصبہ چریاکوٹ ضلع اعظم گڈھ میں مقیم ہے اس خاندان کے چشم و چراغ دو بھائی مولنا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی اور مولنا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی تھے۔ بڑے بھائی کو حکمت و ریاضی سے بیحد دلچسپی تھی گھر کی معقول زمینداری تھی اسی پر بسر اوقات تھی عنفوان جوانی میں گھر سے تلاش علم میں نکل گئے اور پانچ برس تک غائب رہے اب گھر لوٹے تو دولت علم سے مالامال اسطرح یہ کہ کلکتہ میں مدتوں یہودیوں میں رہکر عبرانی میں مہارت پیدا کرلی عہد قدیم کے ہر صحیفہ میں کمال تحاسب سے بڑھ کر یشوع بنی کے صحیفہ جو مخلوط آرامی اور عبرانی ہے جسکی مشکلات ایک یہودی سے پڑھ کر خود مجھے معلوم ہیں اُن کو اس پر عبور رہا۔ اُن کی کتاب بشریٰ جو افسوس ہے کہ شائع نہ ہوئی انکی عبرانی میں مہارت کا ثبوت ہے عربی کی ادب بھی اچھی تھی۔ یہ وہی مولنا عنایت رسول صاحب ہیں جنسے سرسید نے اپنے خطبات احمدیہ اور شروح صحائف میں استفادہ کیا ہے بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کی تعلیم کی۔ ذہن ثاقب طبیعت حاضر استعداد معقول تھی پھر بھائی کی پدرانہ شفقت کمی کیوں رہجاتی کچھ شُدبُد عبرانی بھی جانتے تھے۔ مجھے کچھ بتایا تھا مگر علیگڈھ ہو چکو میں نے خود ڈاکٹر ہاروتز سے جب ایف اے اور بی اے میں عبرانی پڑھی تو معلوم ہوا کہ وہ بہت تھوڑی جانتے تھے بھائی کے علاوہ فرنگی محل کے مولنا سعد اللہ صاحب سے بھی تلمذ تھا بڑے کٹر حنفی تھے وفات سے پہلے غازیپور میں ایک غیر مقلد عیادت کو آئے تو منہ پھیر لیا اور کہا لاحول ولا قوۃ آخر وقت یہ صورت نظر آئی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ شاگرد[1] نے زمانہ طالب علمی میں ایک اسکات المعتدی لکھی اور بڑے ہوکر مصنف سیرۃ النعمان بنے اور نعمانی استاد کا رکھا ہوا لقب عمر بھر اختیار کیا جو اُن کا اور ان کے خاندان کا آجتک سرمایہ ناز ہے۔ ہمارے مولنا کو فارسی میں بھی بڑی مہارت تھی فارسی کی خالق باری

[1] علامہ شبلی نعمانی

بھاکو اور اپنے بیٹے مولوی حسین مرحوم کو پڑھائی تھی مگر چھپی نہیں علاوہ فرماتے تھے کہ میری فارسیت جو کچھ ہے وہ انہیں کی جوتیوں کا طفیل ہے ان سے کہرے مولوی شیخ قانون اور زمینداری خوب سمجھتے تھے وکالت بھی کر چکے تھے۔

مولٰنا کا دار العلوم میں ورود

جس زمانہ کا ذکر ہے اس زمانہ میں مولٰنا مدرسہ احیاء العلوم میں مقیم تھے اس وقت وہ مدرسہ بڑا پر رونق تھا مگر اب نام ہی نام باقی ہے مشاہرہ وہاں بجانے کیا تھا مگر یہاں سے پچھتر روپیہ کا پیام گیا اس وقت کے لحاظ سے یہ مشاہرہ آجکل کے ... کی برابر تھا مولٰنا حفیظ اللہ صاحب مرحوم پاتے تھے مفتی صاحب ... مولٰنا عبد الشکور صاحب ... منشی واجد علی کو ... ہی ملتے تھے غرض سب مراحل طے ہو گئے تو مولٰنا تشریف لے آئے۔

اے آمدنت باعث آبادی ما

قد لنبا تھا اور بھرا بدن تھا چہرہ گول تھا ریش مبارک سفید تھی سر کے بال برابر کٹے ہوئے تھے کہ خفیف سا خیال ہوتا ہے کہ خضاب فرماتے تھے چہرہ پر خشکی زیادہ تھی مگر رنگ صاف لال بسرخی تھا چھوٹی مہری کا غرارے دار پائجامہ پہنتے تھے اور کرتہ لنبا جو قصباتی شرفاء پہنتے ہیں مولوی نہیں مگر انقباض طبیعت کی بنا پر ہمیشہ گریبان کھلا رہتا تھا بند باندھنا طول عمل تھا عمامہ اور عبا بجز مواقع کے نہ استعمال فرماتے سر پر قالب کی گول ٹوپی ہوتی مگر شاید قالب پر چڑھی کم تھی۔ مدرسہ میں جب تشریف لائے تو سفید عمامہ اسی ٹوپی پر باندھے اور ایک سفید عبا کسی نودرے کی پہنے تھے پاؤں میں سلیم شاہی جوتہ تھا ایک مرتبہ کا معائنہ فرمایا اور پھر واپس گئے شام کو عم محترم کی کوٹھی پہ ملنے تشریف لائے تو ہم دونوں بھائی پیش ہوئے اور بس اسی وقت سے تعلیم شروع ہو گئی کیا معنی کہ چند صیغے انہوں نے پہلی ملاقات میں پوچھ لئے نہ بتا پائے انکی تعلیل کر کے خود سمجھا دئے اب ہم ان کے سپرد کر دیئے گئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس مدرس کے پاس ہمارے اسباق ہوتے اس درجہ میں وہ بیٹھکر ہم کو خود پڑھاتے تھے جب ذرا بڑے ہوئے تو پھر مطالعہ بھی سب طلبہ کے ساتھ بیٹھکر دار العلوم جاکر انکی نگرانی میں کرتے تھے نحو میر شروع ہو چکی تھی مولٰنا عبد الشکور صاحب سے پڑھتے تھے ملّا ... تک پڑھی تھی ایک بہاری طالب علم ہمارے ساتھ تھے ان کا نام ولی تھا السنۃ دلی بہار کی تکرار بعد بہت پڑھتے

اور ہم کو لطف آتا تھا۔ مرکب اضافی کی بحث شروع ہوئی تو مشق کے لئے ہماری سلیٹیں چلنے لگیں مرکب توصیفی میں صفت موصوف کا تطابق ایسا مشق ہوگیا تھا کہ آجتک انشا میں یہ غلطی خواب میں بھی نہیں ہوتی اتنی مشق اور موقع کہاں میں تھا انسپکٹری کی بدولت کھو یا گیا۔ حضرت مولٰنا محمد علی صاحب نے انکو اپنا مرکوز ذہنی خوب سمجھا دیا اور وہ لوگ لئے کہ انکی طبیعت کو اُن کا خیال بھاگیا۔ ورنہ ناممکن تھا پھر کیا تھا جو ذہن میں تھا وہ خارج ہونے لگا۔ علم الصیغہ کی پھر سے مشق شروع ہوئی تاج المصادر کے مصادر چھان ڈالے مگر مولویوں کی صرف ونحو اور خاصکر سینوں میں افلاطونی عشق تھا سراپا سے پاک کوئی معشوق تھا شرح ملا تک پڑھ گئے مگر زبان کچھ نہ آئی یعنی ادب سے ناشناس رہے۔ اب اس مشق کے لئے پنجاب میں ایک ابتدائی کتاب منتخبات العربیہ طیار ہوئی تھی ایک حصہ میں جملے اور دوسرے میں چھوٹے چھوٹے قصے تھے وہ شروع کرادی گئی سبق ایک گھنٹہ میں چار جملوں سے زیادہ نہ ہوتا مقصود کتاب کا پڑھانا نہ تھا بلکہ استعداد کا پیدا کرانا تھا سب سے پہلا کام یہ ہوا کہ کلکتہ کی چھپی ہوئی منتہی الارب لاکر رکھدی گئی جسکی ایک ایک جلد ہم کو بھاری معلوم ہوتی تھی اس کا استعمال سکھایا پھر ہر ہر لفظ لغت سے نکلواتے اور ایک بیاض پر لکھواتے اس کے بعد جملہ کی ترتیب اور ترکیب پر غور کراتے پھر اس کے معنی کہلاتے تحلیل صرفی اور ترکیب نحوی کا خیال اور بعد کو یہ اصطلاح اپنے امتحانات کے لئے میں نے بیشؔ برس ہوئے وہیں سے تراشی غرض ابتدا اس طرح مشق ہو کر بنی خدا خدا کرکے چھ ماہ میں منتخبات العربیہ ختم ہوئی اب نحو میر کے بعد اپنی ایک تصنیف منظوم نحو بہ فارسی میں جو ندوہ نے طبع کرائی تھی زبانی یاد کرادی یہ کتاب ہم کو مولٰنا عاشق علی صاحب قبلہ میرٹھی جو اس وقت دار العلوم میں مدرس تھے انھوں نے پڑھائی تھی۔ اب ستم ظریفی سنئے زمخشری کی الکلم النوابغ جس کا بہتوں نے تو نام بھی نہ سنا ہوگا ادب میں شروع ہوگئی مگر ہماری استعداد ایسی تھی کہ ہم کو گراں نہ گزری اب علم الصیغہ اور نحو میر سے آگے بڑھکر زبدہ اور فصول اکبری۔ اور ہدایۃ النحو ہم پڑھنے لگے۔ فصول اکبری میں خاصیت ابواب پر بہت زور دیا گیا وہ اب تک یاد ہیں ایک حد تک مگر خاصیت کا راز جب جرانی کی صرف ونحو پڑھتے تھے تب کھلا کہ زیادتی الفاظ زیادتی معنی پر دلالت کرتی ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ سیبویہ نے یہی بات الکتاب میں کہیں لکھی ہے مگر الکتاب کوئی مولوی پڑھتا ہے ہم لوگوں کی تعلیم قرأت

تجوید کی مشق کے لئے ایک قاری صاحب قاری میران شاہ تھے انسے مشق کرتے تھے مولانا ایسے خفا ہوگئے تھے بھی بڑا ہی مذاق کے آدمی ان کے یہاں سے ہٹا کر مخارج حروف کی بحث یاد کرادی۔

جب منطق کی تعلیم کا وقت آیا تو کبری سے پہلے تعریفات اردو میں مع مثالوں کے لکھائیں ہدایت تو مولانا کی تھی مگر پڑھانے مفتی صاحب تھے اب جو کبری شروع کی تو عام طالب علموں کے مقابلے میں اس کو خوب سمجھا مجموعہ منطق میں کبری کے بعد صرف تہذیب زبانی یاد کی آگے چل کر اسی مصنف کی تہذیب الکلام ایک قلمی نسخے سے زبانی یاد کی تھی مگر تہذیب کے ساتھ ساتھ ہر بیان پر مفتی صاحب مفصل املا کراتے جس سے شرح تہذیب کے لفظی مباحث کے سوا شرح تہذیب سے زیادہ مسائل یاد ہوگئے۔

دارالعلوم میں ایک درجہ ہم سے اوپر بھی تھا جس کو زیادہ تر ہمارے مولنا حفیظ اللہ صاحب پڑھاتے تھے نصاب تو اصلاح شدہ تھا مگر وہ درجہ پڑھا نہیں گئے خراد پر تھا اس لئے مولنا اس کو منہ نہیں لگاتے تھے اور وہ انکے نزدیک مرفوع القلم تھا اب ہم سے نیچے بھی دو درجے اور پیدا ہوگئے تھے۔ سننے حضرت شاہ فضل الرحمان صاحب کے مریدین میں ایک بزرگ رنگ کے تھے ہر وقت عشقیہ اشعار پڑھتے تھے اور بڑے باذاق تھے دارالعلوم کے کھلنے سے پہلے وہ ہمارے یہاں آتے جاتے تھے بھوپال میں ان کا قیام ایک مدت تک رہ چکا تھا ہم انسے بہت مانوس تھے ان کا اسم گرامی شاہ تجمل حسین صاحب ناظرین اس کا واک پن کو معاف کریں گے یاد ایام تو یہی ہے بات میں بات پیدا ہوتی ہے۔ ان کے ایک عزیز ابو حبیب صاحب بھوپال میں طلب علم کرتے تھے وہ زمانہ نواب صدیق حسن خاں صاحب ملک بھوپال کا تھا احناف کو چھوڑ کر شوافع و اہل حدیث علما کا ایک مجمع نواب صاحب کے گرد تھا نواب صاحب علم دوست تھے خود بھی جید عالم تھے اتنے وسیع النظر تھے کہ جوع التصنیف کے مرض میں مبتلا ہوگئے تھے۔ اس دور میں ایک طالب علم وہاں حدیث کی تعلیم سے سیراب ہو کر بیر دروازہ میں خاندان مجددیہ کی خانقاہ میں بھٹک نکلتا ہے شریعت جرامی ہے طریقت سے بیگانگی ہی نہیں بلکہ اکراہ غالب ہے یہ زمانہ میرے پیر مرشد حضرت سیدنا پیرانو احمد صاحب رح کا ہے نواب صاحب سے خوب چل رہی ہے خود مجدد صاحب کی اولاد حضرت شاہ عبدالغنی صاحب اور شاہ

ابوسعید صاحب کے سکھائے و لبند فن دانی اپنی ختم ہو گئی۔ وہ طالب علم شیخ سے بحث کرتا ہے شیخ کو اس غیر مقلد قلب میں استعداد تام نظر آتی ہے وہ گرویدہ ہو جاتا ہے، طالب علم کو دلچسپی ہو جاتی ہو، چند بار حاضر ہوتا ہو گرو ہی ناشناسی ابن تیمیہ شیخ کا باطنی تصرف اپنی طرف کھینچتا ہے چند دنوں میں قدموں پر گڑگڑاتا ہوا آپڑتا ہے اور کہتا ہے نہ جانے میرا کیا حشر ہوگا اسی کا تو انتظار تھا شیخ اپنے آغوش شفقت میں لے لیتا ہے پھر کیا تھا پہلے ہی سے تاک لیا تھا تعلیم و تربیت شروع ہو جاتی مراتب کی تکمیل ہوتی رہی آخر انکو اور صرف انکو اتنی مدت میں خلافت عطا ہوتی ہے اور وہ حکیم شاہ ابوحبیب صاحب ہو جاتے ہیں مجھے اُن سے ملاقات نہ ہونیکا ہمیشہ قلق رہے گا۔ (یہ واقعہ خود پیر و مرشد کا بیان کیا ہوا ہے)

اس تمہید کی غرض یہ ہے کہ شاہ تجمل حسین صاحب کے ایک عزیز اور شاہ ابوحبیب کے پرداختہ ایک طالب العلم پہلے آکر داخل ہوتے ہیں یہ تو کیسے کہدوں کہ مور گرد ماہ آمدہ بود مگر مور را گرد عارض ضرور آمدہ بود ہم سے ایک درجہ نیچے داخل ہوتے ہیں ظاہر میں خاموش تھے مگر چھیڑنے کو دل چاہا خیال ہوا کہ گھر چھٹنے کا ملال ہے اس لئے کچھ دن طبیعت کو روکا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ خاموشی کچھ فطری ہے جو بعد کو علامہ کی بصورت جمود محسوس ہوئی مگر بے تکلفی ہوتے کیا دیر لگتی ہے ہمارے ایک ہم جماعت منشی صدیق حسن مانکپوری فرزند جلیل مرحوم سے تعلقات پیدا ہو گئے اور پھر ہم سے بھی ملاقات اور بے تکلفی ہو گئی۔ عمر بھر ساتھ رہا پڑھتے اور مقابلہ کرتے مگر محبت ایسی تھی کہ مخالف آب و ہوا اور متضاد ماحول میں رہ کر کبھی بھی محبت میں فرق نہ آیا اُن کا جمود ٹوٹ کر حرکت ہوئی اور اس وقت تک گویائی مساعدت کر رہی ہے مگر وہ انکی گویائی انکو مبارک میں نے جوان کا جمود اختیار کیا تو آج پورے تیس برس کے بعد انکی فرمائش پر یہ مہر سکوت ٹوٹی محسن کتابوں پر کیا لکھتا ایک صاحب نے لکھا تو کچھ نہ بتایا انھوں نے خود لکھا تو شرما گئے پوچھئے شرح میں شرم کیا عبدالماجد صاحب بی اے نے سچ بات کہدی اس لئے میں نے یادِ ایام لکھنا شروع کر دیا ہے۔ ۵ برس سے لیکر ۱۰ برس کے سن تک کے حالات ہیں۔

باقی داستان فردائے شب را

حدیث کا ابتدائی تحریری سرمایہ

(۲)

از عبدالسلام قدوائی

موسیٰ ابن عقبہ کا بیان ہے۔

وضع عندنا كريب حمل بعير او عدل بعير من كتب ابن عباس قال فكان علي ابن عبد الله من عباس اذا اراد الكتاب كتب اليه ابعث الي بصحيفة كذا وكذا قال فينسخها فيبعث اليه احداهما۔[1]

کریب نے ہمارے پاس ایک اونٹ کے بار عبداللہ ابن عباس کی کتابیں رکھیں علی ابن عبداللہ ابن عباس جب کوئی کتاب چاہتے تو انھیں لکھ دیتے کہ مجھے فلاں صحیفہ بھیج دو وہ اسے نقل کرتے اور ان میں سے کوئی ایک بھیج دیتے۔

انکی تصانیف انکی زندگی ہی میں دور دور تک پھیل گئی تھیں اس سلسلہ میں امام طحاوی نے خود انکا بیان نقل کیا ہے

عن ابن عباس ان ناسا من اهل الطائف اتوه بصحف من صحفه ليقرءها عليهم فلما اخذها لم ينطلق فقال اني لما ذهب بصري بليت فاقرءوا علي ولا يكن في انفسكم من ذلك حرج فان قراءتكم علي كقراءتي عليكم[2]

عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ طائف کے کچھ لوگ ان کے پاس انکی کتابوں میں سے کچھ کتابیں لیکر آئے تاکہ وہ انھیں پڑھ کر سنا دیں عبداللہ ابن عباسؓ نے دیکھا لیکن جب پڑھ نہ سکے تو فرمایا کہ جب سے میری نگاہ جاتی رہی میں بیکار ہو گیا ہوں تم لوگ خود میرے سامنے پڑھو اس میں کوئی حرج نہ سمجھو میرے سامنے تمہارا پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے کہ میں تمہارے سامنے پڑھوں

تصنیفات کی اس کثرت کو دیکھ کر تعجب نہ ہو حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے آنحضرت کے اعمال و اقوال کے جمع کرنے میں غیر معمولی محنت کی تھی خود ان کا بیان ہے کہ

[1] طبقات جلد ۵ صفحہ ۲۱۶ [2] شرح معانی الآثار جلد ۲ صفحہ ۳۹۲

لما قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانا
شاب قلت لشاب من الانصار یا فلان ھلم
نسال اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نتعلم منہم فانہم کثیر قال العجب لک یا
ابن عباس اتری الناس یحتاجون الیک
وفی الارض من تری من اصحاب رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم قال فترکت ذلک واقبلت
علی المسئلۃ وتتبع اصحاب الرسول صلی اللہ علیہ
وسلم فان کنت لآتی الرجل فی الحدیث
یبلغنی انہ سمعہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم فاجدہ قائلا فاتوسد ردائی علی
بابہ تسفی الریح علی وجھی حتی یخرج فاذا خرج
قال یا ابن عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ما لک قلت حدیث بلغنی عنک انک تحدثہ عن
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاحببت ان
اسمعہ قال فیقول ھلا بعثت الی حتی آتیک
فاقول انا احق ان آتیک فکان الرجل بعد
ذلک یرانی وقد ذھب اصحاب رسول اللہ
صلی اللہ علیہ واحتاج الناس الی فیقول کنت
اعقل منی [1]

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو میں نوجوان
تھا میں نے ایک انصاری نوجوان سے کہا کہ اے صاحب
آئیے ہم لوگ صحابہؓ سے مسائل دریافت کریں اور ان سے سیکھیں۔
کیونکہ وہ بہت کافی تعداد میں موجود ہیں اس شخص نے جواب دیا
اے ابن عباس تم پر سخت تعجب آتا ہے دیکھ رہے ہو دنیا میں
آنحضرتؐ کے کیسے کیسے صحابی موجود ہیں کیا لوگ تمہاری ضرورت
محسوس کرینگے پس یہ سنکر میں نے اسے چھوڑ دیا اور خود صحابہؓ کی
تلاش و جستجو میں نکل کھڑا ہوا اور ان سے مسائل دریافت
کرنے لگا میری حالت یہ تھی کہ مجھے معلوم ہوتا کہ فلاں صاحب
نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سنی ہے میں
ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اگر وہ آرام کرتے ہوتے تو میں
انکے دروازہ پر چادر سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا ہوا کے جھونکے
میرے چہرہ پر لگتے رہتے یہاں تک کہ وہ برآمد ہوتے تو مجھ سے
دریافت کرتے اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برادر عم زاد
خیر تو ہے میں عرض کرتا مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم سے ایک حدیث روایت کرتے ہیں میں نے چاہا کہ میں اسے
سنوں وہ فرماتے مجھے کیوں نہیں بلا بھیجا میں خود آپ کے پاس
آجاتا میں جواب دیتا نہیں میں آپکے پاس آنیکا زیادہ مستحق ہوں اب
اسوقت جب کہ صحابہؓ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور لوگ میرے
محتاج ہیں وہ انصاری نوجوان کہتا ہے کہ آپ مجھ سے زیادہ عقلمند تھے

[1] جامع ص۲۲

حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابی بن کعب کے ساتھ انھیں خاص اختصاص و تقرب حاصل تھا اس لئے انکی روایات بھی عبداللہ بن عباس کے علم میں تھیں[1]

روایت حدیث میں حضرت ابوہریرہ کو خاص امتیاز حاصل ہے آج حدیث کی کتابوں میں انکی بکثرت روایتیں موجود ہیں جنکی تعداد ۵۳۷۴ تک پہنچتی ہے حضرت ابوہریرہ نے حدیثوں کے حفظ و ضبط اور جمع و ترتیب میں غیر معمولی محنت و جانفشانی سے کام لیا اسلام کے بعد عرصہ تک زن و فرزند کے جھمیلے سے الگ اور فکر معاش سے بے پروا ہو کر مسجد نبوی کے چبوترے صفہ پر شبانہ روز حاضر رہتے آنحضرتؐ کی ایک ایک بات سنتے ایک ایک عمل کو دیکھتے اور اسے یاد کرتے خود ان کا بیان ہے۔

ان اصحابی من المہاجرین کانت تشغلہم صفقہم	میرے مہاجر ساتھیوں کو بازار کی خرید و فروخت مشغول رکھتی تھی
بالسوق وان اصحابی من الانصار کانت	اور انصار کھیتی باڑی کے کام میں مصروف رہتے تھے میں ایک مسکین
تشغلہم ارضوہم والقیام علیہا وانی کنت امرأ	آدمی تھا اکثر خدمت نبوی میں حاضر رہتا جب وہ غائب ہوتے
مسکینا وکنت اکثر مجالسۃ رسول اللہ صلی اللہ	تھے تو میں حاضر ہوتا تھا جب وہ بھول جاتے تھے تو میں یاد کرتا
علیہ وسلم احضر اذا غابوا واحفظ اذا نسوا و	تھا ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے حدیث
ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حدثنا یوما فقال	بیان کی پھر فرمایا کہ کون اپنا کپڑا پھیلاتا ہے کہ میں اس میں اپنی
من یبسط ثوبہ حتی افرغ فیہ من حدیثی ثم	حدیث ڈال دوں پھر وہ اسے سمیٹ لے اس کے بعد وہ جو کچھ
یقبضہ الیہ فلا ینسی شیئا سمعہ منی ابدا	مجھ سے سنے گا کبھی فراموش نہ ہوگا چنانچہ میں نے اپنا کپڑا پھیلایا
فبسطت ثوبی او قال نمرتی فحدثنی ثم قبضتہ	آنحضرتؐ نے حدیث بیان فرمائی پھر میں نے اسے سمیٹ لیا خدا
الیّ فواللہ ما کنت نسیت شیئا سمعتہ منہ[3]	کی قسم اسکے بعد میں نے آپ سے جو کچھ سنا کبھی فراموش نہیں ہوا۔

[1] تذکرۃ الحفاظ ذکر حضرت عبداللہ ابن عباس [2] طبقات ابن سعد القسم الثانی من الجزء الرابع ص ۵۶ [3] بخاری کتاب العلم باب حفظ العلم میں بھی یہی بات کسی قدر اختصار کے ساتھ موجود ہے۔

انھوں نے رات کے تین حصے کر دیے تھے ایک میں سوتے ایک میں عبادت کرتے اور ایک حصہ میں حدیثیں یاد کرتے۔ اس طرح احادیث کا ایک بہت بڑا حصہ محفوظ ہو گیا تھا۔ بعد کو انکی زندگی ہی میں یہ روایات کتابی شکل میں جمع ہو گئی تھیں اور دور دور تک پھیل گئی تھیں اس سلسلہ میں چند نسخے ابتک مشہور ہیں۔

ایک نسخہ بشیر ابن نہیک نے مرتب کیا تھا ان کا بیان ہے کہ

کنت اکتب ما اسمع من ابی ھریرۃ[1] میں ابو ہریرہ سے جو کچھ سنتا تھا لکھ لیا کرتا تھا۔

دوسرا مجموعہ حسن ابن عمرو ابن امیہ الضمیری کے پاس تھا[2]

تیسرا مشہور مجموعہ ہمام ابن منبہ کے پاس تھا۔ یہ صحیفہ عرصہ تک موجود رہا۔

امام احمد نے اپنی مسند کی تیسری جلد میں صفحہ ۳۱۲ سے ۳۱۰ تک اس کو شائع کیا ہے[3] بعد کو اصل صحیفہ کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ یہاں تک کہ یہ خیال ہو گیا تھا کہ وہ کہیں ضائع ہو گیا۔ لیکن اب پتہ چلا ہے کہ وہ برلن کے کتب خانہ میں موجود ہے[4] ان مختلف مجموعوں کے علاوہ جو ان کے شاگردوں نے مرتب کئے تھے۔ خود حضرت ابو ہریرہ نے بھی ایک مجموعہ مرتب کر کے اپنے پاس رکھا تھا۔ اور کبھی کبھی لوگوں کو دکھاتے تھے[5]

مکثرین صحابہ میں حضرت عبداللہ ابن عمر کا دوسرا درجہ ہے۔ محدث ابن جوزی نے انکی موجودہ روایتوں کی تعداد ۲۶۳۰ بتائی ہے۔ شروع میں یہ بھی کتابت حدیث کو پسند نہ کرتے تھے لیکن بعد کو جب اس کی ضرورت محسوس کی تو لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کے ممتاز شاگرد نافع ان کے سامنے بیٹھ کر لکھا کرتے تھے[6] مجاہد اور سعید ابن جبیر بھی انکی روایتیں لکھا کرتے تھے۔ اور پوچھ پوچھ کر انکی تصحیح کرتے تھے[7] ان کے بیٹے سالم بھی حدیثیں لکھا کرتے تھے[8]

---

[1] داری ص ۶۸ [2] جامع ص ۳۱۴

[3] مسند احمد ابن حنبل ص ۳۱۲–۳۱۰ ، [4] تدوین حدیث مولانا مناظر احسن گیلانی حاشیہ ص ۹۹

[5] خطبات مدارس بحوالہ فتح الباری جلد ۱ ص ۱۸۳

[6] داری ص ۶۶ [7] جامع ص ۳۳ [8] داری ص ۶۸

اس کے علاوہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ خود بھی لکھاتے تھے[1]۔ حضرت انسؓ جنکی آج ۲۲۰۶ روایتیں حدیث کی کتابوں میں درج ہیں انکی اپنی اولاد کو عام تاکید تھی کہ قیدوا العلم بالکتاب[2] ان کے شاگرد آیا ان کے پاس بیٹھ کر تختی پر لکھا کرتے تھے[3]

حضرت جابر ابن عبداللہؓ کی مرویات سے احادیث کے دفتر بھرے پڑے ہیں جنکی تعداد ۱۵۴۰ ہے[4]۔ ان کے شاگردوں کا بیان ہے کہ

کنا ناتی جابرؓ ابن عبد اللہ فنسالہ عن سنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فنکتبھا[5]

ہم حضرت جابرؓ ابن عبداللہؓ کے پاس آیا کرتے تھے۔ اُن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سنن کے متعلق پوچھ لیا کرتے تھے پھر انہیں لکھ لیا کرتے تھے۔

یہ روایتیں خود ان کی زندگی میں متعدد نسخوں میں جمع ہوگئی تھیں ان میں سے تین صحیفوں کا ذکر اجمال کی کتابوں میں موجود ہے۔ ایک مجموعہ اسمٰعیل ابن عبدالکریم کے پاس تھا[6]۔ دوسرا سلیمان یشکری کے پاس تھا[7]۔ ان کے علاوہ ایک مجموعہ خود ان کے پاس بھی تھا ابوبکر ابن عیاش سے اعمش نے اس زمانہ کے لوگوں کی یہ رائے نقل کی ہے کہ

ان مجاھدًا یحدث عن صحیفة جابرؓ[8]

حضرت مجاہد حضرت جابرؓ کے صحیفہ سے حدیث بیان کرتے ہیں

---

[1] طبقات بحوالہ مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۱۹۹

[2] داری صفحہ ۶۶ [3] داری صفحہ ۶۶

[4] تلقیح فہوم الاثر لابن جوزی بحوالہ درالندوہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۰ء

[5] طحاوی جلد ۲ صفحہ ۳۰۲ [6] تہذیب جلد ۲ صفحہ ۳۰۶ [7] تہذیب جلد ۲ صفحہ ۲۱۱ [8] طبقات جلد ۵ صفحہ ۳۳۴

(باقی)

Regd. No. A-596.

پبلشر سید حامد علی، پرنٹر بانکے لال سکسینہ، مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ

الندوہ

نمبر ۴ ماہ ربیع الآخر سنہ ۱۳۲۳ھ جلد ۲

مجلس ندوۃ العلما کا ماہوار علمی رسالہ

جس کا مقصد

علوم اسلامیہ کا احیاء، تطبیق معقول و منقول، اور علوم قدیمہ و جدید کا موازنہ ہے۔

مرتبۂ

شمس العلما مولوی شبلی نعمانی و مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی

فہرست مضامین

باہتمام قاری عبدالولی خلف علامۂ آسی مولوی عبدالعلی صاحب راسی

آسی پریس لکھنؤ میں بہ کمال حسن و خوبی طبع ہو کر

دفتر ندوۃ العلما لکھنؤ سے شائع ہوا

ضروری اطلاع

الندوہ کا یہ بارھوان نمبر ہی، خریداری کا سال پورا ہو گیا، اس لیے اطلاعاً گزارش ہی کہ اس کے بعد کا پرچہ تمام خریدارون کی خدمت مین (قدیم خریدار ہون یا جدید) ویلو روانہ ہو گا، اگر کسی صاحب کو آیندہ، پرچہ کی خریداری منظور نہ ہو تو ہم کو مطلع فرمائین، تاکہ اُن کی خدمت مین ویلو نہ بھیجا جائے۔

دستخط
منیجر الندوہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الندوہ

ہمکو اس بات سے خوشی ہوئی کہ جو مضمون ہمارے دارالعلوم کے ایک طالب العلم کا پچھلے پرچے مین شائع ہوا، وہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا، جناب مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے ایک خط حال مین ہمکو لکھا ہی، اس مین تحریر فرماتے ہین

"سب سے زیادہ اس بات کی خوشی ہی کہ دارالعلوم نے اپنی"
"تعلیم کا نہایت عمدہ نمونہ پہلی ہی بار پیش کیا ہی فبارك اللہ"
"فیہا و فی طلبتہا و فی تعلیمہا ۔ مجھے امید نہین بلکہ یقین ہی"
"کہ عربی کی کامل تعلیم، اور انگریزی کی بقدر ضرورت، ہماری قوم"
"مین ایسے لائق مضمون نگار اور مصنف پیدا کریگی کہ محض انگریزی"
"تعلیم، آج تک ویسا ایک بھی نہین پیدا کرسکی ۔ "

مولانائے موصوف نے جوکچھ لکھا ہی، اسکی واقعیت سے کسکو انکار

ہوسکتا ہے۔ مسلمانوں مین جو لوگ آج علمی معرکون کے علمبردار ہین ؟
ہین جو عربی تعلیم یافتہ، اور انگریزی مذاق سے آشنا ہین، محض انگریزی
دانی نے اب تک تو کوئی صاحب قلم نہین پیدا کیا، آیندہ کی نسبت
کون راے دلیکتا ہو۔

بنگلور کے مسلمان، نہایت شوق اور خواہش سے ندوۃ العلما
سے ایک وکیل بھیجنے کی درخواست کررہے ہین۔ انھون نے خود
معقول چندہ جمع کرلیا ہو، اور کہا ہو کہ وکیل کے آنے پر چندہ
کی تعداد بہت بڑھ جائیگی۔ ان کی یہ بھی خواہش ہو کہ اس سال
ندوہ کا سالانہ جلسہ وہین ہو۔ ہم بھی ان کی اس درخواست سے
متفق ہین، اگر ممالک متحدہ کسی وجہ سے ندوہ کے ساتھ سردمہری کا
برتاو کررہا ہو۔ تو دنیا قدردانون سے خالی نہین۔

ہیچ کس عزت نہ دارد در دیارِ خویشتن
آب تا در گل بود، آب ست و در مینا گلاب

شملہ کے پرجوش مسلمان بڑے زورشور سے
ندوہ کی سفارت کی طیاریان کررہے ہین۔ ہمکو معلوم ہوا ہو
کہ اس سفارت مین بڑے بڑے معزز علما اور واعظین شریک
ہون گے، مثلاً جناب مولوی شاہ سلیمان صاحب، جناب

مولوی عبدالحق صاحب، جناب مولوی سید عبدالحی صاحب
انکسار منشئی بھی اس قافلہ کا گرو راہ ہوگا۔

بے شبہہ نہایت شرم کی بات ہو کہ ہمارے ہندو بھائیون مین ایثار نفس کی جہان سیکڑون مثالین پائی جاتی ہین، اسکے مقابلہ مین ہم ایک دو نظیر بھی نہین پیش کرسکتے۔ ہم روز سنتے رہتے ہین کہ فلان ہندو یا فلان آریہ، نے اپنی خدمات تمام عمر کیو اسطے بلاکسی معاوضہ کے کسی قومی کام کی نذر کردین، یا اس قدر قلیل معاوضہ لینا گوارا کیا، جو اسکی قابلیت کے مقابلہ مین بالکل ہیچ ہو۔ لیکن آج تک یہ سننے مین نہ آیا کہ کسی مسلمان نے اس قسم کی فیاض دلی کی ہو، حالآنکہ قومی ہمدردی کا غلغلہ اس زور سے بلند کیا جاتا ہو کہ اسکی آواز نہ صرف ہندوستان، بلکہ اقصای یورپ مین گونج جاتی ہو۔

لیکن خدا نے چاہا تو یہ حالت دیر تک قائم نہ رہیگی اکثر قلوب متاثر ہونے لگے ہین اور ایک آدھ مثالین بھی نظر آنے لگی ہین۔ مولوی عبدالحی صاحب ایک مدت سے ندوۃ العلما مین مددگار ناظم کی خدمت پر مامور ہین

اور انھوں نے نہایت خوبی سے اس خدمت کو آج تک انجام دیا۔ چند مہینے ہوے انھوں نے معاوضہ لینے سے بالکل انکار کردیا اور اب بغیر کسی قسم کے حق الخدمۃ کے اپنے کام کو اُسی مستعدی اور سرگرمی اور دلسوزی سے انجام دے رہے ہین۔ یہ فیاضی اُس وقت اور بھی قابل قدر ہوجاتی ہی جب یہ خیال کیاجاتا ہی کہ مولوی صاحب موصوف کو معاش کی طرف سے بےاطمینانی ہی اور اس وجہ سے ان کی زندگی نہایت عُسرت کے ساتھ بسر ہوتی ہی، لیکن اُن کی اس عسرت پر سیکڑون امیرانہ زندگیان نثار کردینے کے قابل ہین۔

انشاءاللہ ہم چند روز مین اس قسم کی اور بعض مثالین پیش کریکن گے۔

مُتَنَبِّی

الندوہ میں ہم نے اخلاقِ عرب کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا، جس کا صرف ایک نمبر نکل کر رہ گیا، آیندہ وہ سلسلہ پھر شروع ہوگا، لیکن اس مضمون میں بھی اُس عنوان کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

متنبی اگرچہ چوتھی صدی کا شاعر ہو جب کہ شعرائے عرب کے تمام اوصاف مٹ چکے تھے اور جب کہ شاعری صرف بھٹئی اور گداگری رہ گئی تھی تاہم چونکہ متنبی کا بچپن، صحرائے عرب اور بدوؤں میں گزرا تھا، اس لیے عرب کے بہت سے شریفانہ اخلاق اُس میں نظر آتے ہیں۔

متنبی کا کلام درس میں داخل ہے، لیکن درس کا طریقہ ایسا ہے جس سے طلبا میں بجز اسکے کہ اشعار کے معمولی معنی یاد کرلیں کسی قسم کی استعداد پیدا نہیں ہوتی، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر

یہ پوچھا جائے کہ متنبی کا خاص انداز کیا ہے؟ اسکے ہم عصر شعرا سے اسکو کیا نسبت ہے؟ اسکی شاعری مین کیا عیوب اور کیا محاسن ہین؟ تو طلبہ ایک طرف، اکثر علما بھی اسکے جواب سے قاصر رہینگے، اسلیے ہمنے اختصار کے ساتھ اسکے کلام پر تنقید بھی کی ہے، اور یہ حصہ طلبا اور علما کے خاص ملاحظہ کے قابل ہے۔

متنبی[1] کا نام و نسب یہ ہے- احمد بن الحسین بن الحسن بن عبدالصمد جعفی کندی کوفی۔ کوفہ مین ایک محلہ تھا جسکو کندہ کہتے تھے، متنبی اسی محلہ مین ۳۰۳ھ مین پیدا ہوا، اسی محلہ مین ایک مکتب تھا جس مین شرفاے کوفہ کی اولاد تعلیم پاتی تھی، متنبی نے اسی مکتب مین تعلیم پائی، اس زمانے تک مکاتب مین ادب، شعر اور لغت کی تعلیم ہوتی تھی۔ متنبی نے بھی یہی فنون حاصل کیے۔

شباب کا ابھی آغاز بھی نہین ہوا تھا کہ اس کا باپ اس کو

[1] متنبی کے حالات اگرچہ اکثر تذکرون مین ملتے ہین لیکن خزانۃ الادب (جلد اول صفحہ ۳۸۲) مین نہایت مستند ذریعہ سے اسکے حالات لکھے ہین۔ ایک مستقل کتاب بھی اسکی سوانح عمری مین لکھی گئی ہے، جو شرح دیوان متنبی کے حاشیہ پر مصر مین چھاپی گئی ہے اور جس کا نام "الصبح المنبی" ہے۔

لیکر عرب چلاگیا۔ اور ایک مدت تک مختلف قبیلون مین دورہ کرتا رہا۔ خلفای بنوامیہ کے ہان دستور تھا کہ بچپن ہی مین اولاد کو قبائل عرب کے ہان بھیجدیتے تھے تاکہ ان مین دلیری آزادی اور زور تقریر کے وہ جوہر پیدا ہون جو صحرا نورد عربون کا خاصہ ہے متنبی کو خوش قسمتی سے یہ موقع ہاتھ آیا اور اسکی سوانح مین عزم اور بلند ہمتی کے جو آثار نظر آتے ہین اسی تربیت کے نتائج ہین۔

متنبی فطرۃً شاعر تھا، بدوین مین رہکر یہ ملکہ اور راسخ ہوگیا اسنے ہوش سنبھالنے کے ساتھ شعر کہنا شروع کردیا تھا۔ اور چونکہ عام عرب کے انداز کے خلاف، اسکی طبیعت مضمون آفرینی اور نازک خیالی کی طرف مائل تھی، اسکو اپنا کلام، تمام شعرا سے ممتاز نظر آتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اسنے نبوت کا دعوی کردیا اور اپنے اشعار کو معجزہ قرار دیا۔ سوانح متنبی مین لکھا ہے کہ اسنے قرآن کے جواب مین ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ چنانچہ اسکے چند فقرے یہ ہین -

" والنجم السیار و الفلک الدوار و اللیل و النہار ان الکافر "

" لفی اخطار امض علی سُنّتک واقف اثر من کان قبلک "

" من المرسلین فان اللہ قامع بک زیغ من الحد فی الدین "

" و ضل عن السبیل۔ "

ابو العلاء معری اور عبداللہ بن المقفع کی نسبت بھی یہ مشہور ہے کہ

انھون نے قرآن مجید کا جواب لکھا تھا، لیکن ہمارے نزدیک یہ سب یارون کے لطیفے ہین جو گرمی محفل کے لیے تصنیف کرلیے گئے ہین۔ متنبی اور عبداللہ بن المقفع لامذہب اور بیدین سہی لیکن بدمذاق اور بےتمیز نہ تھے کہ ایسے مبتذل کلام کو کلام الٰہی کے سامنے پیش کرتے

بہرحال متنبی نے صحراے سماوہ مین نبوت کا دعوی کیا اور قبیلۂ بنی کلب وغیرہ اسکے مرید ہوگئے۔ جب یہ فتنہ زیادہ بڑھا تو امیر لولو نے جو سلطنت اخشیدیہ کی طرف سے حمص کا گورنر تھا متنبی کو گرفتار کرکے قیدخانہ بھیجدیا، مدت کی قید کے بعد متنبی نے توبہ کی اور قیدخانہ سے نجات پائی۔ اب اسنے شاعری کو ذریعۂ معاش قرار دیا۔ امرا اور اغنیا کی شان مین قصائد لکھتا اور انعام حاصل کرتا تھا ایک مدت تک اسکے اشعار بہت سستے دامون بکتے تھے یہانتک کہ ایک قصیدہ پر جس کا یہ مطلع تھا

ایا لایمی ان کنت وقت اللوائم	علمت بما بی بین تلک المعالم

سو اشرفیان ملین اور یہ پہلا دن تھا کہ متنبی کی شہرت نے پرپرواز نکالے

اس زمانے مین مصر و شام مین جو فرمانروا تھے، ان مین سب سے زیادہ نامور سیف الدولہ تھا۔ وہ عربی النسل اور حمدان کے خاندان سے تھا۔ ایشیای کوچک مین اسوقت تک قیصر روم کی سلطنت قائم تھی سیف الدولہ اکثر اسپر حملہ آور ہوتا تھا اور کامیاب آتا

سلہ ابن خلکان۔

تھا۔ بعض معرکون مین اسنے رومیون کی ہزارون فوجین برباد کردین اسکے ساتھ علم وفضل کا بڑا قدردان تھا اور خود نکتہ سنج اور نکتہ دان تھا مؤرخین نے لکھا ہو کہ شعرا اور مصنفین جس قدر اسکے دربار مین جمع ہوسے ہرون الرشید اور مامون الرشید کے سوا اور کسی کے دربار مین ایسا مجمع نہین ہوا حکما مین فارابی اور مصنفین مین صاحب اغانی اسی کے دربار سے فیضیاب تھے۔

سیف الدولہ کے اُمراء مین ابوالعشائر ایک قدردان امیر تھا متنبی نے اسکی مدح مین قصیدے لکھے اور اسکو اسقدر اپنا گرویدہ کرلیا کہ اسنے ۳۳۷ھ مین سیف الدولہ کے دربار مین سفارش کی متنبی اب اس رتبہ پر پہونچ گیا تھا کہ بلندہمتی اور خودداری کے اوصاف جو اسنے عرب سے سیکھے تھے اُن سے کام لے چنانچہ سیف الدولہ کے دربار مین جانے کے لیے اسنے چند شرطین پیش کین جن مین سے ایک یہ تھی کہ دربار مین بخلاف اور شعرا کے، بیٹھ کر قصیدہ پڑھیگا۔ سیف الدولہ نے اس کا کلام سنا تو کہا کہ بےشبہہ متنبی کو ایسی شرطون کے پیش کرنے کا استحقاق تھا۔ سیف الدولہ نے یہ دیکھکر کہ متنبی مین سپہگری کے جوہر بھی پائے جاتے ہین اسکو سپہگری کے فنون سکھلوائے چنانچہ حلب مین اساتذۂ فن کے سپرد کیا کہ شہسواری اور نیزہ بازی کے کرتب سکھائین۔ سیف الدولہ ایشیای کوچک پر جو حملے کرتا تھا متنبی اکثر اس مین شریک ہوتا تھا

یہی وجہ ہو کہ معرکۂ جنگ کی تصویر جس طرح وہ کھینچ سکتا ہو، اس کے معاصرین سے نہین کھنچ سکتی۔

سیف الدولہ اگرچہ متنبی کی قدردانی مین کوئی کمی نہین کرتا تھا چنانچہ ایک دفعہ جب اسنے دریافت کیا کہ متنبی کو دفتر انعام سے کس قدر رقم دی جاچکی ہو تو معلوم ہوا کہ چار برس کی مدت مین پینتیس ہزار[۳۵] اشرفیان اس کو مل چکی ہین، تاہم وہ، متنبی کی بیحد خودپرستی اور غرور سے تنگ آگیا تھا۔ اسلیے اسکے غرور توڑنے کے لیے وہ اکثر دربار کے اور شعرا کو متنبی کے مقابلہ کا حوصلہ دلاتا رہتا تھا۔ متنبی کو یہ سخت ناگوار ہوتا تھا۔ اسکے سوا ناراضی کے اور اسباب بھی جمع ہوتے جاتے تھے۔ متنبی کے آنے سے پہلے، سیف الدولہ کے دربار مین ابوالعباس نامی شاعر بڑا رسوخ رکھتا تھا لیکن متنبی کی سحرکاریون نے اس کا رنگ پھیکا کردیا، ایک دن تنہائی مین ابوالعباس نے اس کی شکایت کی، سیف الدولہ چپ رہا جب ابوالعباس نے زیادہ اصرار کیا تو سیف الدولہ نے کہا تم متنبی کا مقابلہ نہین کرسکتے، کیا تم متنبی کے اس شعر کا جواب کہہ سکتے ہو!

یعود من کل فتح غیر مفتخر	و قد اعد علیه غیر مفتقر
وہ ہر فتح حاصل کرتا ہو لیکن اسکو غرور نہین پیدا ہوتا	مال اگرچہ لڑائی کے لیے چلا تھا تو کچھ طیاری بھی نہین کی تھی

ابوالعباس برہم ہوکر اٹھا، اور اسکو یقین ہوگیا کہ متنبی کے آگے اس کا چراغ نہین جل سکتا۔

اس سے بڑھکر یہ کہ امیر ابو فراس جو سیف الدولہ کا بھائی اور بہت بڑا شاعر تھا، متنبی کی نخوت پرستی سے ناراض ہوکر سیف الدولہ کے پاس گیا اور کہا کہ آپ اس مغرور کو تین ہزار دینار سالانہ دیتے ہین حالانکہ اس تنخواہ مین بیس شاعر اس درجہ کے مل سکتے ہین غرض دربار کا دربار متنبی کا مخالف ہوگیا، اور سب نے سیف الدولہ کے کان بھرنے شروع کیے۔ آخر سیف الدولہ نے ناراضی کا اظہار کیا اس موقع پر اگر کوئی ایرانی شاعر ہوتا تو اس حد تک خوشامد اور غلامانہ تملق کرتا کہ خواہ مخواہ ممدوح کا دل نرم ہوجاتا لیکن ایک عرب کا شاعر ایسا نہین کرسکتا تھا، متنبی نے ایک پُرزور قصیدہ کہا، جس مین نہایت آزادی اور دلیری سے سیف الدولہ کی ناقدردانی، و ناانصافی اور اپنی بلندقدری اور خودداری ظاہر کی۔ اس قصیدہ کے جستہ جستہ اشعار سننے اور یاد رکھنے کے قابل ہین۔

ہم ان مین سے چند اشعار کا ترجمہ درج کرتے ہین۔

او سب سے زیادہ عادل، (بجز میرے معاملہ کے)	تیرے ہی بارہ مین نزاع ہے اور تو ہی دشمن، اور تو ہی ثالث ہے۔
آدمی کو آنکھ سے کیا حاصل	اگر اسکو تاریکی اور روشنی مین فرق نہ معلوم ہو (یعنی سیف الدولہ کو نیک و بد کی تمیز نہین)
مجھکو، گھوڑے، راتین، صحرا، تلوار، نیزے۔	اور کاغذ و قلم سب پہچانتے ہین۔
کاش یہ بادل (سیف الدولہ) جہان برستا ہو	وہین جاکر گرجتا بھی، (یعنی جن پر مہربانی کرتا ہو انھین پر ناراض بھی ہوتا)

اس قصیدہ پر تمام دربار برہم ہوا، یہانتک کہ ایک شخص نے سیف الدولہ کی زبان سے ابوالعشائر کے پاس کہلا بھیجا کہ متنبی نے یہ گستاخیان کین، ابوالعشائر نے دس آدمی انطاکیہ سے روانہ کیے کہ متنبی کو اس کی سزا دین۔ سیف الدولہ کے آستانہ پر متنبی سے اور اُن سے مٹ بھیڑ ہوئی، ایک نے متنبی کی باگ پر ہاتھ ڈالا، متنبی نے تلوار کا ہاتھ مارا جو کمان کو کاٹ کر ہاتھ تک پونچا اور وہ شخص زخمی ہوکر گرا، اب سب نے مل کر تیر برسائے لیکن متنبی لڑ بھڑ کر نکل آیا۔

غرض سنہ ۳۴۶ھ مین متنبی حلب سے جو سیف الدولہ کا پایۂ تخت تھا، نکلا اور دمشق مین آیا۔ دولت عباسیہ کے ضعف سے ملک مین ہر طرف خود مختار حکومتین قائم ہوگئی تھین جو برائے نام دربار خلافت سے اپنا تعلق ظاہر کرتی تھین۔ انھین مین مصر کی سلطنت تھی جس کا فرمان روا اس وقت **کافور** ایک خواجہ سرا تھا۔ اسلام نے غلامون کو جو رتبہ دیا اس کے نتائج مین ایک یہ بھی تھا کہ مصر و شام کی وسیع حکومت ایک حبشی غلام کے قبضۂ اقتدار مین تھی اور اس کا خطبہ حرمین مین پڑھا جاتا تھا۔ کافور پہلے نہایت ادنے درجے کا غلام تھا۔ چونکہ نہایت کریہ المنظر اور عجیب الہیئتہ تھا راہ چلتے لوگ اس کو چھیڑتے تھے رفتہ رفتہ والی مصر ابوبکر بن طغج کی خدمت مین پونچا جس کو دربار خلافت سے

اخشید کا لقب ملا تھا، ابوبکر کے مرنے پر کافور نے اس قدر اقتدار حاصل کرلیا کہ اس کا جانشین بنگیا اور جب تک زندہ رہا بڑی شان و شوکت سے حکومت کی، مصر و شام، حجاز- نجد و یمن مین اسی کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا-

متنبی مداحی اور بھٹئی سے بالطبع متنفر تھا، وہ چاہتا تھا کہ کسی صوبہ یا ضلع کی حکومت مل جائے تو آزادانہ زندگی بسر کرے اسی توقع پر وہ کافور کے دربار مین حاضر ہوا- پہلا قصیدہ جو ۳۴۶ھ مین اسنے کافور کے سامنے پڑھا اس کا مطلع یہ ہے-

کفی بك داءً آن تری الموت شافیا		وحسب المنایا ان یکن امانیا

کافور نے مختلف موقعون پر اس کو گران بہا صلے دیے لیکن اسکی بلندنظری کو ان چیزون سے تسلی نہین ہوسکتی تھی، اسنے اکثر قصیدون مین اس خیال کو ظاہر کیا، ایک قصیدہ کا خاتمہ یہ ہے-

فاد مر بی ما اردت منی فانی		اسد القلب آدمی الر واء
جو خدمت چاہے میرے سپرد کر		کیونکہ مین آدمی کی صورت مین شیر ہون
و فؤادی من الملوك وان کا		ن لسانی من الشعراء
میرا دل بادشاہون کا دل ہے		گو میری زبان شاعرون کی، ہے

ایک اور قصیدہ مین لکھتا ہے،

ابا المسك هل فی الكاس فضل اناله		فانی اغنی منذ حین و تشرب
او کافور! پیالہ مین کچھ باقی بھی ہے؟ جو میرے کام آئے		بڑی دیر سے مین گارہا ہون اور تو پی رہا ہے

وهبت على مقدار كفي زماننا	ونفسي على مقدار كفك يطلب
تو نے جو دیا وہ زمانہ کے ہاتھوں کے اندازہ سے دیا	لیکن مین تو تیرے ہاتھ کے اندازہ سے چاہتا ہون
اذا لم تنط بي ضيعة او ولاية	فجودك يكسوني وشغلك يسلب
اگر تو نے مجھکو کوئی جاگیر یا کسی کی حکومت نہ دی	تو تیری سخاوت مجھکو کپڑے پہنائیگی اور دربار کی حاضری اسکو چھین لیگی

کافور متنبی کی درخواست کو منظور کرلیتا لیکن متنبی کی بلند حوصلگیون کا اسکو جو تجربہ ہوا اسنے یقین دلادیا کہ متنبی کی حوصلہ مندی کی یہ ابتدائی منزلین ہین، ورنہ وہ سلطنت اور حکومت کے بغیر چین نہین لے سکتا، متنبی کو جب اپنی ناکامی کا یقین ہوگیا تو اسنے کافور کے دربار مین جانا چھوڑدیا اور ہرطرح کے تعلقات ترک کردیے، ایک ایشیائی دربار مین اس قسم کی گستاخی بہت بڑا جرم تھی۔ کافور نے متنبی کو سزا دینی چاہی، جس کی ابتدا یہ تھی کہ متنبی پر پہرے بٹھادیے گئے کہ بھاگ کر نکل نہ جانے پائے۔ سوانح متنبی مین لکھا ہے کہ جب کافور نے متنبی کو ضرر پہنچانے کا ارادہ کرلیا اور اس کی جان معرض خطر مین آگئی تو بعض شخصون نے ہمدردی کے لحاظ سے متنبی کو اس حال سے مطلع کردینا چاہا لیکن کافور کے خوف سے یہ جرأت نہ کرسکے متنبی نے آخر تنگ آکر کافور کی ہجو لکھی جسکے دو شعر یہ ہین

صار الخصي امام الآبقين بها	فالحر مستعبد والعبد معبود
یہان ایک خواجہ سرا فراری غلامون کا امام ہے	آزاد، غلام بن گئے ہین اور غلام معبود بن گیا ہے
ما كنت احسبني ابقى الى زمن	يسيئ بي فيه كلب وهو محمود

ت یہ نہین خیال کرتا تھا کہ مین ایسا زمانہ دیکھونگا ۔۔ جس مین ایک کتا مجھکو ستائے اور پھر مجھکو اسکی تعریف کرنی پڑیگی

سلاطین اور امرا سے ناراض ہوکر ہجو لکھنا ایشیائی شعرا کا عام شعار تھا اور یہ ایشیائی شاعری کے چہرہ کا بڑا بدنما داغ ہے۔ فردوسی نے محمود کے تمام احسانات اور کارناموں کو یہ کہکر مٹا دیا

پرستار زادہ نیاید بکار ۔۔ وگرچند دارد پدر شہریار

تاہم متنبی مین اس قدر شرافت کی ادا نظر آتی ہے کہ گو وہ اکثر امرا اور ہمعصرون سے ناراض ہوا لیکن ہجو صرف اُن کی لکھی جو ہجو کے قابل بھی تھے۔ سیف الدولہ سے بھی وہ ناراض ہوا اور یہ ناراضی بجا بھی تھی تاہم اسنے بجز ایک دوستانہ شکایت آمیز قصیدے کے ایک حرف بھی اسکی شان مین نہین کہا۔

متنبی نے سمجھ لیا تھا کہ ہجو کے بعد مصر مین رہنا آسان نہین چنانچہ اسنے پہلے سے طیاریان کر رکھی تھین، جس راستہ سے سفر کرنا تھا، آدمی بھیجکر جابجا زمین کے نیچے نیزے اور ہتھیار دبوا دیے جان نثار غلامون کو مسلح کیا دس دن کی خوراک کے موافق اونٹون پر پانی کے مشکیزے رکھوا لیے، یہ سب سامان کرکے عین عید کے دن ۳۵۰ھ مین مصر سے نکلا، کافور کو یہ خبر لگی تو فوراً ہر طرف ناکہ بندیان کرادین، تمام عرب قبائل کے پاس قاصد دوڑا دیے کہ متنبی جہان ملے گرفتار کرکے بھیجدو، یہ سبکچھ ہوا لیکن متنبی دو منزلہ سہ منزلہ طے کرتا لوٹتا بھڑتا صاف نکل گیا راہ مین اس کے

غلاسون نے بیوفائی کی، اسنے ان کا ساتھ چھوڑا اور جریدہ و تنہا تمام منزلین طے کین۔ کوفہ مین پہنچکر ایک طول طویل قصیدہ لکھا جس مین سفر کے تمام حالات اور راستہ کے مقامات نہایت تفصیل سے بیان کیے چنانچہ مقامات کے نام گناکر فخریہ لکھتا ہے۔

فلما انخنا رکزنا الرماح	فوق مکارمنا والعلا
جب ہم سواری سے اترا	تو نیزوں کو بلند ہمتی اور شرافت کی سطح پر گاڑا
وبتنا نقبل اسیافنا	ونمسحها من دماء العدا
اور تلوار کو بوسے دیتے	اور دشمنوں کے خون کے دھبے مٹاتے
لتعلم مصر ومن بالعراق	ومن بالعواصم انی الفتی
تاکہ مصر اور عراق اور عواصم کو	معلوم ہوجائے کہ مین مرد ہون

کوفہ سے متنبی نے بغداد کا رخ کیا، بغداد اس زمانے مین دیلمین کے زیر اثر تھا اور **مہلبی** جو معزالدولہ کا وزیر تھا سیاہ و سپید کا مالک تھا۔ متنبی اس کے دربار مین حاضر ہوا، اتفاق سے اُس وقت ابوالفرج اصفہانی (مصنف کتاب الاغانی) بھی موجود تھا۔ علمی چرچے ہورہے تھے کہ کسی نے یہ شعر پڑھا۔

سقی اللہ امواہا عرفت مکانہا	جراما وملکوما وبذرا فابغما

متنبی نے کہا جراما نہین بلکہ جراباً صحیح ہے۔ ابوالفرج اصفہانی نے اس سے انکار کیا۔ متنبی دوسرے دن دربار مین گیا، تو مہلبی منتظر تھا کہ مدحیہ قصیدہ لکھکر لایا ہوگا، لیکن متنبی

اس وجہ سے لوگوں کی مداحی کو عار سمجھتا تھا۔ تیسرے دن بھی جب متنبی دربار مین خالی ہاتھ گیا تو مہلبی کو نہایت رنج ہوا۔ اسنے شعرا کو اشارہ کردیا کہ متنبی کی خبرلین چنانچہ شعرا نے ہجو ون کا طومار لگادیا۔ لیکن متنبی خبرتک نہ ہوا اور جب لوگون نے کہا کہ آپ کی طرف سے بھی جواب ہونا چاہیے تو اسنے کہا کہ مین پہلے کہہ چکا ہون

واذا اتتك مذمتي من ناقص		فهي الشهادة لي باني كامل
جب کم مرتبہ کے لوگ میری برائیان بیان کرین		تو یہی دلیل ہو کہ مین کامل ہون

بغداد کی ناقدردانی دیکھکر متنبی نے یہان سے بھی نکلنے کا ارادہ کیا، بغداد چھوڑکر اہل فن کا کہین ٹھکانا تھا تو فارس و شیراز تھا جو عضدالدولہ کا پایہ تخت تھا۔ عضدالدولہ اس زمانے کا سب سے بڑا بادشاہ تھا اور اسی وجہ سے شاہنشاہ کہلاتا تھا۔ اس کے درباریون مین محمد بن العمید بڑے پایہ کا شخص تھا۔ خود صاحب علم و فن اور علم و فن کا نہایت قدردان تھا، اس کو جب یہ خبرلگی کہ متنبی نے فارس کا رخ کیا ہو تو اس کو بڑا تردد یہ پیدا ہوا کہ اگر متنبی نے مہلبی کی طرح مجھکو قابل خطاب نہ سمجھا تو میری بڑی تحقیر ہوگی، پیشبندی کے طورپر جب متنبی کا ذکر آتا تو حقارت سے نام لیتا تھا۔ الصبح المنبی مین لکھا ہو کہ ایک دن ابن العمید کے درباریون

سلہ خزانۃ الادب تذکرۂ متنبی۔

مین سے ایک شخص اُس کے دربار مین گیا تو دیکھا کہ وہ بجھا ہوا بہت مغموم بیٹھا ہو، درباری نے پوچھا کہ حضور کیون متفکر ہین۔ ابن العمید نے کہا میری بہن کے انتقال مین کچھ اوپر ساٹھ خط تعزیت کے آئے ہین ہر خط متنبی کے اس شعر سے شروع ہوتا ہو۔

طوی الجزیرۃ حتی جاءنی خبر		فزعت فیہ بآمالی الی الکذب

ایسے شخص کی شہرت کو مین کیونکر مٹا دون۔

متنبی نے اگرچہ مختلف موقعون پر یہ خیال ظاہر کردیا تھا کہ مین بادشاہون سے نیچے نہین اُترتا اور اسی بنا پر اُس نے مُہلّبی کی مدح سے انکار کردیا تھا لیکن ابن العمید کے متعلق اس کو اپنی ضد سے بازآنا پڑا، ابن العمید دولت و حشمت، جاہ و جلال، انتظام و تدبیر کے لحاظ سے تو جو کچھ تھا، تھا ہی، علم و فضل، مین بھی وہ متنبی کا ہمسر بلکہ بعض حیثیتون سے بڑھکر تھا، علمای ادب کا، اتفاق ہو کہ انشاپردازی اور نثاری مین تمام اسلامی دنیا مین اسکا جواب نہ تھا، یہ مشہور فقرہ ہو کہ انشاپردازی عبدالحمید سے شروع ہوئی اور ابن العمید پر ختم ہوگئی، **صاحب بن عباد** جو فن ادب کا ایک رکن ہو ابن العمید ہی کا تربیت یافتہ ہو، اس کے علاوہ وہ فلسفہ اور حکمت مین کمال رکھتا تھا، اسلیے متنبی نے اگر اسکی مداحی گوارا کی تو کچھ بیجا نہ کیا، تاہم مداحی مین یہ آن قائم رکھی کہ مدح امیرانہ انداز سے نہین کی بلکہ اس کے علمی اوصاف بیان کیے

بخلاف اس کے شعرای عجم، کسی شاعر یا مصنف کی بھی مدح کرتے ہین تو معلوم ہوتا ہے کہ سکندر و دارا کی داستان سنا رہے ہین۔

بہرحال متنبی نے ارجان کا رخ کیا جہان ابن العمید قیام پذیر تھا، شہر سے باہر ایک جگہہ ٹھہرکر اپنے غلام کو بھیجا کہ ابن العمید کو جاکر خبر کرے۔ یہ دوپہر کا وقت تھا اور ابن العمید خواب راحت کرنا چاہتا تھا کہ یہ مژدہ پونچا۔ بیساختہ اُٹھ بیٹھا اور نہایت متعجب سے پوچھا کہ کیا واقعی متنبی یہان آگیا، اُسی وقت استقبال کے لیے اپنے خاص حاجب کو بھیجا۔ حاجب سوار ہوا تو راہ مین جو لوگ ملتے گئے سب کو ساتھ لیتا گیا، متنبی بڑے سروسامان سے شہر مین داخل ہوا۔ دربار مین آیا تو ابن العمید نے سروقد تعظیم دی متنبی کے لیے پہلے سے ایک کرسی بچھا دی گئی تھی جس پر کمخواب کا گدا پڑا ہوا تھا۔ ابن العمید نے کہا مین آپ سے ملنے کا بہت مشتاق تھا۔ معمولی بات چیت کے بعد متنبی نے آستین سے ایک کاغذ نکالا اور یہ قصیدہ پڑھا۔

بادٍ هواك صبرت ام لم تصبرا	وبكاك ان لم يجر دمعك او جرى

تشبیب کے بعد مدح کے بعض اشعار یہ ہین۔

من مبلغ الاعراب عني انني	شاهدت رسطاليس والاسكندرا
بدویون سے یہ پیغام کون جاکر کہیگا	کہ مین نے ارسطو اور سکندر دونون کو دیکھا
وسمعت بطليموس دارس كتبه	متملكا متبديا متحضرا

مین نہ بطلیوس کو درس دیتے سنا | جو فرمانروا بھی ہی، بدوی بھی ہی، شہری بھی ہی

ابن العمید نے متنبی کی شاگردی اختیار کی، یعنی مجموعۂ لغت جو متنبی نے خاص اپنی تحقیق اور تفحص سے مرتب کیا تھا اس سے پڑھا۔

ابن العمید نے خلعت و تحائف کے علاوہ پچاس ہزار اشرفیان متنبی کی نذر کین۔

متنبی ارجان ہی مین تھا کہ عضدالدولہ کو یہ خبر پونچی، اسنے ابن العمید کو لکھا کہ متنبی کو یہان بھیجدو، ابن العمید نے یہ پیغام متنبی سے کہا اسنے کہا۔ عجمی میری قدر کیا جان سکتے ہین۔ ابن العمید نے کہا عضدالدولہ مجھسے ہربات مین بڑھکر ہی۔ متنبی نے کہا مین بادشاہون کی ملاقات سے تنگ آگیا ہون، مین انکو بقای دوام کا تاج پہنا دیتا ہون اور وہ مجھکو صلہ مین ایسی چیزین دیتے ہین جو چار دن بھی نہین ٹھہرتین، اس کے علاوہ مین ایک جگہ جمکر قیام نہین کرسکتا، اور سلاطین، مجھکو قیام پر مجبور کرتے ہین، نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ بڑی بے لطفی سے مجھکو قطع تعلق کرنا پڑتا ہی۔ ابن العمید نے تمام باتین عضدالدولہ کو لکھ بھیجین۔ وہان سے جواب آیا کہ متنبی کو ہربات کا پورا اختیار ہی، غرض متنبی ارجان سے روانہ ہوا شیراز کو جب بارہ میل باقی رہ گئے تو عضدالدولہ نے ابوعمر صباغ کو متنبی کی پیشوائی کے لیے بھیجا۔ دونون ساتھ ساتھ آئے، صباغ کی

سلہ یہ پوری تفصیل خزانۃ الادب مین ہی۔

پہنچ کر متنبی نے راہ میں قصیدۂ مصریہ کے اشعار سنائے،
متنبی کے لیے پہلے سے ایک آراستہ مکان طیار رکھا گیا تھا، سفر
کی تکان مٹنے کے بعد وہ عضدالدولہ کے دربار میں گیا، اور
عضدالدولہ کے تخت شاہی کے متصل دربار کے قاعدہ کے موافق
پائے انداز کو بوسہ دیا پھر سروقد کھڑا ہوا اور کہا کہ میں اُس سواری کا ممنون
ہون جو مجھکو یہان تک لائی، عضدالدولہ نے گرمجوشی سے سفر کے
حالات پوچھے۔ متنبی نے مناسب جواب دیا۔

چندروز کے بعد مدحیہ قصیدہ لیکر گیا اور چاہا کہ دربار کے
دستور کے موافق کھڑے ہوکر پڑھے لیکن عضدالدولہ نے بٹھالیا
متنبی قصیدہ پڑھکر چلاآیا تو عضدالدولہ نے کافور۔ عنبر۔ مشک
عود۔ اسپ خاصہ جو پچاس ہزار بکریون کے عوض مین خریدا گیا تھا
کمخواب کے استرکی چادر، عمامہ جسکی قیمت پانچ ہزار دینار تھی۔
ہندوستانی مرصع تلوار جس کا پرتلا سونے کا تھا، ان سب کے علاوہ
روپیون کے توڑے، صلے مین بھیجے۔ ایک موقع پر جب اسنے
گل افشانی کے جشن مین یہ شعر پڑھے

قد صدق الورد فی الذی زعما	انك صیرت نثرہ دیما
انما مایج الهواء به	بحر حوى مثل مایه عتما

شاہانہ خلعت عطا کیا،

متنبی نے اگرچہ عضدالدولہ کی مدح مین بہت کچھ زور طبیعت

صرف کیا لیکن سیف الدولہ کے علمی دربار مین جن حریفون کا
اس کو مقابلہ رہتا تھا، اس پایہ کے لوگ، عضدالدولہ کے دربار
مین کہان سے آسکتے تھے اسلیے کلام مین وہ زور نہ پیدا ہوسکا
عضدالدولہ نے اس تنزل کو محسوس کیا چنانچہ لوگون سے کہا کہ متنبی
کا زور کلام اسی وقت تک رہا جب تک وہ عرب مین تھا، متنبی
نے سنا تو کہا کہ جیسے مخاطب ہوتے ہین ویسا ہی شعر بھی کہا جاتا ہو،
تاہم عضدالدولہ نے قدردانی مین کچھ کمی نہین کی، سوانح متنبی
مین لکھا ہو کہ متنبی کو دولاکھ درہم صلہ مین عطا کیے - آخر متنبی
کا دل یہان سے بھی اُچاٹ ہوا، ایک وداعی قصیدہ لکھا اور
عضدالدولہ سے رخصت ہوکر کوفہ کو روانہ ہوا، اہواز پہنچکر
مقام کیا، راہ مین بارش کی وجہ سے اسباب اور کپڑے نم ہوگئے
تھے صندوق کھلواکر کپڑے دھوپ مین پھیلا دیے، ابوالحسن سوسی
کا بیان ہو کہ مین اس وقت موجود تھا، رنگین اور بیش بہا کپڑے میدان
مین پھیلائے گئے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر طرف چمن زار کھل گیا ہو-
متنبی کی دولتمندی کی خبر عام ہوئی تو بدویون کا سردار
فاتک اسدی آیا اور متنبی سے کہا کہ آگے راستہ بہت پرخطر ہی
اگر ارشاد ہو تو میرے قبیلہ کے آدمی حضور کے ہمراہ جائین،
حضور اُن کو کچھ انعام دلادین - متنبی کو اپنی شجاعت و سپہگری
پہ ناز تھا، اس کے ساتھ وہ نہایت بخیل اور حریص بھی تھا،

تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھا، اور کہا کہ جب تک یہ میرے ہاتھ میں ہو، میں آسمان کے نیچے کسی کی پروا نہیں کرتا، فاتک اٹھکر چلا آیا، اور ساٹھ ستر آدمی لیکر ایک کمین گاہ میں چھپ کر بیٹھا، متنبی سامنے سے گزرا تو دفعتہً حملہ آور ہوا، متنبی دیر تک لڑتا رہا۔ لیکن ایک آدمی جماعت کثیر کا کیا مقابلہ کرسکتا تھا، شکست کھائی اور چاہا کہ جان بچاکر نکل جائے۔ متنبی کے غلام نے کہا کہ آپ کا وہ شعر کیا ہوا

الخيل والليل والبيداء تعرفني	والحرب والضرب والقرطاس والقلم
مجھکو گھوڑے، راتیں، صحرا	جنگ و جدل، کاغذ اور قلم سب پہچانتے ہیں

متنبی نے کہا ہاں خوب یاد دلایا، یہ کہکر پلٹا اور لڑکر مارا گیا۔

اس قسم کا موقع ایران کے مشہور شاعر انوری کو بھی پیش آیا تھا، یعنی راستہ میں چوروں نے آلیا تھا، انوری کے ساتھ ایک درزی اور ایک حکیم صاحب بھی تھے، سب جان بچاکر بھاگے۔ انوری نے اس واقعہ کو خود لکھا ہو اور معذرت یہ کی ہو کہ (مصرع)

حکیم و شاعر و درزی چگونہ جنگ کند !!
بعض مورخوں نے لکھا ہو کہ فاتک اسدی کی دشمنی کی یہ وجہ تھی کہ متنبی نے قبیلۂ بنوضبہ کی ہجو لکھی تھی ۔ بہرحال جوکچھ ہو فاتک کی ناقدردانی نے ایک ایسے شخص کو کھودیا جس کا جواب اُس وقت سے آج تک نہ پیدا ہوسکا ۔

متنبی کے ساتھ اُس کا بیٹا اور غلام بھی ماراگیا ۔ اور اُس کی بے شمار دولت بے رحم غارتگروں کے ہاتھ آئی ؛

نہ مرغانِ حرم در کامِ زاغان طعمہ اندازد
مدارِ روزگارِ سفلہ پرور را تماشا کن

(باقی آیندہ)

اعجاز القرآن

مسلمانون کا اعتقاد ہو کہ قرآن شریف الفاظ و معانی دونون حیثیتون سے معجزہ ہو، ایسا معجزہ کہ دنیا مین بڑے بڑے ادیب ہوے لیکن دوچار فقرون کے نشست الفاظ مین بھی وہ زور نہ پیدا کرسکے جو قرآن کے ایک ایک لفظ ایک ایک آیت مین موجود ہو۔ مسلمانون مین جب علم تھا تو قرآن کے وجوہ اعجاز پہ تفصیل سے بحث کی جاتی تھی، اور خاص اعجاز القرآن کا ایک فن مرتب ہوگیا تھا، جس مین اکثر اہل علم طبع آزمائی کرتے تھے۔ عرب مین اس فن کی جو کتابین مشہور تھین، اُن مین ابوبکر بن کامل کی کتاب موجز التاویل عن معجز التنزیل، احمد بن علی مہرجانی کی جوابات القرآن، ابو عبید کی کتاب المجاز، جاحظ کی نظم القرآن، محمد بن یزید واسطی کی اعجاز القرآن، ابن اخشید کی نظم القرآن، ابو مقسم کی کتاب الانوار، حسن بن جعفر برجلی کی کتاب البیان، ابو علی حسن بن علی بن نصر کی نظم القرآن، ابن جنید کی الامثال فی القرآن

اور شریف مرتضیٰ کی معجز القرآن کا خاص رتبہ تھا، لیکن اب ان کتابوں کا نام ہی نام رہ گیا ہے۔ دنیا میں بہت تھوڑے باکمال ایسے ہیں جو بتا سکیں کہ قرآن کی وہ کیا خصوصیتیں ہیں جن کی بنا پر اُس کو معجزہ کہہ سکتے ہیں۔

قرآن میں اعجاز کی بہت سی صورتیں ہیں، اور خدا نے چاہا تو الندوہ کے مختلف نمبروں میں، میں ان سب پر بحث کرونگا، لیکن یہ مضمون خشک ہوگا اور انتہائی متانت کا پہلو لیے ہوئے، ضرورت ہے کہ پہلے ناظرین کے مذاق کا اندازہ کرلیا جائے اور اس نمبر میں صرف ایک دو معمولی باتیں لکھی جائیں۔

یہ باتیں زیادہ تر نصر بن محمد بن محمد بن عبدالکریم کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ یہ شخص سلطان صلاح الدین یوسف کے عہد میں تھا، اور ملک الافضل و ملک العادل کا میر منشی تھا۔ فن اعجاز القرآن میں اُس کو خاص مناسبت تھی اور اس باب میں اُس کو اپنی نکتہ سنجی پر فخر تھا[1]۔

وہ لکھتا ہے کہ بلاغت کی ابتدائی حد یہ ہے کہ جتنے الفاظ مستعمل ہوں، اُن میں کوئی مبتذل اور نامانوس نہو۔ لیکن اس قید کی کلیۃً پابندی آج تک کسی سے نہوسکی۔ مثلاً "لقالق" کا لفظ نہایت مبتذل ہے، لیکن متنبی لکھتا ہے "یصیح الحصا فیہا صیاح اللقالق"۔

---

[1] المثل السائر۔ مطبوعہ ایران۔ سنہ ۱۲۸۲ھ۔ صفحہ ۹۸۔

"مندف" ایک بازاری اصطلاح ہو لیکن فرزدق کہتا ہو "علی عرواتِ البیت قطن مندف"۔ "مناجر" عامی لفظ ہو لیکن بحتری کہتا ہو "ام صبغت بعدی بالمناجر"۔ "قطار" اور "شطارہ" سوقیون کی بول چال ہو لیکن ابونواس کہتا ہو "بالجہل ازرت صحبۃ الشطار"۔ اینٹ کے معنی مین عربی مین کئی لفظ ہین، آجر، آجور، قرمد، قرمید، اور طوب، لیکن ان سب مین ابتذال اور غرابت ہو، پھر بھی نابغۂ ذبیانی کہتا ہو

	او دمیۃ فی مرمر مرفوعۃ		بنیت بآجر یشاد بقرمد	

قرآن کی بلاغت دیکھو، اسی اینٹ کے استعمال کی ضرورت پڑی تو ارشاد ہوا "فَاَوْقِدْ لِیْ یَا هَامَانُ عَلَی الطِّیْنِ" نامانوس الفاظ چھوڑ دیے اور وقود علی الطین سے کیا بات پیدا کرلی۔ ایک اور مقام پر بیان یہ کرنا ہو کہ ہاتھ اور پاؤن اور جتنے اعضا ہین سب اپنے اپنے گناہون کا اقرار کرینگے اور بدکارون کے اعضای تناسل بھی زنا کی گواہی دینگے۔ بیان واقعہ مین اعضای تناسل کا تذکرہ ضروری بھی ہو اور شرمناک بھی، لیکن دیکھنا کس لطافت سے یہ عقدہ حل ہوا ہو: "وَیَوْمَ یُحْشَرُ اَعْدَاۗءُ اللّٰهِ اِلَی النَّارِ فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ ۝ حَتّٰۗی اِذَا مَا جَاۗءُوْهَا شَهِدَ عَلَیْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝" لفظ جلود مین سارا مطلب آگیا اور کس تہذیب سے۔

بعض الفاظ مانوس بھی ہوتے ہین اور فصیح بھی لیکن

ترکیب میں نامانوس ہوجاتے ہیں - مثلاً شریف رضی کہتے ہیں :

	اعزز علی بان اراک وقد خلا		عن جانبیک مقاعد العواد	

اس میں مقاعد کا لفظ بھی فصیح ہے اور عواد بھی ، لیکن مقاعد العواد کی ترکیب نے شعر کو مبتذل کردیا - اب دیکھو یہی لفظ قرآن میں دوجگہ آیا ہے - ایک وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ اور دوسرے وَاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ - جملۂ ترکیبی یہان بھی ہے لیکن کس قدر فصیح و بلیغ ہے شعر مذکورہ میں بھی اگر بجاے مقاعد العواد کے مقاعد الزیارۃ ہوتا تو اتنا ثقل نہوتا -

قرآن میں ترکیب الفاظ ایک خاص طرز پر واقع ہے - اور بڑی بلاغت یہ ہے کہ ایک معنی کے دولفظ ہیں اور دونون دومقام پر مستعمل ہوے ہیں لیکن نشست بدل دی جائے تو عبارت یون ہی سی رہجاتی ہے - مثلاً مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ اور رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا - یہ دونون دوآیتین ہیں - ایک مین جوف کا لفظ ہے اور دوسری مین بطن کا اور معنی دونون کے ایک ہیں - لیکن اگر پہلی آیت مین جوف کو بدل کر بطن اور دوسری مین جوف کا استعمال ہو تو عبارت بلاغت سے گرجائیگی - اسی طرح فواد اور قلب دونون قریباً ایک ہین اور قرآن مین دونون دومختلف مقامات مین مستعمل ہوے

ہین- ایک مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى اور دوسرے اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ
كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ لیکن مقام تبدیل ہوجائے تو
پھر کوئی بات نہین رہتی- جو لفظ جہان آیا ہے وہین کے لیے موزون
ہے- ذرا بھی تبدّل و تغیّر ہوا اور کلام کی روانی مین فرق آیا-

شہد جسے فارسی مین انگبین کہتے ہین عربی مین اُسے
شہد بھی کہتے ہین اور عسل بھی، اور یہ دونون لفظ فصیح ہین،
لیکن عسل مین شہد سے زیادہ شیرینی ہے- قرآن مین بھی عسل ہی
وارد ہے اور اعرج جاہلی نے بھی عسل ہی لکھا ہے (الموت احلٰے
عندنا من العسل) متنبی نے شہد کا لفظ استعمال کیا ہے (رجال
کان الموت فی فمہا شہد) لیکن یہ شہد اعرج کے عسل سے زیادہ میٹھا
اور بامزہ ہے- الفاظ وہی ہین لیکن قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ استعمال
سے شاندار ہوجاتے ہین-

حقیقت مین یہ امر انسان کی قدرت سے باہر ہے کہ جو بات
کہے دلنشین ہو، جو لفظ بولے خوش آیند ہو، فطرت کا اقتضا یہی ہے
کہ کبھی نہ کبھی کُلیہ ٹوٹ جائے اور کسی نہ کسی وقت طبعی کمزوری بھی سامنے
آئے- یہ شان خدا ہی کے کلام مین ہے کہ جو لفظ ہے، جو جملہ ہے، جو آیت ہے
سب ایک رنگ مین رنگے ہوے- صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً
دیکھو ایک معمولی لفظ "یؤذی" قرآن مین آیا ہے: فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا
وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِى النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ

کلا ستحیی من الحق۔ یہی لفظ متنبی نے بھی استعمال کیا ہے:

تلذ له المروأة وهی تؤذی		ومن یعشق یلذ له الغرام		

شعر میں مضمون کس قدر بلند ہے، لیکن وہی لفظ جو آیت میں دل آویز تھا شعر میں اس کی ترکیب بگڑ گئی۔ سبب یہ ہے کہ اس لفظ کا موقع استعمال یہ ہے کہ اپنے ما بعد کے ساتھ مندرج اور متعلق ہو جیسا کہ قرآن میں ہے إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ۔ متنبی نے اس کو منقطع استعمال کیا ہے اور کلام کو مستانف کر دیا ہے اس لیے لطافت نہیں رہ گئی۔ یوں ہی قرآن میں ہے: إِنَّ هَٰذَا أَخِي لَهُ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ نَعْجَةً وَلِيَ نَعْجَةٌ وَاحِدَةٌ۔ اس میں لفظ "لِيَ" متعلق ما بعد ہے اور فصیح ہے، یہی لفظ شعر میں منقطع آیا ہے اور فصاحت سے گر گیا ہے۔

تمسی الامانی صرعی دون مبلغہ		فما یقول لشیء ان ذلک لی		

اسی طرح لفظ "قمل" قرآن میں بھی آیا ہے اور فرزدق کے شعر میں بھی۔ قرآن میں فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ آيَاتٍ مُّفَصَّلَاتٍ اور شعر میں ہے:

من عزه احتجرت کلیب عندہ		زرباً کانہم لدیہ القمل		

آیت میں ایک کلام کے ضمن میں وارد ہوا ہے اور کلام وہاں منقطع نہیں ہے لہذا فصیح ہے اور شعر میں قافیہ یعنی مقطع کلام میں آیا ہے لہذا غیر فصیح ہے۔ ایک بات اس آیت میں اور بھی قابل غور ہے کہ اس میں پانچ لفظ آئے ہیں، طوفان، جراد، قمل، ضفادع، اور دم۔ ان میں طوفان جراد، اور دم کے الفاظ دلکش ہیں اور قمل و ضفادع معمولی

قرآن مین ان پانچون کو ایک آیت مین لانا ہوا تو یون لائے کہ طوفان وجراد وغیرہ لفظون سے ابتدا کی کہ پہلے پہل سننے مین بھلے معلوم ہون اور دم آخر مین لائے کہ خاتمہ بھی بخیر وخوبی ہو۔ لفظ دم مین ایک بات یہ بھی ہو کہ اور الفاظ سے سبک ہو، اُس کے آخر مین لانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس سے قمل و ضفادع کے ثقل کی تلافی ہوجائے۔ چند الفاظ کی نشست مین اس قدر بلاغت کا لحاظ انسانی طاقت کا کام نہین ہو۔

بعض الفاظ فی نفسہ ثقیل ہوتے ہین اور شعرا اُن کے استعمال مین بسا اوقات مجبور ہوتے ہین، مگر قرآن مین استعمال کی ضرورت ہوتی ہو تو خفیف تغیر سے وہی لفظ سبک اور مانوس ہوجاتا ہو۔ مثلاً لفظ "ودع" کہ فعل ماضی ثلاثی ہو اور ثقیل نہین، لیکن اگر کسی جملہ مین بصیغۂ ماضی مستعمل ہو تو ثقل پیدا ہوجاتا ہو ابو العتاہیہ کہتا ہو:

اثروا فلم یدخلوا قبورهم	شیئا من الثروة التی جمعوا
وکان ما قدموا لانفسهم	اعظم نفعا من الذی ودعوا

قرآن مین اس لفظ کی ضرورت ہوئی تو ثقالت اس طرح پر رفع کی گئی کہ بجاے ماضی کے امر کا صیغہ استعمال کیا گیا وَدَعْ أَذٰهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ۔ یون ہی لفظ "وذر" ہو کہ اگر ماضی استعمال ہو تو نہایت گرانی ہوگی، لیکن قرآن مین بصیغۂ امر و مستقبل استعمال ہوا ہو اور فصیح ہو (ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا - اور سَأُصْلِيهِ سَقَرَ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرُ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ)

بعض الفاظ ہین تو فصیح لیکن صیغۂ واحد سے صیغۂ جمع مین بلاغت زائد

نده

ملی ہو۔ قرآن مین ایسے الفاظ ہمیشہ بصیغۂ جمع استعمال ہوے۔ جیسے لفظ "لب"
یعنی عقل کہ وزن مین ثلاثی ہو، بولنے مین سبک ہو، مخرج کے حروف بھی
بعید ہین اور ثقیل و مکروہ بھی نہین۔ اس کی جمع "الباب" ہو۔ اور اس مین
زیادہ حلاوت ہو اور قرآن مین بھی جہان آیا ہو یہی لفظ آیا ہو (وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ
إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ) لفظ "کوب" بھی مانوس ہو لیکن اس کی جمع
"اکواب" زیادہ فصیح ہو اور قرآن مین بھی اسی کا استعمال ہوا ہو وَأَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ
کنارے کے معنی مین "رجا" کا لفظ اچھا ہو اور بحالتِ اضافت فصیح بھی ہو۔
قرآن مین بصیغۂ جمع (ارجاء) استعمال ہوا ہو اور دیکھنا کیسی لطافت آگئی ہو وَالْمَلَكُ
عَلَىٰ أَرْجَائِهَا ۚ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ

بعض الفاظ صیغۂ واحد ہی مین فصیح ہین، جمع مین فصاحت نہین رہتی۔
قرآن مین جب استعمال ہوے بصیغۂ واحد استعمال ہوے۔ مثلاً لفظ "بقعہ"
فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ مِن شَاطِئِ الْوَادِ الْأَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ أَن يَا مُوسَىٰ إِنِّي أَنَا
اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ۔ بقعہ کی جمع بقاع ہو، بقاع کا استعمال چندان فصیح نہین، اگر
ضرورت ہو تو باضافت لانا چاہیے جیسے بقاع الارض۔ ارض کا لفظ قرآن مین
بہت آیا ہو، اور سماوات (جمع سما) کے ساتھ آیا ہو۔ مگر تمام مفرد، جمع کہین نہین۔
ارض کی جمع اراضی و ارضین دونون غیر فصیح ہین، پھر کیونکر ممکن تھا کہ قرآن مین
ان کو جگہ ملے۔ اعجاز بلاغت یہ ہو کہ جب جمع لانے کی ضرورت ہوئی تو ارشاد ہوا
اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ۔

خادم قوم۔ عبداللہ عمادی۔

[illegible] دار العلوم من ابتدائے کیم ربیع الاول ۱۳۲۳ھ لغایت سلخ ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ

نمبر	اسمائے	تعداد رقم	
۱	[illegible] علی خان صاحب مہتمم [illegible] - قائم گنج - فرخ آباد۔	صہ ر	
۲	حافظ نظیر حسین صاحب - فرخ آباد۔	۴ ر	
۳	اصغری بی معرفت حافظ نظیر حسین صاحب۔	۴ ر	
۴	مولوی محمود علی صاحب پروفیسر رندھیر کالج - کپورتھلہ۔	۶ ر	
میزان	ل	[illegible]	

اسمائے گرامی چندہ دہندگان ندوۃ العلماء من ابتدائے کیم ربیع الاول ۱۳۲۳ھ لغایت ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ

۱	منشی منصور علی خان صاحب اسٹیشن ماسٹر مال گودام۔	عہ	
۲	منشی علی احمد صاحب - بی۔ اے - محمد آباد - اعظم گڑھ۔	صہ ر	
۳	حکیم محمد سلیمن صاحب خلف حکیم ذکریا بیگ صاحب ریاست الور۔	۶ ر	
۴	مولوی رستم علی خان صاحب - ادیب - فرخ آباد۔	۶ ر	
۵	حافظ عبد الرحیم خان صاحب - امان آباد - فرخ آباد۔	۶ ر	
۶	حافظ نظیر حسین صاحب محلہ صوفی خان - فرخ آباد۔	۶ ر	
۷	مولوی حبیب اللہ صاحب مترجم جوڈیشل کورٹ - لکھنؤ۔	۶ ر	
۸	مولوی محمود علی صاحب پروفیسر رندھیر کالج - کپورتھلہ۔	۶ ر	
میزان	ل	[illegible]	

اسمائے گرامی چندہ دہندگان "خزانۂ محمدیہ" من ابتدائے کیم ربیع الاول ۱۳۲۳ھ لغایت ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ

۱	جناب محمد جان صاحب - فرخ آباد۔	۸ ر	
۲	منشی محمد عزیز حسین صاحب مرحوم۔	؎ ر	
میزان	ل	[illegible]	

دستور العمل

(۱) اس رسالہ کو ملکی معاملات سے کبھی سروکار نہ ہوگا۔

(۲) اس رسالہ کی آمدنی کسی کی ملک نہ ہوگی، بلکہ اسی رسالہ کی ترقی، یا ندوۃ العلما کے تعلیمی صیغہ مین صرف ہوگی۔

(۳) اس رسالہ کا مقصد علوم اسلامیہ کا احیاء اور علوم قدیمہ و جدیدہ کا موازنہ ہے، اسکے ساتھ حسب ذیل مضامین ہونگے۔

(۱) عربی زبان کی نادر الوجود کتابون پر تقریظ و تنقید۔

(۲) ممالک اسلامیہ مین آجکل جو کتابین لکھی جا رہی ہین اُنپر تقریظ۔

(۳) اکابر سلف کی سوانح عمریان جسمین زیادہ تر اُن کے اجتہادات سے بحث ہوگی۔

(۴) نصاب تعلیم مروجہ پر بحث۔

(۵) ندوۃ العلما کے متعلق حالات۔

(۶) علمی خبرین۔

(۴) چونکہ دقیق مضامین سے عام لوگون کو دلچسپی نہین ہوسکتی اس لیے ہر پرچہ مین ایک دو دقیق مضامین اور باقی عام فہم اور آسان ہونگے۔

(۵) قیمت سالانہ پیشگی مع محصول دو روپیہ۔(عہ) ۔

(۶) کل خط و کتابت، منیجر رسالہ کے نام "دفتر ندوۃ العلما۔ لکھنؤ" کے پتہ سے کی جائے۔ اور روپیہ بھی اسی پتہ سے بھیجا جائے۔

(۷) جسکے پاس کسی مہینے مین رسالہ نہ پہنچے، تو اُسی مہینے مین اسکی اطلاع دینی چاہیے ورنہ تعمیل نہ ہوسکے گی۔

(۸) جو صاحب خط لکھین وہ اپنا نام صاف و واضح خط مین لکھین۔ اور قیدک کا نمبر بھی ضرور درج کردین۔

سید عبدالحی
منیجر رسالہ۔

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

الندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتب

سید ابوالحسن علی ندوی

استاذ تفسیر و ادب

عبدالسلام قدوائی ندوی

استاذ تاریخ و اقتصادیات

الندوہ

زیرِ نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۲ ربیع الاول ۱۳۶۰ھ مطابق اپریل ۱۹۴۱ء نمبر ۴

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپیہ

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر بنام "منیجر الندوہ" بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہئے

شذرات

پچھلے مہینہ کا یہ حادثہ پریس میں آ چکا تھا کہ سر شاہ محمد سلیمان جج فیڈرل کورٹ وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ
نے انتقال کیا، ڈاکٹر سر شاہ سلیمان مرحوم کی قانونی واقفیت، عدالتی مہارت، معاملہ فہمی، نکتہ سنجی اور قوت فیصلہ کسی محتاج
تعارف نہیں، ایک مدت تک الہ آباد ہائی کورٹ میں بحیثیت جج کے فرائض انجام دئیے پھر دلی کی وفاقی عدالت میں جج
منتخب ہوئے اور آخر تک اس عہدہ پر فائز رہے، ان سرکاری فرائض کے علاوہ قومی و ملی معاملات سے بھی دلچسپی تھی،
مسلم یونیورسٹی سے خاص تعلق تھا، کئی برس تک اس کے وائس چانسلر رہے اور بڑی مستعدی و خوش اسلوبی سے اپنے
فرائض انجام دئیے، علمی مباحث کا بہت شوق تھا، اس سلسلہ میں آئنسٹائن کے نظریۂ اضافت کی تردید ان کا خاص کارنامہ
ہے، ان خوبیوں کے ساتھ بجد خلیق و متواضع تھے، دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے سرفراز فرمائے
اور قوم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

۱۹۲۷ء میں ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس امرتسر میں منعقد ہوا تھا اس کے بعد ملک میں حالات کی رفتار
کچھ ایسی رہی کہ پھر کوئی جلسہ نہ ہو سکا، اس عرصہ میں کئی بار کوششیں کی گئیں لیکن کامیابی نہ ہو سکی، ندوہ کے
ہمدردوں کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ اجلاس عام کے انعقاد کی پھر فکریں ہو رہی ہیں، اس سلسلہ میں مجلس منتظمہ نے ایک کمیٹی
مقرر کی ہے جو نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں صاحب شروانی، جناب منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری
مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، مولانا مسعود علی صاحب ندوی اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی پر مشتمل ہے، ہمیں امید ہے
کہ ملک کے علم دوست، صاحب اثر اور ذی حیثیت اصحاب اس مبارک کام میں کمیٹی کے ارکان کو مدد دیں گے۔

مجلس منتظمہ کے اس جلسہ میں نئے اور پرانے متعدد ارکان کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس موقع پر ندوہ کے پرانے

کارکنوں کی خدمت میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ ان کی ساری زندگیاں اس تحریک کو پروان چڑھانے میں بسر ہوتی ہیں البتہ ان بزرگوں اور دوستوں سے گزارش ہے جو پہلی مرتبہ اس منصب کے لئے منتخب ہوئے ہیں کہ وہ ندوہ کے کاموں کو اپنا کام سمجھیں اس کی خدمت اپنی زندگی کا مقصد قرار دے لیں اور جہاں تک بن پڑے اس تحریک کو آگے بڑھانے کی جدوجہد کریں ندوہ کے مقاصد کی صداقت اب روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے اب حقیقت محتاج دلیل نہیں کہ دین و دنیا کی ہم آمیزی ہی سے وہ اکسیر تیار ہو سکتی ہے جس پر مسلمانوں کے امراض مزمن کی شفا یابی منحصر ہے۔

ندوہ کی یہ اہمیت صرف مسلمانوں ہی کی نظر میں نہیں ہے بلکہ اغیار و اجانب بھی اس کی ان خصوصیات کے معترف ہیں ابھی کچھ عرصہ ہوا برسٹل یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ڈاکٹر ولیس اولیری (RAIISO LLCRT.) نے اسلام ایٹ دی کراس روڈ (ISLAM AT THE CROSS ROAD) کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اس میں انہوں نے مغربی خیالات و رجحانات کے خلاف ردعمل کا ذکر کرتے ہوئے ندوۃ العلماء اور اس کے رسالہ کا بھی ذکر کیا ہے ڈاکٹر صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ:۔

سنہ ۱۸۹۴ء میں اسی قسم کی ایک تبلیغی مجلس ندوۃ العلماء کے نام سے لکھنؤ میں قائم ہوئی اور اپنا تبلیغی رسالہ بھی نکالا سنہ ۱۹۰۸ء میں اس انجمن نے ایک متعین تعلیمی نظام اختیار کیا اور دارالعلوم کے نام سے لکھنؤ میں ایک کالج کی بنا رکھی بعد کو مدراس اور شاہجہاں پور میں اس کی تعلیمی شاخیں قائم ہوئیں یہ کالج ایک طرف مغربی انداز اور جدید طرز کی بہترین خصوصیات کا حامل ہے اور دوسری طرف اپنی مذہبی تعلیمات میں پورا پورا مسلمان ہے یہ ادارہ اسلامی خیالات کی نشر و اشاعت کی غرض سے بہترین مبلغ تیار کرتا ہے جو مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں پر کافی اثر رکھتے ہیں

لہ غالباً اس سے مبین الندوہ کے مبلغ مراد ہیں۔

میری محسن کتابیں

(از جناب میاں بشیر احمد صاحب بی اے آکسن مدیر ہمایوں)

یہ ایک بہت مشکل سوال ہے کہ کونسی کتابیں میری محسن ہیں؟

کونسی کتاب ہے جو میں نے پڑھی ہو اور جس کا احسان میرے سر پر نہیں۔ وہ بری ہو یا بھلی ہو لازم ہے کہ اس نے مجھ پر کچھ نہ کچھ اثر چھوڑا ہوگا۔ پھر ایسی بھی بہت سی ہونگی جنھیں یاد کرنے پر اُن کے اثرات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن میں یہاں صرف دو چار کتابوں کا ذکر کروں گا جو اس عنوان کو دیکھکر مجھے فوراً یاد آگئیں۔

وہ کتاب جس نے اوائل عمر میں مجھ پر سب سے زیادہ اثر ڈالا شبلی کی الفاروق تھی۔ اسلام تاریخ کہانی سیاست داستان سبھی اس میں سب کچھ تھا۔ گویا اوائل عمر میں مجھے ایک رہنما مل گیا میں نے جانا بس یہی اسلام ہے۔ برسوں گزر گئے کئی مرتبہ الحاد نے کامیابی کے ساتھ میرے دماغ پر حملہ کیا لیکن دل جس الفاروقی رنگ میں پہلی عمر میں رنگا جا چکا تھا وہ رنگ کچھ نہ کچھ ہمیشہ باقی رہا۔ ایک تو عمر ایسی تھی کہ جو اثر پڑا وہ مٹ نہ سکا اور دوسرے کتاب بھی ایسی عظیم الشان تھی کہ جب میرے ایک دہلوی ادیب دوست نے اس پر چند سال ہوئے نکتہ چینی کی تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا مجھ پر ذاتی حملہ کیا گیا ہے۔ سیرۃ النبی پڑھنے کے بعد بھی میری پسند کی کتاب الفاروق ہی رہی۔ حضرت عمرؓ کا وہ صحرا میں اپنے غلام کو اونٹ پر بٹھا کر اُس کے آگے آگے چلنا وہ راتوں کو گشت کرنا۔ وہ ایک بڑھیا کا دلیری سے کہنا اتق اللہ یا عمرؓ، اسلام کا وہ دو بڑی سلطنتوں پر چھا جانا ان کا اثر آج تک طبیعت سے زائل نہیں ہوا۔

پھر انگلستان سے واپس آکر مجھے خوب یاد ہے کہ جتنا لا ادریت نے میرے دماغ پر قابو پایا اتنا ہی میرا یہ معمول ہو گیا کہ ہر روز صبح کو قرآن مجید (عربی میں) دس منٹ اور دیوانِ حافظ دس منٹ پڑھا کرتا۔

کارلائل کی "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" بھی "محمد" والا مقالہ بھی بے حد پسند تھا چنانچہ آکسفورڈ میں جب میں نے ایک تاریخی مقالہ لکھا اور اُس میں کارلائل کے اس مقالے سے ایک اقتباس دیا تو میرے انگریز پروفیسر کو وہ اتنا پسند آیا کہ اُس نے کہا کسی طرح اسے اپنے آخری امتحان میں بھی درج کرنا میں نے ایسا ہی کیا اُس مقالے کے جملے مجھے ابھی تک یاد ہیں۔

میری یہ ایک عجیب عادت تھی کہ جو کتاب مجھے بہت پسند آتی اسے نا تمام چھوڑ دیتا۔ دیوانِ حافظ میں نے ایک ماہ میں آدھا پڑھا، اتنا پسند آیا کہ اُس کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا۔ باقی ماندہ دیوان کا اکثر حصہ میں نے آج تک نہیں پڑھا میں نے بہت کم ناولیں پڑھی ہیں لیکن وکٹر ہیوگو کی مشہور ناول "لے مزرابل" (LES MISERABLES) مجھے اتنی پسند آئی کہ میں نے اُسے بار با تھوڑا تھوڑا پڑھ کر چھوڑ دیا یہاں تک کہ شروع کرنے کے سترہ سال بعد اُسے ختم کیا۔ میں اُسے دنیا کی بہترین کتابوں میں شمار کرتا ہوں۔

حال ہی میں نے ایک کتاب " IBELIVE " (میرا عقیدہ) پڑھی ہے جو مجھے بہت پسند آئی ہے۔ اس میں دنیا کے چند بڑے مفکرین نے اپنے ذاتی عقیدے بیان کئے ہیں اکثر عقیدے لا ادریت یا دہریت سے ملتے جلتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر کسی کا ایمان الحاد کے حملے کے بعد قائم نہیں رہ سکتا تو وہ زندہ رہنے کے قابل نہیں۔

(نوٹ) رسالہ عموماً ہر مہینے کی ۲۰ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے، نہ پہونچنے کی صورت میں اسی مہینہ کی آخری تاریخ تک دفتر میں اطلاع دیکر منگالینا چاہئے ورنہ دفتر تعمیل سے قاصر رہے گا اور قیمت بھیجنے پر رسالہ روانہ کیا جا سکے گا،

"منیجر"

شیراز ہند پورب

(۳)

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی

ملا قطب الدین سہالوی | یہ وہ زمانہ تھا کہ شہر تو شہر چھوٹے قصبات تک دارالعلم تھے۔ ملا قطب الدین سہالوی نے سہالی میں اپنی درسگاہ ترتیب دی۔ اور جوق جوق طلبہ دیار دیار اطراف سے آنے لگے یہاں تک کہ زمینداری کے جھگڑے میں سہالی کے عثمانی شیوخ اور فتح پور کے نامزادوں کے ہاتھوں سے شہادت پائی۔

ملا قطب الدین شمس آبادی | ملا صاحب کے مطلع درس سے ایک آفتاب چمکا جس کا نام سید قطب الدین شمس آبادی ہے۔ سید موصوف اصل میں امیٹھی کے رہنے والے تھے جو اودھ کا مشہور قصبہ ہے تعلیم سے فراغت کے بعد سید قطب نے امیٹھی کے بجائے شمس آباد کو اپنا مرکز بنایا۔ شمس آباد قنوج کے پاس ہے آزاد لکھتے ہیں۔

و در شمس آباد مسند افادہ گستردہ جمّ غفیر از طلبہ افاضہ دانش و بینش مرتبۂ کمال و تکمیل

کرامت نمود (مآثر الکرام ص ۲۱۰)

شمس آباد کا یہ آفتاب ۱۱۲۱ھ میں غروب ہو گیا۔

ملا محب اللہ بہاری | اس جمِ غفیر میں جو ملا شمس آبادی کی دانشگاہ سے مرتبۂ کمال کو پہونچے ایک نامور خطۂ پورب سے آکر شامل ہوا یعنی بہار کے ایک گاؤں کڑہ محب علی پور سے دنیا اس نامور کو قاضی محب اللہ بہاری مصنف مسلم و سلم کے نام سے پہچانتی ہے تکمیل کے بعد یہ لکھنؤ کے قاضی مقرر ہوئے۔ یہ عالمگیر کا زمانہ تھا محمد معظم شاہ عالم اول کے زمانہ میں ہندوستان کے صدر جہاں مقرر ہوئے ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی۔ اور شیخ فریدالدین طویلہ بخش کے مزار کے احاطہ میں بہار کے محلہ چاند پورہ میں دفن ہوئے۔ بعض صاحبوں نے ملا محب اللہ کو خود ملا قطب الدین سہالوی کا شاگرد بتایا[1] ہے۔

۱؎ حاشیہ شرح ملا حسن از مولوی عبدالحکیم لکھنوی

حافظ امان اللہ بنارسی | قاضی محب اللہ بہاری کے ایک ہمعصر امامِ وقت تھے۔ ان کا نام حافظ امان اللہ بن نور اللہ بن حسین ہے۔ بنارس وطن تھا۔ ملا قطب الدین سہالوی اور دوسرے مشاہیرِ زمانہ سے درس لیکر فارغ ہوئے تو عالمگیر نے ان کو لکھنؤ میں مفتی کا منصب دیا۔ حافظ صاحب کا یہ مرتبہ تھا کہ ملا محمود جونپوری نے ملا باقر داماد استرآبادی کے خلاف جو رسالہ لکھا تھا حافظ صاحب نے دونوں کے درمیان محاکمہ لکھا ہے۔ شاہ خوب اللہ الٰہ آبادی کے وہ ایسے مرید تھے جن پر خود پیر کو فخر تھا۔ ۱۱۳۳ھ میں بنارس میں وفات پائی۔ انکی خانقاہ، مدرسہ اور مسجد بنارس میں اب تک یادگار ہے۔ اور میں نے اسکی زیارت کی ہے۔

ملا نظام الدین فرنگی محلی | ملا قطب الدین کی شہادت کے بعد شاہ عالمگیر نے ان کی اولاد کو لکھنؤ میں شاہی مقبوضات میں سے ایک بڑا مکان مرحمت کیا جس میں کبھی ایک فرنگی سوداگر رہا کرتا تھا۔ اور اسی مناسبت سے فرنگی محل کہلاتا تھا۔ یہی فرنگی محل ہے جو آگے چل کر پورب کا سب سے بڑا دار العلوم بنا۔

ملا قطب الدین کے کئی صاحبزادے تھے۔ مگر ان میں سب سے نامور ملا نظام الدین ہوئے جنکی نسبت عربی کا درس نظامی مشہور ہے۔ موصوف کا سب سے پہلا چشمۂ فیض خود انکے والد ماجد کا آغوش تربیت تھا۔ باپ کی شہادت کے بعد پورب کے متعدد علماء کے فیوض و برکات کو اپنے دامن میں سمیٹا۔ اپنے والد کے شاگرد ملا قطب الدین شمس آبادی سے پھر حافظ امان اللہ بنارسی سے پڑھا۔ اور آخری تکمیل شیخ غلام نقشبند لکھنوی سے حاصل کی جو شاہ پیر محمد صاحبؒ کے شاگرد اور مرید تھے۔ ان تمام نسبتوں پر اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ملا نظام الدین کی ذات گرامی میں پورب کے تمام مستند سلسلے آکر جمع ہو گئے یہی سبب ہے کہ پورب کا گوشہ گوشہ انکے چشمۂ فیض سے سیراب ہوا۔ میر آزاد بلگرامی جو ملا صاحب کے ہمعصر ہیں اپنے تذکرہ ماثر الکرام میں لکھتے ہیں۔

"و تمام عمر بہ تدریس و تصنیف اشتغال ورزید۔ و اعتبار و اشتہار عظیم یافت
امروز علمائے اکثر قطر ہندوستان تلمذ بمولوی دارند۔ و کلاہ گوشۂ افتخار می شکنند"

وکسے کہ سلسلۂ تلمذ بادمی رساند بین الفضلا علم امتیاز می افزاید و مردم بسیار را
دیدہ شد کہ تحصیل جاہائے دیگر کردہ اند۔ و برائے اعتبار خاتمہ فراغ از مولوی
گرفتند

۱۱۶۱ھ میں وفات پائی اور یہی آرامگاہ لکھنؤ ہے۔

مدرسین فرنگی محل | ملا نظام الدین کے زمانہ سے لیکر تقریباً سوڈیڑھ سو سال تک یعنی خاتم العلماء مولانا عبد الحی فرنگی محلی المتوفی ۱۳۰۴ھ تک چشمۂ فیض یکساں جاری رہا اور اب بھی اسکی برکتوں کا سلسلہ بحمد اللہ کہ قائم ہے۔

ملا نظام الدین کے مشہور صاحبزادے ملا عبد العلی ہیں۔ جنکے دم سے یہ چشمۂ فیض دریائے فیض بنگیا اور دنیا نے انکو بحر العلوم کہکر پکارا۔ یہ دریا لکھنؤ سے نکل کر بریلی اور رامپور سے ہوتا خلیج بنگال کے پاس بوہار پہنچا اور وہاں سے مدراس ہوکر بحر ہند کے کناروں سے مل گیا۔ مدراس میں ۱۲۲۵ھ میں وفات پائی۔

ملا قطب الدین سہالوی کے فرزندوں اور فرزندوں کے فرزندوں میں بڑے بڑے نامور پیدا ہوئے جنکے ناموں سے تذکرے بھرے پڑے ہیں۔ ان میں سے ملا حسن۔ ملا مبین۔ ملا کمال الدین وغیرہ مشاہیر روزگار ہیں اور ان میں سے ہر ایک خود ایک مستقل سلسلہ کا بانی ہے۔

ملا کمال الدین اور ملا احمد اللہ | ملا بحر العلوم کے علاوہ ملا نظام الدین کے دو اور با کمال شاگرد ہیں ایک ملا کمال الدین فرنگی محلی المتوفی ۱۱۷۵ھ اور دوسرے ملا احمد اللہ سندیلہ المتوفی ۱۱۶۰ھ یہ ملا احمد اللہ وہی ہیں جنکی کتاب حمد اللہ مشہور ہے۔ انھوں نے سندیلہ میں اپنی درسگاہ جمائی جس سے بہت سے نامور پیدا ہوئے۔

ملا باب اللہ جونپوری اور ملا غلام یحییٰ بہاری | ملا احمد اللہ کے ایک نامور شاگرد ملا باب اللہ جونپوری ہیں اور ملا باب اللہ کے شاگرد ملا غلام یحییٰ بہاری ہیں جن کا حاشیہ غلام یحییٰ بر میر زاہد رسالہ قطبی

جو ریاضت کی آخری منزل ہے۔ اکبر نگر سنہ ضلع پٹنہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اور بہار میں مخدوم شاہ شرف الدین کے احاطۂ مزار میں دفن ہوئے۔ ۱۱۲۰ھ[1] سال وفات ہے۔

سلسلۂ خیرآباد

ملا کمال الدین کے ایک مشہور شاگرد ملا محمد اعلم سندیلوی ہیں فضل وکمال کا یہی وہ نخل بار آور ہے جس سے خیرآباد کی وہ شاخ نکلی ہے جو پھیل کر خود ایک مستقل سلسلہ بن گئی ہے۔ اور جو سلسلۂ خیرآباد کے نام سے مشہور ہے۔ ملا محمد اعلم قصبہ سندیلہ کے شیوخ فاروقی میں ہیں۔ ملا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی کے دو شاگردوں ملا حمد اللہ سندیلوی اور ملا کمال الدین فرنگی محلی سے کسب فیض کیا اور طلبہ کو اپنی تصنیف وتدریس کی دولت سے مالا مال کیا اور بارھویں صدی کے اخیر میں اس دنیا کو الوداع کہا۔ ملا محمد اعلم کے شاگردوں میں انکے بھانجے مولوی سید عبد الواجد خیرآبادی کامل ہوئے اور بعضوں کا بیان ہے کہ ملا محمد اعلم کے شاگرد ملا ارشد تھے اور ملا ارشد کے شاگرد مولوی عبد الواجد خیرآبادی ملا عبد الواجد سے ملا نظام العالم اور ملا نظام العالم سے مولانا فضل امام خیرآبادی نے پڑھا۔ مولانا دہلی میں انگریزوں کی طرف سے صدر الصدور تھے بچوں کا فارسی ابتدائی رسالہ آمدنامہ انہیں کی آمد طبع کا نتیجہ ہے۔ ۱۲۴۳ھ میں وفات پائی۔

مرحوم کے جانشین صاحبزادہ اور شاگرد مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی تھے جن کے دم عیسوی نے معقولات میں وہ روح پھونکی کہ ابن سینائے وقت مشہور ہوئے۔ دیار واطراف سے طلبہ نے انکی طرف رجوع کیا اور منطق وفلسفہ کو نئے طور سے ملک میں رواج دیا۔ شروح وحواشی کی بڑی بڑی کتابیں جو متاخرین کی نتائج طبع تھیں داخل درس ہوئیں فلسفہ میں ہدیہ سعیدیہ نام ایک کتاب عربی طلبہ کی تعلیم کے لئے لکھی اور مقبول عام ہوئی۔ غدر کے ہنگامہ میں گرفتار ہو کر جزیرہ انڈمان کو بھیجے گئے۔ اور وہیں ۱۲۷۸ھ میں وفات پائی۔

مولانا فضل حق خیرآبادی کے تلامذہ اور تلامذہ در تلامذہ نے سارے ملک میں پھیل کر علوم معقول کو بڑی

---

[1] تاریخ علمائے ہند صفحہ ۱۵۹ میں ۱۱۲۳ھ لکھا ہے مگر عجب نہیں کہ ۱۱۲۰ھ ہو۔

کامل مدرس ثابت ہوئے۔ ان بزرگوں میں سے جن ارباب کمال کی درسگاہوں کو خاص شہرت حاصل ہوئی مولانا عبدالحق خیرآبادی خلف الصدق مولانا فضل حق خیرآبادی مولانا برکات احمد بہاری ٹونکی مولانا ہدایت اللہ خاں رامپوری جونپوری۔ مولانا عبدالحق خیرآبادی نے رؤسائے رامپور کی قدردانی سے رامپور کو اپنے فضل و کمال سے منور کیا۔ مولانا برکات احمد صوبہ بہار میں ضلع مونگیر کے ایک گاؤں کے تھے۔ انکے والد حکیم دائم علی صاحب ٹونک جا کر رہ گئے تھے۔ مولانا برکات احمد صاحب نے رئیس ٹونک کی قدرشناسی سے ٹونک کو علم و فن کا مرجع بنایا۔ مولانا ہدایت اللہ خاں رامپور سے جونپور آئے۔ اور مدرسہ شیخ امام بخش میں علم و فضل کی مجلس آراستہ کی۔ ان میں سے ہر ایک کی درسگاہ سے سیکڑوں علما تعلیم پاکر نکلے۔

فرنگی محل کا آخری دور

اس اخیر زمانہ میں بھی فرنگی محل کے دارالعلم میں فضل و کمال کی بیسوں بساطیں بچھی ہیں انھیں میں سے مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی کی درسگاہ ہے مفتی صاحب مفتی محمد اصغر بن مفتی ابوالرحیم صاحب فرنگی محلی کے صاحبزادے اور جانشین تھے۔ انکے والد مفتی محمد اصغر صاحب ملا قطب الدین سہالوی شہید کے صاحبزادہ ملا محمد سعید کے سلسلہ میں تھے۔ اور لکھنؤ میں نوابی کے زمانہ میں سرکار اودھ کے مفتی تھے روز و شب طلبہ کو درس اور ساتھ ہی منصب افتا کی خدمت انجام دیتے۔ جب ۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ کی بساط الٹی تو علم کا مرکز جونپور کے مدرسہ امام بخش میں منتقل ہو گیا یہاں سے وہ حج و زیارت کو حجاز تشریف لے گئے۔ اور وہیں ۱۲۸۶ھ میں ابدی نیند سو گئے۔

مفتی احمد ابوالرحیم کے دوسرے صاحبزادے کا نام مولوی اکبر تھا انکے بیٹے مولوی امین اللہ اور انکے بیٹے مولوی عبدالحلیم فرنگی محلی تھے۔ مولوی عبدالحلیم فرنگی محلی نے اپنے والد اور اپنے خاندان کے دوسرے علما مفتی ظہور اللہ مفتی محمد اصغر مولوی نعمت اللہ اور خصوصاً مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی سے کسب فیض کیا۔ اور یہ شہرت حاصل کی کہ علما نے انکے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ ۱۲۶۳ھ میں نواب ذوالفقار بہادر نواب باندہ کی طلب پر باندہ گئے۔ اور کئی برس رہے۔ وہاں سے واپس آکر جونپور کے مدرسہ امام بخش میں مدرس ہوئے۔ اور نو سال تک

ہو چند شیخ جو دے بندوق رہا۔ ستہ ۱۲ھ میں ایک عالم کو خاتم علم سے معطر فرما کر حیدر آباد میں وفات پائی۔

انہیں کے صاحبزادے مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلی لکھنوی ہیں۔ زیادہ تر علم کی دولت اپنے والد ماجد سے وراثت پائی باندہ میں ۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے دس برس کی عمر میں حافظ ہو کر سب سے پہلے جونپور کی جامع مسجد میں تراویح پڑھائی۔ سترہ برس کے سن میں تعلیم سے فراغت پائی اور درس و تدریس شروع کیا۔ کتابیں لکھیں بزرگوں کی کتابوں پر حاشیے لکھے فقہ و حدیث و اصول کی نئی نئی کتابیں چھپوائیں علماء سے مناظرے کئے۔ انکی شہرت ہندوستان کی چاردیواری سے نکل کر اطراف عالم میں پھیلی۔ اور سینکڑوں علمائے اعلام انکے درس سے کامل ہوکر اُٹھے اور ملک ملک میں پھیلے ۱۳۰۴ھ میں چالیس برس کی عمر میں عالم جاودانی کا سفر کیا اور مولانا کی بیوقت وفات کا یہ صدمہ ہوا کہ شمس العلماء مولانا سید عظیم آبادی نے یہ تاریخ وفات کہی۔

"شد فرنگی محل ز علم تہی"

مولانا عبدالحئی صاحب کے بعد فرنگی محل میں مولانا محمد نعیم صاحب کی ہستی یادگار سلف تھی۔ یہ ملا بحر العلوم کے پوتے اور مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔

اخیر زمانہ میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی اسی محفل کے پیرایہ سمر تھے۔

علمائے جونپور — سب سے دوسرے علمی مرکز جونپور کا نام بار بار آیا ہے۔ مگر ابھی تک وہاں کے ارباب کمال کی داستان تشنۂ بیان ہے۔ تیموری حملہ کے بعد ۸۰۰ھ میں جب جونپور میں شرقی سلطنت کا تخت بچھا تو اسی کے ساتھ ساتھ یہاں علم و فضل کی مسند بھی بچھی۔ اس مسند کے سب سے پہلے مسند آرا ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی اور ان کے معاصرین ہیں۔ لیکن اس سے چند سال پہلے جونپور سے چند میل کے فاصلہ پر پورب کی طرف ظفر آباد نام قصبہ آباد ہو چکا تھا۔

علمائے ظفر آباد — یہ پہلے گذر چکا ہے کہ ظفر آباد شہزادہ ظفر خاں کے نام پر بسا تھا مگر اس قصبہ کی شاندار تاریخ ہے۔ اسلامی آبادی یہاں اس سے بہت پہلے قائم ہو چکی تھی۔ کہتے ہیں کہ سلطان

شہاب الدین غوری نے ۵۹۰ھ میں جب قنوج کی فتح کے بعد بنارس کا قصد کیا تو شاہی فوج کے ساتھ ملا قطبی کوئی ایک مرد مجاہد بھی شریک تھا۔ اسوقت ظفرآباد کے مقام پر راجہ اودے پال نام ایک راجہ تھا جس کا اس نے راجہ سے مقابلہ کیا۔ اور شہید ہوا۔ اور یہیں دفن ہوا۔ بعد کو ایک مسجد بن گئی جو صحن شہیداں کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور اسوقت چہار اروضع شمس خاں پور کے زیر میں داخل تھے۔[1]

مخدوم شیخ صدر الدین چراغ ہند نام ایک بزرگ ملتان میں ۶۹۰ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ شیخ رکن الدین ملتانی المتوفی ۷۳۵ھ کے مرید تھے۔ یہ پیر کے حکم سے پورب کی ولایت پر مامور ہوکر ظفرآباد میں قیام پذیر ہوئے۔ شیخ رکن الدین کا یہ رتبہ تھا کہ بادشاہ وقت ان کے ہر اشارہ کو عزت سمجھتے تھے۔[2] مشہور ہے کہ غیاث الدین تغلق نے ان سے اپنی ایک بیٹی کا نکاح کر دیا تھا۔ اور ان کے لئے ظفرآباد میں ایک محل بنوایا تھا جو چراغ ہند کے نام سے اب تک مشہور ہے۔ اس عمارت پر فارسی کا یہ کتبہ منقوش ہے۔[3]

بعہد ملک ذوالقرنین ثانی　　بنا و شرع را از عدل بانی
غیاث الدین و دنیا بوالمظفر　　سلیمان خاتم و جمشید افسر
شہ آفاق تغلق شاہ اعظم　　کہ بروی شد جہانداری مسلم
برآمد این حصار چرخ ایوان　　کہ در رفعت گذشت از فرق کیوان
دوشنبہ بیست و ہشتم روز بود　　ربیع الاول ماہ ستودہ
ہمایوں ساعت و در وقت مسعود　　ز ہجرت سال ہفتصد بست و یک بود (۷۲۱ھ)
مظفر شد چو شد معمور این شہر　　ظفرآباد نامش بود در دہر

اس کتبہ سے یہ پوری طرح ظاہر ہوا کہ ۲۸ ربیع الاول ۷۲۱ھ میں سلطان فیروز شاہ تغلق اسکو بنایا تھا

[1] تجلی نور تاریخ جونپور ص ۲۹　[2] فرشتہ۔ ذکر حضرت رکن الدین　[3] شاہان شرقی کی یادگاریں (انگریزی) خان بہادر فصیح الدین مرحوم کلکٹر جونپور ص ۱۰۵

ہیں جس کے اشارے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا نام ظفر آباد کسی شخص کے نام پر نہیں بلکہ بادشاہ کی کسی مہم کی فتح و ظفر کی یادگار میں رکھا گیا۔[1] اس کے بعد سے ظفر آباد کا نام تاریخوں میں آتا ہے۔ تاتاریوں کے حملہ کے زمانہ میں ایک بزرگ شیخ کے صاحبزادوں کے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ بعد کو ان کے ایک صاحبزادہ سید تاج الدین کڑہ کے ناظم مقرر ہوئے، اور دوسرے صاحبزادہ مخدوم اسد الدین شیخ پورب میں ظفر آباد کو اپنے قدوم سے سرفراز کیا، اور مخدوم آفتاب ہند ظفر آبادی کے لقب سے شہرت حاصل کی، اور ۷۹۳ھ میں وفات پائی۔ ان کا مزار اور اولاد اب تک ظفر آباد میں ہے۔

تاج الدین کے بیٹے ظہیر الدین نے شعر و ادب میں نام پیدا کیا۔ اور دلی جا کر تغلق کے دربار میں پہلے شاعروں کی صف میں داخل ہوئے، پھر میر منشی مقرر ہوئے۔ اور آخر میں ترک منصب کر کے حضرت نظام الاولیاء کے حلقہ میں آئے۔ دیوان فارسی اور تصوف میں رموز المعانی یادگار چھوڑا۔[2]

پورب میں علمی ترقی کے چار دور | پورب میں درحقیقت علمی ترقی کے چار دور ہیں۔ ایک سلطنت[3] شرقی کا عہد

---

[1] اس مقام پر فرشتہ صفحہ ۱۴۳ اور مبارک شاہی صفحہ ۔۔ کی اس غلطی کو دور کرنا ہے کہ انھوں نے فیروز تغلق کی تخت نشینی کی تاریخ ۱۲ شعبان ۷۵۲ھ لکھی ہے مگر اس کتبہ کی بنا پر یہ تاریخ غلط ہے۔ اور صحیح وہ ہے جو فیروز شاہی میں ضیاء برنی اور تاریخ بدایونی صفحہ ۲۴۱ میں ملا بدایونی نے لکھی ہے یعنی ۷۵۲ھ

[2] تجلی نور، نور الدین ظفر آبادی جلد دوم صفحہ ۹

[3] سلاطین شرقی کے نام اور زمانے یہ ہیں۔

۱۔ سلطان الشرق خواجہ جہاں	سنہ ۷۹۶ھ	سنہ ۸۰۲ھ
۲۔ مبارک شاہ شرقی	سنہ ۸۰۲ھ	سنہ ۸۰۴ھ
۳۔ سلطان ابراہیم شرقی	سنہ ۸۰۴ھ	سنہ ۸۴۴ھ
۴۔ سلطان محمود شرقی	سنہ ۸۴۴ھ	سنہ ۸۶۲ھ
۵۔ سلطان محمد شاہ شرقی	سنہ ۸۶۲ھ	سنہ ۸۶۲ھ
۶۔ سلطان حسین شاہ شرقی	سنہ ۸۶۲ھ	سنہ ۸۸۱ھ

دوسرا دور ان کا، تیسرا تیموری سلاطین اور خصوصیت سے شاہجہاں اور عالمگیر کا زمانہ اور چوتھا اودھ کی نوابی کے ختم پر۔

شرقی سلطنت کا دور | پہلا دور سنہ [illegible] سے شروع ہو کر سنہ [illegible] پر ختم ہوتا ہے۔ اور اس دور کا طلائی عہد سلطان ابراہیم شرقی اور اس کے بیٹے سلطان محمود شرقی کا زمانہ ہے۔

یہ عہد حکومت نہ صرف پورب بلکہ پورے ہندوستان میں علم و فن کی بہار کا زمانہ تھا قنوج سے لیکر پٹنہ تک گاؤں گاؤں میں شرفا کی آبادیاں قائم ہو رہی تھیں قصبوں میں قاضیوں مفتیوں اور شیوخ وقت کو جاگیریں اور معافیاں دی جا رہی تھیں۔ اور ہر جگہ علم و فن کی مسندیں بچھی تھیں۔ اور طلبہ کے قافلے اس سرے سے اس سرے تک علم کی طلب اور تحصیل میں آ جا رہے تھے آج بھی ان اطراف میں شرفا کے جو خاندان آباد ہیں انکے بزرگ اسی عہد کی یادگاریں ہیں اور جن کے ذمہ میں جو کچھ ہے وہ انھیں شرقی بادشاہوں کا فیض ہے۔ یا پھر آخر سلطان عالمگیر کے عطیے ہیں سادات صدیقی۔ فاروقی اور انصاری شیوخ کی نو آبادیاں قنوج سے لیکر جونپور سے گذر کر غازی پور تک پھیلی تھیں۔ خانقاہیں خدا والوں سے۔ اور درسگاہیں علم کے طلبگاروں سے بھری پڑی تھیں شرقی سلطنت کے فروغ نے ظفرآباد اور جونپور کے در و دیوار کو پر نور بنا دیا تھا علما اور اہل ہنر دور دراز ملکوں سے کھنچے چلے آتے تھے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

۱۔ نور الدین ابی محمد بن مخدوم سید اسد الدین المتوفی سنہ ۸۲۶ھ

۲۔ قطب الدین ابو الغیب بن نور الدین ابی محمد شاگرد قاضی شہاب الدین دولت آبادی سنہ ۸۶۹ھ میں وفات پائی۔

۳۔ ملا بہرام خطیب جامع مسجد ظفرآباد المتوفی سنہ ۹۳۰ھ

۴۔ قاضی تاج الدین محمی ظفرآباد المتوفی سنہ [illegible]

۵۔ قاضی نصیر الدین گنبدی قاضی جونپور شاگرد قاضی عبد المقتدر دہلوی المتوفی سنہ ۸۱۷ھ

یادِ ایّام

از مولانا ضیاء الحسن صاحب ندوی ایم اے انسپکٹر مدارس عربیہ و رجسٹرار امتحانات شرقیہ الہ آباد

جہاں رہتے تھے کیسی بستیاں ہم کو وہ بھاتی تھیں
کہ جب انسان انساں تھے زمانہ بھی زمانہ تھا

ہمارے یہاں زندگی میں جدید تہذیب کی چاشنی جس سے تمام مدارس محروم تھے آگئی تھی بلکہ بہت سے دیسی انگریزی سکول بھی اس سے ناواقف تھے۔ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ یہ علیگڈھ کی نقل تھی کیونکہ دارالعلوم اس وقت جن اصولوں میں تھا انکی طبیعت علیگڈھ کے نام سے کرتی تھی۔ تبلیغ وعظ اور علمی مباحثوں کے خیال سے ہماری انجمن تقریر و تحریر قائم کی گئی تھی۔ اس میں طلبہ تحریر و تقریر کرتے کوئی استاد مسند نشین ہوتا وہ ہماری خامیوں کی اصلاح کرتا۔ ہر صوبے کے طلبہ جمع تھے۔ بہت سے اچھے خاندانوں کے تھے مستطیع اور غیر مستطیع کا کوئی فرق نہ تھا جو علیگڈھ میں بھی نواب وقار الملک مرحوم سے پہلے نہ مٹ سکا سب طلبہ ایک جگہ ایک ہی قسم کا شریفانہ کھانا دال روٹی گوشت مل جوڑ کر کھاتے ایک ہی جگہ استاد کی نگرانی میں مطالعہ کرتے اور شام کو ایک ہی جگہ ورزش کرتے لہذا اقتضائے سن و سال کی بدولت ہم لوگ شرارتیں بھی کرتے تھے ہر طرح کی زندہ دلی ہم لوگوں میں پیدا ہو گئی تھی تقشف ہمارے پاس پھٹکنے نہ پاتا تھا تفریحی انجمنیں پوسٹ سینیٹ یہ الفاظ تو ہمارے یہاں بنتے تھے۔

ہر پنجشنبہ کو تعلیم کے اوقات میں ایک محفل مکالمہ برپا ہوتی اس میں طلبہ ایک دوسرے سے سوال و جواب کرتے اس لئے نئے نئے مصادر لیکر مشکل سے مشکل صیغے تراشے جاتے اور پوچھے جاتے بعد کو چل کر عربی اشعار کی بیت بازی بھی ہونے لگی اس طرح ہم لوگوں میں عربی اشعار کے یاد کرنے کا ذوق پیدا ہو گیا تھا کسی دن منطقی مسائل پر بھی بحث ہو جاتی یہ سب ہمارے مولانا کی ایجاد تھی۔ ہاں البتہ عربی مدرسہ تھا فارسیت کا زور کم تھا پہلے تو اسی انجمن میں خال خال طلبہ عربی میں بھی مضمون سنا دیتے تھے مگر بعد کو ہم لوگوں نے صرف عربی

ادب و نحو کے لئے ایک انجمن لجنۃ الادب بھی قائم کی تھی اسی انجمن کا طفیل تھا کہ ہمارے دوست مکہ و مصر اور یورپ تک جا پہنچے کے سب سے پاک رہے اور میں نے علی گڈھ پہونچکر ایک ازہری کو زیر کرلیا۔ اب بھی تقریر تو کافی نہ کرسکوں شاید لیکن عربی بے تکلف لکھ لیتا ہوں۔ اس ضرورت سے ہم کو عربی اخبارات اور رسائل سے دلچسپی پیدا ہوگئی المنار خود دفتر ندوہ میں آتا تھا الہلال اور المقتطف کبھی کبھی مطبع البیان محمود نگر سے دستیاب ہوجاتے اللواء اس زمانہ میں دو دعوت نیم کے مبادلہ میں آتا تھا منشی سجاد حسین صاحب میرے دوست صدیق حسن یا مجھکو ترجمہ کے لئے دیدیتے اس طرح اور اس ضرورت سے ہم کو جدید مصری سے بھی واقفیت ہوگئی حضرت الاستاذ علامہ نے سفرنامہ مصر و شام و روم کے آخر میں ایک فرہنگ عربی جدید الفاظ کی دیدی تھی اس سے بہت مدد ملی۔ عربی بول چال والے صاحب اسوقت لاپتہ تھے پھر تو پڑھتے پڑھتے مہارت ہوگئی۔ اکثر قوم کے اکابر دار العلوم دیکھنے آتے کبھی کبھی انکے خیر مقدم میں ہم تو عربی میں لکھتے انکی تقریریں سنتے غرض مولویوں کے طبقہ میں ہمارا نقطۂ نظر بہت بسیط اور روشن قدرتی طور پر ہوگیا تھا یہی روایات اور رسوم تھے جنپر دار العلوم کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔

سب کچھ لکھ گیا مگر اس سلسلہ میں حضرت الاستاذ علامہ کا ذکر کہیں براہ راست نہیں آیا یہ ذکر خیر تو بعد کو اپنی جگہ پورا پورا ہوگا مگر اتنا تو سن ہی لیجئے علامہ کو ندوہ سے دلچسپی تھی مگر علماء کو ان سے دلچسپی کم تھی اور انکے نزدیک وہ علی گڈھ ہو کر ساقط الاعتبار ہو چکے تھے تاہم حضرت مولانا محمد علی صاحبؒ ان سے برابر مشورے کرتے رہتے یہ ترکیب کیوں کہ علامہ کے نام سے واقف کم سنی سے نہ تھا اول تو میرے گھر میں ان کا چرچا رہتا تھا سب سے پہلی کتاب انکی المامون پڑھی تھی یاد تو نہیں مگر اس اڈیشن میں سرسید کا لکھا ہوا ایک دیباچہ بھی تھا۔

علامہ ایک مرتبہ میری کمسنی ہی میں ندوہ میں چند روز آکر ٹھہرے میں شام کو عم محترم کے ساتھ ندوہ گیا تو وہ دفتر کے اوپر والے کمرے میں تھے انکے لئے میز کرسی کی نشست کا انتظام تھا۔ ڈاڑھی کھچڑی تھی سامنے میز پر چند مطبوعہ البم رکھے تھے اور کچھ کتابیں بھی بے ترتیب پڑی تھیں عم محترم سے باتیں ہوتی رہیں مجھکو انھوں نے

ساتھ کچھ کتابچے تھے جن میں مضامین مصر و روم کی تصویریں تھیں جو میں دلچسپی سے دیکھتا رہا اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مصر و شام و روم کے سفر سے مراجعت کے بعد کا ہے۔ ان اس وقت تک غالباً ہمارے مولانا تشریف نہیں لائے تھے۔ عم محترم سے مصر و شام و روم کے علماء اور مدارس کے متعلق کچھ گفتگو ہوتی رہی جو یاد نہیں آتی۔

اب میں پھر اپنے طرز تعلیم کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ ہدایۃ النحو ختم ہوئی تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اب کون کتاب شروع کرائی جائے۔ اس کے بعد کافیہ پڑھائی جاتی تھی پھر شرح ملا جامی یہی طریقہ درس نظامیہ کا تھا مگر حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کافیہ مرغوب نہ تھی اور سچ بھی تھا کیونکہ جمال الدین ابن حاجب صاحب کافیہ ایک بہت ذہین نحوی گذرے ہیں ان کی ذہانت ضرب المثل ہے مگر انہوں نے مغربیوں کی بدعت جو نظم میں ظاہر ہوتی تھی کہ فن کو پہیلیاں اور الفاظ میں لکھنے لگے تھے نثر میں بھی برتنا چاہی اس گناہ کی نقل متاخرین کا سرمایۂ ناز پھر ہر فن میں بن گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ فن کے مسائل اس طرح کافیہ کو زبانی یاد کر کے مستحضر رہتے ہیں مگر اس کی عبارت کی پیچیدگی کچھ اس سن کے طلبہ کے لئے مفید نہ تھی اس لئے طے ہوا کہ جمال الدین محمد بن مالک کی الفیہ کیا بری ہے نظم تو نثر سے زیادہ یاد ہو جاتی ہے پھر کافیہ سے مسائل بھی زیادہ ہیں اور عبارت میں وہ پیچیدگی بھی نہیں ہے اس فیصلہ کی قدر جب ہوئی کہ میں اس کے شارح ابن ہشام کی یہ عبارت نقل کروں کتاب صغیر [illegible] چنانچہ ہم کو الفیہ ابن مالک شروع کرا دی گئی ہزار شعر مع معنی و مطلب زبانی یاد کرنا پڑے اس کا دوسرا شعر یہ تھا۔

واحدہ کلمۃ والقول عم   وکلمۃ بہا کلام قد یؤم

اس شعر پر ہمارے مولانا نے ایک لطیفہ سنایا کہ غازیپور میں حنفیوں اور اہل حدیث میں ایک مناظرہ قرار پایا عوام کا مجمع کثیر تھا اہل حدیث کی ہوا بگڑ رہی تھی حضرت شاہ امانت اللہ صاحب نے کافیہ پڑھوں سے سوال کیا کہ لا الہ الا اللہ کو کلمہ کہنا جائز ہے کہ نہیں سب نے بالاتفاق کہا کہ نہیں اس پر شاہ صاحب نے مجمع کی طرف

۔ چونکہ کہا کہ دیکھو بھائیو ان کو لا الہ الا اللہ کے کلمہ ہونے سے انکار ہے ایسوں سے کون بحث کرے پھر کیا تھا بس بھاگ سے اہل حدیث اپنی جانیں بچا کر بھاگے۔

علم النواع زمخشری کی ترکیب و جملوں کی اشکال کی بدولت ہم کو الفیہ کے مطالعہ میں آسانی معلوم ہوئی اور الفیہ سے ہماری عربی کی بیت بازی میں بھی مدد ملی ادب میں الکلم النوابغ کے بعد کسی رواں عبارت کی کتاب پڑھانا مقصود ہوتی اسکے لئے اخوان الصفا انسان و حیوان کے بحث پر شروع کی عبارت کی روانی دیکھکر ہم کو روانی سے عربی لکھنے کا شوق پیدا ہوا سب ہمارے مولانا رحمۃ اللہ علیہ الاہم کو اس طرح کراتے تھے کہ الف لیلہ کی کسی مختصر عبارت کا ترجمہ لکھا دیتے اور اسکی عربی کراتے بعد کو نحوی غلطیاں بتا کر اصل عبارت سے مقابلہ کراتے اور الفاظ کے تغیرات سے بحث کرتے اسطرح شدہ شدہ مجھکو الف لیلہ کے دیکھنے کا شوق ہوا ان کے پاس کلکتہ کا چھپا نسخہ تھا جہاں وہ سب سے پہلے چھپی تھی لہذا جب مولانا دوسرے درجہ میں مصروف ہوتے تو میں اس کو دیکھتا اور اس میں سے بیت بازی کے لئے جو اشعار سمجھ میں آ جاتے یاد کر لیتا جب ہی کا شوق تھا جس نے مجھ سے اب الف لیلہ کا ترجمہ کرادیا اور اسی کے نظم کے ترجمہ کے شوق سے شعر کہنا آ گیا گو شاعر اب بھی نہیں ہوں۔

این ہمہ گفتہ شد در بحث نثر بود

اب نظم کی سنئے ہم کو سب سے پہلے نظم میں ناظم صاحب کے ایما سے قصیدہ بردہ شریف جو صلی اللہ کا ورد تھا شروع کرایا گیا جب قصیدہ بردہ شریف ختم کرلیا تو ہمارے مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ادیب جو کتاب سب سے آخر میں پڑھاتے ہیں یعنی متنبی شروع کرا دیا یہ نہ سمجھئے کہ ہماری استعداد سے اونچی کتاب تھی استاد تو ماہر ہوتا ہے پھر مولانا سا استاد ان کی برکت دیکھئے کہ میں نہ تو مصنف ہوں اور نہ مدرس مگر اس کے بہت سے شعر اب بھی یاد ہیں

فمثلک حبلی قد طرقت و مرضع فالہیتہا عن ذی تمائم محول

کا مفہوم اس وقت خاک کچھ سمجھ میں نہ آیا مگر رٹ لئے تھے جب سمجھ میں آیا تو فالتالیات کی بلاغت سے ایک خاص حرف واو اور ما علیکم عن ذکر اللہ کی تفسیر خوب ذہن نشین ہوگئی۔ یہ بھی اس تعلیم کی برکت اور قوت۔

ہمارے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا اثر تمام مدرسین نے بجز ایک صاحب کے قبول کرلیا مفتی صاحب اُن کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کے ایک شاگرد کی طرح انکے ساتھ برتا ؤ کرتے مولنا بھی انکے ساتھ شفقت فرماتے صرف ونحو عملی کا اتنا چرچا ہوا کہ مدرس جدید قسم کے مصنف بن گئے مفتی صاحب نے شاید اردو میں پہلی مرتبہ صرف پر ایک کتاب صرف لکھی اور خوب لکھی ندوہ نے اس کو طبع کرادیا تھا اس کے کچھ نسخے اب بھی کتب خانہ میں ہوں گے اب سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت الاستاد علامہ کی یہ ترتیب ذہنی اسی ابتدائی اسکول میں مشق ہوئی تھی۔

ہماری انشاء پردازی بہت بلند ہوگئی تھی معاں و مقفیٰ دونوں قسم کی عبارتیں لکھ لیتے تھے ہمارے دوست تو چھپے رستم نکلے نجانے وہ شاعر کیسے بن گئے انکی ثقاہت العروض مجبور اگرچہ اس کے منافی تھی مگر یہی برزخ ہمارے استاد حکیم سید عبد الحئی صاحبؒ کا بھی تھا حالانکہ وہ اردو کے ایک نقاد شاعر تھے عربی میں شعر کہنا ان کو غالباً اسی ترجمہ کی بدولت آگیا ہمارے مولانا کو اردو کے بکثرت اشعار یاد تھے اور اس زمانہ میں جبکہ لوگ میر کو کم پڑھتے ان کو میر کے چوٹی کے بہت سے اشعار یاد تھے اور اکثر میر کا کوئی شعر کہہ ترجمہ کراتے۔ جو کچھ ٹوٹا پھوٹا زبانی یاد ہے وہ لکھے دیتا ہوں۔

ڈبڈبائی آنکھ آنسو تھم رہا — کاسۂ نرگس میں جوں شبنم رہا

(۱) العین رقرقت دمعۃ وقفت — الطل طاسۃ نرجس وقفت

(۲) اغرورقت العین ردمعۃ رکدت — کاستہ نرجس وفیہا الطل حلت

ممکن نہیں ہے اجتماع ضدین — تو بت ہے اور میں بندۂ خدا ہوں

ولیس الضد یجتمع بضد — انا عبد الودود وانت ود

ظاہر ہے کہ شعر کہنے سے ترجمہ شعر میں کرنا بہت مشکل ہے۔ ہمارے مولانا عربی فارسی اور اردو کے
بڑے شاعر تھے۔ مثنوی کی ہند و مسلم جنگ پر بڑی پرجوش نظم لکھی تھی۔ ان کا فارسی کا مذاق بہت بلند تھا۔ مجھکو
مقامات حریری پڑھائی تھی مگر طلبہ کو اس وقت عربی چڑھی تھی عربی مدرسوں میں خود چشمہ رحمت غازی پور کے
سوا فارسی کا دور دورہ تھا اس لئے انکی فارسیت سے کم لوگ متمتع ہوئے خود مجھکو بھی زیادہ اعتنا اس طرف نہ تھا
ان کی بدولت عربی شاعری کا چرچا بہت رہتا تھا کوئی کتاب اٹھا لیتے تو اس کے اشعار اکثر پڑھاتے
انکے پاس ابن حجہ الحموی کی خزانۃ الادب تھی جس سے اکثر اشعار و قصائد لیتے خزانۃ الادب پھر یاد آیا ایک مرتبہ
ہمارے استاد ڈاکٹر ہورووٹز مالک ابن الریب کے مرثیہ کی تصحیح و ترمیم و مقابلہ ایک ضرورت سے مجھ سے کرا رہے
تھے حوالوں کے لئے انھوں نے ایک پرزہ نکالا جس میں خزانۃ الادب بھی تھی اتفاق سے علی گڈھ میں اس کا
کوئی نسخہ نہ تھا باہر سے منگانا پڑی جب وہ نسخہ آگیا تو ان کو حیرت یہ دیکھکر ہوئی کہ وہ کتاب میری جانی پہچانی
اور پڑھی ہوئی تھی ایسا جیسے ڈاکٹر صاحب کو میرے ساتھ بہت پیش آئے اگر یاد ایام علی گڈھ تک پہونچے
تو دیکھئے گا۔

جب ہم لوگ الفیہ ختم کر چکے تو اب درس نظامیہ کے سلسلہ میں شرح جامی ہونا چاہئے تھی مولانا ماہی
بڑے شاعر صوفی عالم تھے مگر کافیہ کی شرح کی اہمیت تو معلوم ہو گئی آخر رضی نے بھی تو شرح لکھی ہے گو وہ
طویل مغنی سی لبیب ابن ہشام طویل تھی مفصل زمخشری مختصر تھی گو اسکی شرح ابن یعیش یورپ میں طبع ہو چکی
تھی شواہد کے لئے شرح ازبس ضروری ہے مگر یہاں اس کو کون جانتا تھا سنی مولویوں میں ادب کا مذاق
کہاں تھا جو کوئی اس کی جستجو کرتا غرض بطرح الفیہ کی شرح اوضح المسالک پڑھانا تجویز ہوا اسکی شرح
بر جاری کی ندوہ کے کتب خانے میں موجود تھی۔ اوضح المسالک کا جو نسخہ کلکتہ کا چھپا تھا وہ حامل المتن تھا
یعنی الفیہ کے اشعار بھی اس میں تھے مگر مصری نسخے میں خالی شرح تھی اس کتاب کے پڑھنے سے دو
فائدے ہوئے اول تو مجھ عربی میں مسائل سمجھنے کی استعداد بڑھ گئی دوسرے شواہد یاد کرنے سے ایکطرف تو

افعل یاد ہوئے دوسرے مسائل اچھی طرح ذہن نشین ہو گئے اس بیان سے کسی قدر بصیرت طلبہ کو تو ہو گی گر مجھکو اپنے عہد طفلی کی یاد میں مزہ آرہا ہے اس لئے لکھ رہا ہوں۔ ادب کی تعلیم کا پرواز آپنے سمجھ لیا اس کے بعد مقامات بیچی اور کچھ مقامات حریری ہوئی تھی کہ ہمارے مولانا رحمۃ اللہ علیہ تشریف لے گئے۔ نظم میں ہم نے جس ذوق وشوق سے متنبی پڑھی تھی اس کا لطف کچھ ہمارے دوستوں کو یاد کر کے آسکتا ہے متنبی ہمارے مولانا کی خاص کتاب تھی۔ حماسہ وہ کبھی نہ پڑھاتے بلکہ فرماتے "اس کشکول میں کیا رکھا ہے" تب بے آپ دیکھ لے گر متنبی ... ایک ایک لفظ مزے لے کر پڑھاتے اس کو پیار کرتے اور پیار نہ کر چلتے اس کے اشعار کا دوسرے ... اشعار سے مقابلہ کرتے انکے محاسن سمجھاتے اور سرقات المتنبی کے دل جلانے مصنف کے چونا ... انکی محنت اور شفقت کی داد انکے ایک انگریز شاگرد نے دی جس کو انھوں نے متنبی بنارس کے قیام کے زمانہ میں پڑھائی تھی یہ صاحب ڈوہرسٹ ممالک متحدہ کے ایک سولین تھے انھوں نے متنبی کا سب سے صحیح ترجمہ انگریزی میں شائع کیا ہے بات یہ ہے کہ مغربی مستشرق مولدین کے اشعار کے سمجھنے میں کچے ہیں اور ایسا ہونا قرین قیاس اور قابل معافی بھی ہے ورنہ انھوں نے ہم سے کہیں زیادہ عربی ادبیات کی خدمت کی ہے جس کا ہم کو مشکور ہونا چاہیے۔

ندوہ کے نصاب میں شروع سے اس کا خیال رکھا گیا کہ قرآن پاک کی تعلیم پر زور دیا جائے لہذا شروع میں ہم کو پارہ عم با ترجمہ و ترکیب پڑھایا گیا اس کے بعد سورۂ ق سے آخر تک خود ہمارے مولانا نے پڑھایا ہم کو تفسیری مباحث پر نوٹ لکھا دیتے ادبیت سے خاص اعتنا تھی کبھی کبھی کسی آیت کی بلاغت پر بھی تقریر فرماتے جو غالباً طبع زاد ہوتی۔ اس کے بعد جلالین جب شروع ہوئی تو تفسیر در تعویل کر ہوئی الحمد اللہ عربی سمجھنے کی استعداد ہماری اب اتنی ہو گئی تھی جتنی فارغ التحصیل مولویوں کی ہوتی جلالین کا صرفی و نحوی وادبی حصہ آسان معلوم ہوا پھر اس میں رکھا ہی کیا تھا میں تو زیادہ وقت دوسری عربی اور اردو کی تفسیر دیکھنے پہ صرف کرتا اس زمانے میں ہمارے مولانا عبدالحق صاحب حقانی کی تفسیر حقانی سے بہت مدد ملی۔ اگر ہمارے

مولانا یہ بات سن پاتے تو برافروختہ ہوتے بڑے قصے ہمارے مولانا تفسیر خازن سے پڑھواتے کسی نحوی یا ادبی مسئلہ کی تحقیق کے لئے کشاف کھل جاتی اس طرح تفسیر تو جلالین ہی ہوئی مگر بڑی تفسیروں سے شناسائی ہوتی گئی۔

کچھ خاندانی اصول میں سرسید کی تفسیر دیکھنے کو جی چاہا اصل نہ ملی تو حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تردید سے سید صاحب کے اقوال پڑھ لیتا اب جب نصف یا ایک پارہ جلالین شریف کا ہوگیا تو کتب خانے میں جاکر تفسیر حضرت محی الدین ابن عربی اور تفسیر رازی دیکھتا مگر بالاستیعاب محی الدین بغوی کی تفسیر دیکھتا رہا بلاغت میں ہم نے تلخیص المفتاح سب سے پہلے پڑھی مفتاح کی خشک بیانی اور اس پر سے اس کی تلخیص کر ڈالا کر طالب علم چڑھا اس کے بعد مختصر المعانی مطول تک کہیں خشکی نہ دفع ہوئی معانی کی بحث میں تو منطق بھر کر اس کو معجون بنا دیا مگر بیان میں کیا کرتے اس چوب خشک کے بعد جب ہم نے شاخ شاداب یعنی حسن التوسل حلبی کی پڑھنا شروع کی تو رطب اللسان ہوگئے۔ آپ اس بیان سے نہ سمجھئے کہ میں نصاب کی ہر ہر کتاب کا ذکر کرکے اصل کتابیں ترتیب پڑھنے میں نہ تبدیلی نصاب در طرز تعلیم میں جو اہم اختلافات مروجہ درس نظامیہ سے ہوئے انکی حقیقت بتانا مقصود ہے تعلیم حدیث میں حنفیت کا لحاظ خاص طور پر تھا چنانچہ فقہ حدیث میں اول مراقی الفلاح دوسرے موطا امام محمد ہم کو پڑھائی گئی پھر تو ستہ اور کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

ہمارے مولانا کو الفاظ اور ان کے معانی کے ادنیٰ اختلافات پر کافی عبور تھا ایک مرتبہ شہر کے لئے عربی میں جو الفاظ تھے وہ لکھائے تو آنکھیں کھل گئیں۔ لغات کے استشہاد پر بھی کافی عبور تھا تو ہر کوئی شعر پڑھ دیتے صحاح کے اشعار بکثرت یاد تھے۔ فقہ اللغۃ ثعالبی اور الالفاظ الکتابیہ عبدالرحمن ہم کو منگا دی تھی اسکی مطالعے سے فقہ اللغۃ پر نقد ہوگی۔

معقولات کی تعلیم کی ترتیب سنئے درس نظامیہ کے مطابق شرح تہذیب پڑھانا چاہئے تھا مگر اس کے بجائے مرقات مولانا فضل امام کی پڑھائی اس میں مسائل تہذیب سے بھی زیادہ ہیں جب مغربی منطق پر نظر کی قرآن کی تعلیم کی قدر کھلی دلالت ہی کی بحث میں کثرت سے الفاظ کی مشق کرادی اسی طرح کلیات قضایا میں مختلط نقیض

عکس نقیض، عکس مستوی، اشکال اربعہ سب باشق پڑھاتے منطقی مسائل مستحضر ہو گئے تھے شمسیہ کی شروح میں لوگ قطبی ہی پڑھاتے ہیں انھوں نے سعدیہ بھی پڑھائی ہی نہیں کیا شرح مطالع و شرح مواقف کے منطقیات بھی پڑھائے، منطق میں یہ کیا گیا تھا۔ اختلافی مسائل کے سمجھانے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک طالب علم کو رازی دوسرے کو طوسی بنا دیتے اور دونوں کی اختلافی تقریر مشق کراتے ہمارے ساتھیوں میں حافظ بشیر مرحوم اور شاہ مولوی فضل الرحمن مقیم خانقاہ مجددیہ بڑے ذہین اور سمجھدار تھے فلسفہ میں یہ سعدیہ میبذی سے پہلے پڑھا دی تو میبذی کا اخلاق آسان ہو گیا تقریریں اکثر لکھا دیتے تھے۔

عقاید و فلسفہ آگے کے دور میں مذکور ہوگا مگر ابتدا میں صاحب تہذیب المنطق کی کتاب تہذیب الکلام زبانی یاد کرادی پھر شرح عقاید نسفی ہوئی۔ یہ بیان کتابوں کے ذکر سے کسی قدر غیر دلچسپ ہو گیا ناظرین معاف کریں۔ ہمارے مولانا جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے کسی قاعدے اور قانون کے پابند نہ تھے اور یہ پہلے سے سمجھ کر بٹھائے گئے اور یہ بتا دوں ان کے ساتھ بتا دیا گیا انکے یہاں اسباق اس طرح ہوتے کہ وہ لیٹے رہتے کبھی کوئی طالب علم سر میں تیل دباتا اور کوئی پاچپی کرتا۔ استاد کی خدمت کی عادت بھی خوب ہوتی ہے ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ میں کسی مسئلہ پر گفتگو کر رہا تھا اور پاؤں بھی داب رہا تھا کہ اتنے میں حضرت الاستاد علامہ جو حیدرآباد سے آئے تھے تشریف لے آئے انھوں نے بھی ایک پاؤں سلانے پر رکھ دیا تا شروع کیا میں چارپائی سے اتر کر نیچے بیٹھنا چاہتا تھا مگر منع فرمایا اُن سے صرف اتنا کہا تے بے کب آیا کہا شب کو پھر سلسلہ تقریر جاری رکھا جب وہ تقریر ختم ہو گئی تو علامہ نے رازی اور طوسی کے اختلاف کے متعلق نتیجہ چاہی فوراً تقریر شروع ہو گئی آخر علامہ کو تشفی ہو گئی مجھے اس وقت یہ دلچسپی تھی کہ علامہ اپنی طالب علمانہ حالت میں نظر آتے تھے اور مجھ میں اور ان میں کوئی فرق نہ تھا اب کہاں اور کیسے یہ مناظر نصیب ہوتے ہیں۔

حدیث کا ابتدائی تحریری سرمایہ

(۴)

از عبدالسلام قدوائی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جلالت شان اور ان کا مرتبہ علم و فضل کسی سے پوشیدہ نہیں فقہاء صحابہ تک [illegible] انکی طرف رجوع کرتے تھے قبیصہ ابن ذویب کا بیان ہے کہ:

[illegible] اعلم الناس — حضرت عائشہؓ سب لوگوں سے زیادہ عالم تھیں اُن سے

[illegible] اکابر الصحابۃ[۱] — بڑے بڑے صحابہؓ دریافت کرتے تھے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں انھیں جو قرب و اختصاص حاصل تھا وہ سب کو [illegible] ان کی مرویات سے ہے۔ محدث ابن جوزی نے انکی روایتوں کی [illegible] ۲۲۱۰ بتائی ہے۔ یہ روایتیں حضرت عروہ اور حضرت عمرہ کے ذریعہ اسی زمانہ میں کتابی شکل میں مرتب [illegible]

حضرت عروہ حضرت عائشہ کے ہمشیرزادے تھے اس رشتہ سے انکی خدمت میں اکثر حاضری کا موقع ملتا تھا انھیں علم کا ذوق اور احادیث و سنن کی تلاش و جستجو کا بیحد شوق تھا کرید کرید کر حدیثیں پوچھتے مسائل کی تحقیق کرتے اور لوگوں میں انکی اشاعت کرتے انکے علم و فضل کا یہ حال تھا کہ امام زہری جیسے عالم کا بیان ہے کہ میں نے انھیں ایسے سمندر کی طرح پایا جو کبھی خشک نہیں ہوتا[۲]

حضرت عروہ کتابت حدیث کے قائل تھے خود بھی لکھتے تھے اور اپنے بیٹے ہشام کو بھی لکھاتے تھے انکے پاس خود انکی لکھی ہوئی بھی متعدد کتابیں تھیں جو واقعہ حرہ تک موجود رہیں[۳]۔

حضرت عمرہ کی روایتیں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے انکے بھانجے ابوبکر ابن محمد نے قلمبند کیں

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص۲۴ [۲] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص۵۴ [۳] جامع ص۳۷

قاضی ابوبکر سعد بن ابراہیم کو بھی حکم تھا کہ وہ بھی حدیثیں جمع کریں چنانچہ انھوں نے دفتر کے دفتر لکھے جو حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے تمام اسلامی ممالک میں شائع کئے گئے[۱] حضرت عائشہؓ کی مرویات ایک اور ذریعے سے بھی قلمبند ہوئیں، ابو قلابہ ایک مشہور تابعی ہیں جو حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں یہ کتابت حدیث کو بہت ضروری سمجھتے تھے انتقال کے بعد انکی کتابیں ایک جانور کے بوجھ کے برابر ابو ایوب سختیانی کو ملیں[۲]

مکثرین صحابہ میں حضرت ابوسعید خدری کا بھی شمار ہوتا ہے مرویات کی تعداد ۱۱۷۰ ہے یہ کتابت حدیث پسند نہ کرتے تھے، شاگرد آپ کی مرویات قلمبند کرنا چاہتے تھے، ان لوگوں نے اس کی اجازت چاہی لیکن حضرت ابوسعید نے اُسے منظور نہیں کیا البتہ یہ کہا کہ انھیں اچھی طرح یاد کر لو تاہم یہ روایتیں ان کے شاگرد و ہیں حضرت نافع کے ذریعہ احاطۂ تحریر میں آگئیں حضرت نافع کتابت حدیث کے قائل تھے لہٰذا انکی روایتیں انکے سامنے لکھی جاتی تھیں[۳] عطاء ابن ابی رباح ان کے ایک نامور شاگرد ہیں ان کا یہ حال تھا کہ انکی روایتیں انکے سامنے پوچھ پوچھ کر لکھی جاتی تھیں[۴]۔

حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت جابر اور مجاہد بھی ان سے روایت کرتے ہیں[۵] اور ان لوگوں کا مسلک کتابت حدیث کے بارہ میں اوپر کے صفحات میں گذر چکا ہے اس طرح بہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوسعید خدری کی تمام مرویات عہد صحابہ ہی میں تحریری شکل میں جمع ہو گئی تھیں۔

صفحات بالا میں حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہؓ بن عمر، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہؓ ابن عباس، حضرت جابرؓ ابن عبداللہ اور حضرت ابوسعیدؓ خدری سات کثیر الروایات صحابیوں کا ذکر ہو چکا ہے، ان لوگوں کی مرویات کی تعداد (۵۳۷۴ + ۲۶۳۰ + ۲۲۸۶ + ۲۲۱۰ + ۱۶۶۰ + ۱۵۴۰ + ۱۱۷۰) ۱۶۸۷۰ ہے حضرت عبداللہ ابن عمرو بن عاص کی مرویات کی تعداد حضرت ابوہریرہ سے بھی زیادہ ہے جیسا حضرت ابوہریرہؓ کو خود اعتراف ہے لہٰذا جب حضرت ابوہریرہ کی روایتیں

---

[۱] جامع ص [illegible] [۲] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص [illegible] [۳] دارمی ص ۶۹ [۴] تہذیب التہذیب جلد ۴ ص [illegible]

۵۳۷۴ ہیں تو حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاص کی روایت کردہ حدیثیں کسی طرح چھ ہزار سے کم نہ ہوں گی اس طرح صرف آٹھ صحابہ کی لکھی ہوئی روایتوں کی تعداد کم از کم (۱۷۸۴۰ + ۶۰۰۰) ۲۳۸۴۰ تک پہنچ جاتی ہے اس تعداد میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی لکھی ہوئی پانچ سو حدیثوں کا اضافہ کیا جائے تو یہ تعداد ۲۴ ہزار سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ صحیح بخاری کی دو ضخیم جلدیں جو بڑے سائز کے ۱۱۲۹ صفحات پر مشتمل ہیں صرف ۷۰۰۰ ہزار حدیثیں رکھتی ہیں تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان ۲۴ ہزار سے متجاوز روایتوں نے اپنے لئے کتنی ضخیم جلدوں کی ضرورت ہوئی ہوگی یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ امام بخاری کا قاعدہ ہے کہ مختلف مسائل کے اثبات اور استدلال کی غرض سے ایک ہی حدیث کو متعدد موقعوں پر نقل کرتے ہیں تو اندازہ یہ بھی صحیح ہو سکتا ہے اگر حدیثوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ۹۰۸۲ میں سے حقیقۃً صرف ۲۶۰۲ روایتیں ہیں [illegible]۔

اب صحیح بخاری کی روایتوں کی اس تفصیل کو پیش نظر رکھا جائے تو کہنا پڑے گا کہ مذکورہ بالا صرف آٹھ کثیر الروایات صحابہ کی بیان کردہ حدیثیں کم از کم بخاری جیسی بیس جلدوں میں آئیں گی جن کے صفحات کی تعداد بائیس ہزار سے متجاوز ہوگی۔

اب آئیے ذرا اور آگے بڑھئے صحابہ کرام میں ان بزرگوں کے علاوہ اور بھی متعدد اصحاب ایسے تھے جو حدیثیں خود بھی لکھتے تھے اور اپنے شاگردوں کو بھی لکھاتے تھے ان صاحبوں میں حضرت عبداللہ ابن مسعود خاص طور سے قابل ذکر ہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے انہیں تعلق خاص تھا آغاز اسلام سے آپکے سا

۱؎ حافظ ابن صلاح نے صحیح بخاری کی کل روایتوں کی تعداد ۷۲۷۵ بتائی ہے ان میں سے ان کے نزدیک تقریباً چار ہزار غیر مکرر ہیں لیکن حافظ ابن حجر نے مقدمہ فتح الباری میں اس رائے سے اختلاف کیا ہے اور شمار کرکے بتایا ہے کہ کل حدیثیں ۹۰۸۲ ہیں جن میں سے صرف ۲۶۰۲ غیر مکرر ہیں۔

زندگی بھرکی خدمتِ مبارک میں اس قدر آنا جانا ہوتا تھا کہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ بھی کوئی آنحضرتؐ کے گھر کے آدمی ہیں یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ اور خلفاء راشدین کی نظر میں ان کی بڑی اہمیت تھی لوگ انھیں آنحضرتؐ سے بہت مشابہ سمجھتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نظر میں ان کا یہ مرتبہ تھا کہ جب انھیں تعلیم وارشاد کے لیے کوفہ بھیجا تو اہل کوفہ کو لکھا کہ میں عبداللہ ابن مسعود کو تمھارے پاس بھیجکر اپنے اوپر تمھیں ترجیح دے رہا ہوں[1]

حضرت عبداللہ شروع میں کچھ دن تک کتابت حدیث کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے اتنے مخالف تھے کہ لکھی ہوئی کتابوں کے حروف پانی سے دھلوا دیتے تھے اور روایتوں کے مجموعوں کو نذر آتش کر دیا کرتے تھے[2] لیکن جب اس کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس جانب ایسی توجہ کی کہ خود بھی حدیثیں کتابی شکل میں مرتب کیں اور اپنے شاگردوں کو بھی لکھائیں ان کے شاگرد ان کی روایتیں لکھ لیا کرتے تھے[3] ان کے مشہور شاگرد علقمہ کاغذ پر لکھی ہوئی حدیثیں زبانی یاد کرتے تھے[4]

---

[1] حضرت عبداللہ ابن مسعود کے مناقب تاریخی تذکروں کے علاوہ بخاری و مسلم کی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں [2] جامع بیان العلم ص۲۲ [3] دارمی ص۶۷ [4] جامع ص۷۲

ضروری تصحیح

مارچ کے الندوہ میں بسلسلہ یادِ ایام ص۲۲ پر مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی کی کتاب بشریٰ کے متعلق شائع ہوا تھا کہ یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے اس سلسلہ میں مولانا اکرام اللہ خاں صاحب ندوی مطلع فرماتے ہیں کہ یہ ضخیم کتاب گذشتہ سال شائع ہو گئی پانچ سو صفحے کم وبیش ضخامت ہے" اسی طرح ص۲۷ پر اسی مضمون کی عبارت کے متعلق کہ منشی صدیق حسن مانکپوری فرزند جلیل مرحوم" فرماتے ہیں کہ جلیل جو مشہور شاعر اور استاد حضور نظام ہیں۔ بفضلہٖ زندہ ہیں۔ صدیق صاحب بھی واقف ہوں۔

حالات ندوہ

۲۸ مارچ کو ندوۃ العلماء کی مجلس منتظمہ کا جلسہ تھا جس کی کارروائی اگلے صفحات میں درج کی جا رہی ہے اس موقع پر دارالعلوم میں بھی بڑی چہل پہل رہی ۲۹ مارچ کو جمالیہ ہال میں جناب منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس لاری و معتمد مال ندوۃ العلماء کی صدارت میں ایک شاندار جلسہ ہوا جس میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خان شروانی اور مولانا سید سلیمان صاحب ندوی معتمد دارالعلوم نے بہت ہی مفید و موثر اور ولولہ انگیز و وجد آفریں تقریریں فرمائیں جنھیں سن کر ایمان کو تازگی اور روح کو بالیدگی حاصل ہوئی مولانا شروانی نے طالب علموں کو ان کے بلند نصب العین اور اعلیٰ مقصد زندگی کی طرف توجہ دلائی اور اس راہ میں پوری جد و جہد اور ہر طرح کے ایثار و قربانی کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں — شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے اپنی تقریر میں ندوہ کے اصلاحی مقاصد اس کی پچھلی تاریخ اور بزرگوں کی پیہم کوششوں کا ذکر فرمایا آپ نے بتایا کہ ندوہ کے مقاصد سے اب ہر شخص متفق ہے ضرورت ہے کہ ہمارا قدم برابر آگے بڑھتا رہے اور زمانہ کے اس انقلاب انگیز دور میں رہنمائی کا فریضہ بدستور ادا ہوتا رہے۔

اس موقع پر عطاء اسناد اور تقسیم انعامات کی رسم بھی انجام پائی جناب منشی احتشام علی صاحب نے درجہ فضیلت کے کامیاب طلبہ کو اپنے ہاتھ سے سندیں عطا فرمائیں سالانہ امتحان میں جو طلبہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے تھے انھیں نواب صدر یار جنگ بہادر کی طرف سے انعامات دئے گئے اس سلسلہ میں امسال کے منتہی محمد نواب خاں اور ناظم اقبال اثر انصاری کو صلاحیت و حسن خدمات کے تمغے دئے گئے اور محمد نعمان خاں محمد اسحٰق پشاوری اور علی احمد کو تمغۂ لیاقت عطا ہوئے۔

آخر میں جناب منشی احتشام علی صاحب نے ایک جامع اور پراثر تقریر میں ندوہ کے سابق کارناموں اور آئندہ عزائم کا ذکر فرمایا۔

اپریل میں معین الندوہ کی مجلس منتظمہ کے دو جلسے منعقد ہوئے جس میں پچھلے حسابات اور آئندہ بجٹ پر بحث ہوئی نیز بنگال و بہار کی شاخوں کے قیام اور ان سے متعلق مسائل پر غور کیا گیا اس موقعہ پر خاص لکھنؤ میں معین الندوہ کے کام کو آگے بڑھانے کی راہیں سوچی گئیں، مولانا محمد عمران خاں صاحب انچارج مہتمم دارالعلوم کی صدارت میں ایک وفد مرتب ہوا ہے جو عنقریب شہر اور اطراف و جوانب کا دورہ کرے گا۔

الندوہ کی کسی گذشتہ اشاعت میں مجلس نقباء (والنٹیروں کی کمیٹی) کا ذکر آچکا ہے اس مجلس کا پہلا دور فروری میں ختم ہوگیا اور اپریل میں نیا انتخاب عمل میں آیا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

شبلی دارالاقامہ

نقیب عام (جنرل منیجر) اقبال وارث انصاری

نقیب ـ ابوالعرفان، محمد اسحاق پشاوری

نقیب دینیات ـ عبدالغفار، نجم الدین برنی

نقیب تعلیم ـ عبدالحفیظ قدوائی، حبیب اللہ

نقیب صحت ـ نظام الدین، محمد زبیر

دارالاقامہ فوقانیہ و تحتانیہ

مسیح الزماں، عبدالجلیل، اسماعیل سوتی اور علی احمد بہاری کے بجائے احمد خالد، کلیم اللہ، احتشام علی اور واحد علی منتخب ہوئے تحتانیہ میں صلاح الدین کے بجائے عقیل احمد کا نقیب عام کے لئے انتخاب ہوا۔

جلسۂ انتظامیہ ندوۃ العلماء

[illegible] ندوۃ العلماء

[illegible] جناب منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس و معتمد [illegible]

[illegible] منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس معتمد ندوۃ العلماء [illegible]

[illegible] مولانا سید سلیمان صاحب ندوی معتمد [illegible]

[illegible] مولوی محمد منظور النبی [illegible]

[illegible] سید عبد العلی [illegible]

[illegible] سید صاحب [illegible]

[illegible]

[illegible] دستور العمل [illegible]

[illegible]

[illegible] ابو بکر [illegible]

[illegible] مولانا سید محمد سجاد صاحب [illegible]

[illegible] مولوی عبد الحق صاحب [illegible] مشیر المہام

ریاست [illegible] انتظامیہ ندوۃ العلماء کے انتقال پُرملال

پر اپنے دلی افسوس و رنج کا اظہار کرتا ہے اور انکے پسماندگان کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی کا

اظہار کرتا ہے اور ان سب کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے۔

[illegible] جلسہ انتظامی ندوۃ العلماء کا یہ جلسہ [illegible] سید سلیمان صاحب [illegible] مسلم یونیورسٹی کے

[illegible] اظہار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے

(۳) مجلس انتظامی ندوۃ العلماء کا یہ جلسہ ہز ہائینس حضور نواب صاحب بہادر فرماں روائے ریاست بہاولپور کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ حضور ممدوح نے تکمیل عمارت دار العلوم کے لئے پندرہ ہزار روپیہ منظور فرمایا ہے۔

(۴) گوشوارہ آمد و صرف ندوۃ العلماء بابتہ ۱۹۳۰ء جسکی مجموعی آمدنی [illegible] اور مجموعی مصارف [illegible] ہے بغرض منظوری پیش ہوا جو منظور کیا گیا۔

(۵) نواب صدر یار جنگ بہادر کی حسب ذیل تجویز پیش ہوئی۔

ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس [illegible] سے نہیں ہوا ہے [illegible] اور کانفرنس اور مجلس اپنے اجلاس برابر کر رہی ہیں سالانہ اجلاس نہ ہونے سے ہماری تحریک کمزور ہو رہی ہے بلکہ ہو چکی ہے اس لئے ایک سب کمیٹی ضروری انتظام کیواسطے بنا دی جائے اور ۱۳۶[illegible]ھ میں کسی مناسب وقت میں اجلاس کا زمانہ معین کر دیا جائے

بعد غور و بحث کے یہ قرار پایا کہ ایک سب کمیٹی مندرجہ ذیل ارکان کی بنا دی جائے۔

نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا سید سلیمان صاحب ندوی معتمد دار العلوم مولانا مسعود علی صاحب ندوی مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس [illegible] ندوۃ العلماء اور [illegible] کے ابتدائی مصارف کے لئے پانچ سو منظور کیا جاتا ہے۔

(۶) ظفر حسن خاں صاحب مرحوم رئیس ضلع علی گڈھ نے ایک وقف نامہ لکھا تھا مسلم یونیورسٹی علی گڈھ دار العلوم ندوۃ العلماء دار العلوم دیوبند اور حمایت اسلام لاہور کے لئے اپنی جائداد وقف کی تھی [illegible] مقدمہ دائر کیا گیا ہے جس کے لئے پانچ سو پچاس روپے منظور کئے گئے۔

(۷) حسب تجویز معتمد صاحب دار العلوم مولوی عبد السلام صاحب قدوائی کی تنخواہ میں [illegible] روپیہ ماہوار [illegible]

مولوی نورالحسن صاحب کی تنخواہ میں پانچ روپیہ ماہوار کا اضافہ، مولوی مفتی محمد سعید صاحب کی تنخواہ میں پانچ روپیہ ماہوار کا اضافہ اور مولوی محمد ادریس صاحب کی تنخواہ میں تین روپیہ ماہوار کا اضافہ منظور کیا گیا۔

(۸) حسب تجویز معتمد صاحب دارالعلوم مولوی شاہ عزیز الدین صاحب کا تقرر بحیثیت ادیب کے للعہ روپیہ ماہوار پر یکسال کے لئے عارضی طور پر منظور کیا گیا۔

(۹) ارکان انتظامیہ ندوۃ العلماء اور معتمد دارالعلوم کے انتخاب کے متعلق جس قدر رائیں آئی تھیں وہ جلسہ میں کھولی گئیں اور مندرجہ ذیل ارکان اور معتمد دارالعلوم کا انتخاب عمل میں آیا۔

ممالک متحدہ آگرہ و اودھ۔ الف عالم۔ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی ڈاکٹر عبد العلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی۔ مولانا مسعود علی صاحب ندوی۔ مولوی احمد زمان خاں صاحب ریٹائرڈ ... صاحب خان بہادر مولوی عبید الرحمن خاں صاحب شروانی ایم ایل سی ٹرسٹی مسلم یونیورسٹی۔ مولوی عبد الماجد صاحب بی اے دریابادی مولانا عبد الباری صاحب ندوی۔ مولوی حکیم عبد المعید صاحب جھوائی ٹولہ لکھنؤ (انتخاب جدید)

ممالک متحدہ آگرہ و اودھ ب غیر عالم منشی محمد اطہر علی صاحب ایڈوکیٹ ایم ایل اے لکھنؤ۔ مولوی سید ظہور احمد صاحب ایڈووکیٹ (انتخاب جدید) منشی محمد احترام علی صاحب رئیس کاکوری۔ نواب زادہ سید شمس الحسن خاں صاحب بی اے ایل ایل بی لکھنؤ۔ (انتخاب جدید)

پنجاب وصوبہ سرحد شمالی و مغربی۔ الف عالم مولوی ضیاء اللہ صاحب ندوی مولانا احمد علی صاحب امیر انجمن خدام الدین لاہور

" " ب غیر عالم مولوی عبد الرب صاحب بی اے شملہ۔ مولوی حکیم عبد العزیز صاحب پشاور

دہلی مولانا کفایت اللہ صاحب۔ سید مرتضیٰ علی صاحب

بہار مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی ضلع پٹنہ۔ مولوی حاجی معین الدین صاحب پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ مولانا شاہ حسین میاں صاحب پھلواری ضلع پٹنہ (انتخاب جدید)۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب بیرسٹرایٹ لا چھپرہ۔

مدراس۔ مولانا محمد فضل اللہ صاحب۔ (انتخاب جدید)

ممالک متوسط و برار۔ مولوی محمود علی صاحب ندوی ہیڈ گورنمنٹ ہائی اسکول امراؤتی۔ مولوی محمد اکبر خاں صاحب ندوی ایم اے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ضلع بلاسپور

سندھ و بلوچستان۔ مولانا محمد صادق صاحب مدرسہ مظہر العلوم کراچی۔ مولوی عبد الودود صاحب صدر المدرسین عالیہ ریاست رامپور۔ دبیر الملک مولوی قاضی ولی محمد صاحب بھوپال

معتمد دارالعلوم۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی معتمد دارالعلوم منتخب ہوئے

(۱۰) تخمینۂ آمد و صرف ندوۃ العلماء بابتہ ۲۲-۱۹۲۱ء منظور کیا گیا۔

Regd. No. A-596.

پبلشر سید حامد علی، پرنٹر بانکے لال سکسینہ، مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

الندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتبہ
سید ابوالحسن علی ندوی
استاذ تفسیر وادب
عبدالسلام قدوائی ندوی
استاذ تاریخ واقتصادیات

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۲ جمادی الاول ۱۳۶۰ھ مطابق جون ۱۹۴۱ء نمبر ۶

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر منیجر الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہیے

شذرات

انتہائی افسوس کے ساتھ یہ خبر نہایت رنج و افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ پچھلے مہینے مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی رئیس الاساتذہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ نے ایک مختصر علالت کے بعد اس جہان فانی سے انتقال فرمایا مرحوم ندوہ کے ابتدائی دور کے طالب علموں میں تھے اور یہاں کی تعلیم و تربیت کا بہت عمدہ نمونہ تھے تصنیف و تالیف کا ذوق شروع ہی سے تھا درسیات کی تکمیل کے بعد کچھ دنوں دار المصنفین میں قیام رہا خلفاء راشدین اور مہاجرین حصہ اول اسی زمانہ کی یادگار رہیں تصنیف و تالیف کے ذوق نے کتب خانوں سے تعلق پیدا کیا اور یہ کام ایسا بھایا کہ زندگی کا ایک بڑا حصہ اسی میں صرف ہوا کتب خانہ ندوۃ العلماء کی ترتیب و تہذیب کے علاوہ بوہار امپیریل لائبریری کلکتہ اور خدا بخش لائبریری پٹنہ اور اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت سے مدتوں یہ خدمت انجام دی آخر میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل مقرر ہوئے اور زندگی کے آخری لمحات تک درس و تدریس کے مبارک مشغلے میں مصروف رہے خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کی یہ خدمتیں قبول فرمائے اور انھیں اپنی رحمتوں سے سرفراز فرمائے (آمین)

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں ایک تجویز منظور ہوئی تھی جس میں مسلم یونیورسٹی سے درخواست کی گئی تھی کہ ملک کی دوسری یونیورسٹیوں کی طرح عربی و فارسی کے امتحانات کا سلسلہ یہاں بھی جاری کیا جائے اور جو لوگ ان امتحانوں کو پاس کرلیں انھیں انگریزی زبان میں بی اے تک امتحان کی اجازت دی جائے یہ تجویز اکیڈمک کونسل کے سامنے پیش ہوئی اور اس نے غور و خوض کے لئے ایک کمیٹی مقرر کر دی ہے اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کمیٹی کے ارکان اور مسلم یونیورسٹی کے ارباب بست و کشاد کو اس تجویز کی جانب بھی توجہ دلائی جائے جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر شعبہ مدارس اسلامیہ کے اجلاس میں منظور ہوئی تھی اس تجویز میں مسلم یونیورسٹی سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ مشہور عربی مدارس کے فارغ طلبہ کو اس کی اجازت دے۔ کہ وہ

مسلم یونیورسٹی کے ماتحت صرف انگریزی زبان میں میٹرک سے بی اے تک امتحان دے سکیں ہمیں امید ہے کہ یہ تجویز کمیٹی کے ارکان کے پیش نظر ہوگی اور وہ اپنی رپورٹ میں اس جانب خاص توجہ فرمائیں گے بلکہ زیادہ بہتر تو یہ ہوتا کہ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے کوئی ایسی صورت پیدا کی جاتی کہ ان طلبہ کو صرف زبان میں میٹرک پاس کرنے کے بعد ایف اے میں باضابطہ شرکت کی اجازت مل جاتی تعلیمی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی دشواری بھی نہیں ہے معاشیات، سیاسیات، فلسفہ، منطق، عربی، فارسی وغیرہ مختلف ایسے مضامین ہیں جنکی تعلیم میٹرک کے لازمی مضامین پر منحصر نہیں ہے، اس طرح ہندوستان کے اسلامی مدارس اور مسلم یونیورسٹی کے درمیان خاص ربط و اتحاد پیدا ہوجاتا اور جدید و قدیم کے وہ اختلافات ہمیشہ کے لئے ختم ہوجاتے جنھوں نے صدیوں سے ملت کو دو نیم کر رکھا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ عربی مدارس میں اصلاح نصاب کا خیال روز بروز عام ہوتا جارہا ہے یہ خیالات اب صرف جدید درسگاہوں ہی تک محدود نہیں بلکہ اسلامی تعلیم کے قدیم مرکزوں میں بھی جنبش نظر آرہی ہے دارالعلوم دیوبند میں عرصہ سے اس قسم کی تحریک تھی جن لوگوں کو مولانا حسین احمد صاحب کے خیالات معلوم ہیں یا جنھوں نے مولانا اعزاز علی صاحب کا مقدمہ حماسہ پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان بزرگوں کو اصلاح نصاب کا کس درجہ احساس ہے اس سلسلہ میں پچھلے دنوں دیوبند کے متعدد فضلاء نے پرزور مضامین لکھے جن میں ہمارے لائق دوست جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کو خاص امتیاز حاصل ہے طلباء دارالعلوم کے سامنے ان کا مدلل اور انقلاب انگیز خطبہ عرصہ تک یادگار رہیگا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب یہ کوششیں بارآور ہو رہی ہیں محرم کے مہینے میں دیوبند جانا ہوا تو مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند سے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ مجلس شوریٰ نے اصلاح نصاب کیلئے ایک کمیٹی مقرر کردی ہے جس میں موصوف کے علاوہ مولانا شبیر احمد صاحب، مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا ظہیر الحسن صاحب کاندھلوی شامل ہیں خدا کرے یہ کمیٹی جلد اپنے کام سے فارغ ہوجائے اور آئندہ سال سے نیا نصاب رائج ہوجائے۔

ہمیں توقع ہے کہ ناظرین الندوہ کو یہ معلوم کر کے مسرت ہوگی کہ صوبہ بنگال میں بھی ترمیم نصاب کا مسئلہ زیر غور ہے اس سلسلہ میں انجمن علماء بنگال کے سکریٹری کا ایک خط ہمارے پاس آیا ہے اس کے ساتھ وہ ایک رپورٹ بھی مرتب کر رہے ہیں جس میں ہندوستان کی مشہور دینی درسگاہوں کے حالات درج ہوں گے ہمیں امید ہے کہ اسلامی مدارس کے منتظمین بالخصوص ضلع ڈھاکہ خصوصیت سے اپنی درسگاہوں کے حالات سے مطلع فرمائیں گے۔

اردو کے خلاف عرصہ سے فرقہ وارانہ پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اور اس سلسلہ میں بہت شدومد سے یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں عربی فارسی کے الفاظ کی بہت کثرت ہے لیکن ابھی حال میں اردو کے مشہور ادیب و محقق جناب پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی نے بڑی قوت سے اس غلط فہمی کا پردہ چاک کیا ہے انھوں نے شمار کر کے بتایا کہ اردو کے (۵۴۹۶۰) الفاظ میں سے اکیس ہزار چھ سو ہندی کے الفاظ ہیں سترہ ہزار پانچ سو خالص اردو کے اور صرف تیرہ ہزار چھ سو چھبیس عربی فارسی کے الفاظ ہیں امید ہے کہ اس انکشاف حقیقت کے بعد اردو کو محض عربی فارسی کا مرکب کہنے کی جرأت نہ کی جائے گی۔

عرصہ سے بعض دوستوں کی تجویز یہ ہے کہ الندوہ کے ساتھ ایک دارالاشاعت بھی قائم کیا جائے جس کے ماتحت مفید علمی اور دینی کتابیں شائع ہوں اس مناسب مشورہ پر ہم اپنے دوستوں کے شکر گذار ہیں اور انھیں یقین دلاتے ہیں کہ جوں ہی حالات سازگار ہوئے اس بارہ میں عملی کام شروع کر دیں گے لیکن اس سے پہلے ضرورت ہے کہ خود الندوہ اس قابل ہو جائے کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے ہمیں اپنے دوستوں اور کرم فرماؤں سے امید ہے کہ وہ اس جانب خاص توجہ فرمائیں گے اور کم از کم رسالہ کا ایک ایک خریدار بنا دیں گے۔

میری محسن کتابیں

از مولانا سید طلحہ صاحب ایم اے پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور

ذیل میں ہم اپنے محترم مولانا سید طلحہ صاحب کا مضمون شائع کر رہے ہیں مولانا کا یہ مقالہ ایک ذاتی خط کی شکل میں ہے جس میں موصوف نے مجھے مخاطب کیا ہے اس مضمون سے ایک خاص استاد کا نقطۂ نظر، اس کے ذہنی تاثرات اور تعلیمی تجربات معلوم ہوتے ہیں جو اہل علم اور بالخصوص حضرات مدرسین کے لئے خاص طور پر دلچسپ اور مفید ہوں گے

(ابوالحسن علی)

عربیت اور اس کے متعلقات

ابتدائی تعلیم جیسا کہ عموماً قاعدہ ہے بزرگوں کے جبر و قہر کے ماتحت رہی سب سے اول شوق و ذوق سے جو کتاب پڑھی وہ مقامات حریری تھی اس کا اسلوب قافیہ بندی اور سجع نہایت مرغوب تھا انشا نویسی بھی اسی طرز کی پسند آئی۔ یہ اثر مدتوں قائم رہا۔ بعد میں جاحظ کی انشا اور تیسری صدی کی عام کتب تاریخ پسند آئیں۔ اغانی الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ کے سیاسی خطوط اور نہج البلاغہ نے نہایت متاثر کیا نظم میں معلقات حماسہ قصائد متنبی پسند آئے لیکن مضمون آفرینی کی نسبت شوکت الفاظ جزالت اسلوب زیادہ پسند آئی آج کل عربی نثر خصوصاً بعض مصری جرائد کے مقالات افتتاحیہ دل کو بہت بھاتے۔

صرف و نحو

صرف میں شافیہ اور رضی اچھی معلوم ہوئیں۔ ان کتابوں کا ذوق ایک زمانہ میں اتنا تھا کہ کھانا کھاتے ہوئے تفریح طبع کے لئے کبھی کبھی شافیہ سامنے کھلی ہوتی۔ نحو میں مفصل اور اوضح المسالک اور مغنی اللبیب منتخب کتابیں ہیں سب سے گہرا نقش سیبویہ کی الکتاب کا ہے جو دماغ پر اب بھی ثبت ہے بعض لوگوں کو

شاید گراں گذرنے کا نیہ اور شرح جامی نے کبھی کوئی اثر نہ پیدا کیا۔ اس کو چاہے ہماری کم لیاقتی سمجھو۔ متعلقات لغت اور عربیت میں المزہر للسیوطی بہت پسند آئی۔ ابن رشیق کی کتاب العمدہ بہترین عربی اشعار کا مجموعہ ہے اور کامل مبرد جو عربیت کا خزانہ ہے مجھے بہت پسند ہیں۔

علم حدیث

دل چاہتا ہے کہ اس موضوع پر صفحہ کا صفحہ رنگ ڈالوں لیکن ڈر ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی اکتا جائیں گے عربیت کے شوق سے حدیث کے شوق کو ترقی ہوئی سب سے بڑھ کر ماحول اور خاندانی روایات معاون ہوئیں یعنی حضرت سید عرفان مرحوم اور حضرت سید مصطفیٰ[1] مرحوم جس ماحول میں ہوں وہاں حدیث کا شوق کیونکر نہ ہوگا سب سے زائد محبوب اور مرغوب کتاب امام بخاری کی جامع صحیح ہے جس کی محبت اور شیفتگی عشق کے درجہ کو پہونچ گئی۔ اس کتاب کی محبت کے لئے میں الفاظ نہیں پاتا تمہیں یاد ہوگا کبھی کبھی بے اختیاری میں تمہارے سامنے اس کی کسی حدیث کی اسناد ہی پڑھنے لگتا اور کبھی ترجمۃ الباب اور قال الحسن قال ابن سیرین قال فلاں زبان سے شوق میں نکلتا اس کتاب کی عظمت اور محبت پیدا کرنے میں میرے فاضل استاد مولانا سیف الرحمٰن صاحب مہاجر کابل کو بڑا دخل ہے اس کتاب کے پڑھنے کے زمانہ میں فتح الباری سے فائدہ ہوا اسی وقت سے اسماء الرجال کا شوق اور صحابہ اور طبقات صحابہ کے حالات کی جستجو ہوئی۔ اکثر خیال ہوتا کہ صحابہ کے حالات اس قدر معلوم ہوں کہ گویا ان کو دیکھا ہے کس صحابی کا کس سے کیا رشتہ ہے آنحضرت سے کیا تعلق تھا اور اسی قسم کی دوسری جزئیات معلوم کرنے کا شوق تھا۔

پھر اسی طرح تابعین کے حالات پھر دیگر ائمہ کبار اور رواۃ حدیث کے حالات کا شوق اور ان کی وفیات اور سن پیدائش یاد رکھنے کا ذوق پیدا ہوا۔ طالب علمی ہی میں مسند دارمی اور پوری مسند ابن حنبل

---

[1] مولانا سید عرفان اور مولانا سید مصطفیٰ حضرت سید احمد شہید کے نواسے اور اپنے زمانہ کے جلیل القدر علماء سنت میں تھے اتباع نبوی تورع اور تقوی اور کتاب و سنت کے شغف اور عمل میں دور دور اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔

دیکھی ہو، امام مالک نے بھی خوب متاثر کیا، ان کتب حدیث اور مصنفین کے دماغ پر جو مخلوط اثرات پڑے انکا اگر تجزیہ اور وضاحت کردوں تو یوں کہہ سکتا ہوں کہ امام مالک کی عظمت اور انکی مؤطا کی محبت بھی ہے علاوہ امام بخاری کی ذات کے مقابلہ میں صحیح بخاری سے زیادہ تعلق اور گرویدگی ہے لیکن مسند احمد بن حنبل کے مقابلہ میں امام احمد بن حنبل کی ذات سے زیادہ محبت اور تعلق معلوم ہوتا ہے اسکی وجہ نہیں بتلا سکتا۔

افسوس صحیح مسلم کا کوئی اثر دماغ پر نہیں رہا، یوں حدیث کی تقریباً سب کتابیں اساتذہ سے پڑھیں میرے تمام تر اساتذہ حنفی تھے اور میں حنفیت کے اس احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا کہ انکی شاگردی نے ایک قسم کا اعتدال پیدا کردیا ورنہ میں سخت جامد غیر مقلد ہوتا۔ زاد المعاد بظاہر سیرت کی کتاب ہے لیکن میرے نزدیک حدیث کے اہم مسائل کا ایک مختصر کتبخانہ ہے۔

قرآن و تفسیر

تم تفسیر کے معلم ہو قرآن و تفسیر کے متعلق سننا چاہتے ہوگے۔ بھائی بناوٹ سے کچھ کہدینا یہ تاثر رہا ہے باعتبار عربیت کے قرآن کے اسلوب اور خیالات کا اثر اس وقت سے قایم ہوا جب عربیت کی ایک حد تک تحصیل کرلی اور اسی بات نے حفظ کا شوق دلایا معانی بیان کی درسی کتابوں سے یہ اثر اور گہرا ہوا اور قرآن پر دو حیثیتوں سے نظر ڈالی احکام فقہیہ یا دیگر مسائل کا استنباط۔ دوسرے عربیت کے نکات اور لغوی مسائل۔ چنانچہ الاکلیل فی استنباط التنزیل للسیوطی اور تفسیر احمدی بہت پسند تھی۔ ابوبکر ابن العربی اور جصاص کی احکام القرآن اس وقت تک مجھے نہیں ملی تھی، استنباط مسائل کا اسقدر شوق تھا کہ آیت مادمت علیہ قائماً سے دیوانی کے قیدی کا محبوس رکھنا استنباط کیا اور پھر کتاب سے اسکی تائید ہوئی کبھی استدلال اوقعن کی دلیل ڈھونڈھی غرض یہ سب اعتدالیات سمجھو یا ماحول اور نصاب کا اثر بہرحال ایک عرصہ تک یہ شوق رہا قرآن کے محاسن لفظی کے سلسلہ میں کشاف پوری مطالعہ کی اسی سلسلہ میں مفتاح العلوم للسکاکی الطراز اور دلائل الاعجاز مطالعہ کیں بعض چیزوں کی تحقیق میں تفسیر کبیر کی طرف بھی رجوع کرتا عجیب بات ہے کہ

قصص بنی اسرائیل اور حضرت داؤد وغیرہ کے قصہ کا اشکال کبھی محسوس نہیں ہوا، قصہ غرانیق، قصہ صواع الملک کی تحقیق کا شوق کبھی بھی نہیں ہوا، نہ ربط آیات اور قسم اور جواب قسم کے متعلق کے مسائل سے حقیقی دلچسپی پیدا ہوئی، قرآن کے متعلق میرا نظریہ یہ ہے کہ یہ کتاب عزیز جلیل القدر کتاب آسمانی صحیفہ ربانی علوم و معارف کا گنجینہ ہے جو ہدایت و رہبری کے لئے کافی ہے خشیت الٰہی ایمان بالآخرت ایمان بالقیامت جسقدر اس کی تلاوت سے پیدا ہو سکتا ہے دنیا کی کسی تحریر و تقریر اور کسی انشاء سے نہیں ہو سکتا لیکن اس دنیا ناپائیدار کی چیز، عالم آخرت کی تفاصیل انسان ضعیف البنیان کی سمجھ میں اس کتاب سے نہیں آسکتیں یہ کمزوری انسان کی ہے نہ کہ کتاب عزیز کی، مثال کے لئے ایک آیت پیش کرتا ہوں وعاشروھن بالمعروف ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف کیا انسان اس سے وہ تمام تر تفصیلات و تعلقات زناشوئی سمجھ سکتا ہے جو کسی حدیث کی کتاب کی تفصیلات سے سمجھ سکے گا جنٹلین[1] ان تفصیلات کو تقدس کے دامن پر دھبہ سمجھتے ہیں جنکی مثالیں ہم خباثت اور خبیثات کے ذکر میں گذر گئی ہے اسی سلسلہ پر عبادات، آداب طعام و آداب شرب کو قیاس کر لو۔ ایک اور نظریہ قرآن کے متعلق ہے اور وہ پہلے کی تفصیل ہے وہ یہ کہ بغیر احادیث کی روشنی کے کوئی نو مسلم راسخ الایمان محض قرآن کو عقیدت سے پڑھے تو دنیا کی کسی چیز میں اس کو لطف نہ آئیگا اور وہ محض آخرت کا آدمی ہو جائے گا یہ انسانی فطرت کی کمزوری ہے یہ اعتدال حدیث سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے لئے آنحضرت کی ذات اور آپ کا اسوہ ہے جنھوں نے قرآن پر عمل کرنے کا صحیح ترین اور معتدل نمونہ پیش کیا اس عملی تفسیر کو الگ کر کے آدمی اس بے اعتدالی سے بچ نہیں سکتا۔

علم تصوف

احیاء العلوم اور مثنوی مولانا روم خود دیکھیں اور پسند آئیں تمہارے والد ماجد مرحوم[2] ایسے کیا آدمی تھے انکی کون کون سی باتیں یاد کروں، ان کے مشورہ سے رسالہ قشیریہ، عوارف للسہروردی، فتوح الغیب

۱۔ جنٹلمین کی جمع اور مولانا کی مخصوص اصطلاح ہے ۲۔ مولانا حکیم سید عبدالحئی مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء

سمجھا ہو گا فتوح الغیب نے اس قدر دل و دماغ پر اثر کیا تھا کہ کسی انسان کی تصنیف نے وہ اثر نہ کیا ہو گا حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات کا ایک اثر انتہا درجہ کا ہوا اور وہ یہ کہ تصوف کے مقابلہ میں شریعت کی عظمت دل پر نقش ہو گئی اور یہ اسی کتاب کا فیض ہے مثنوی اس لئے بھی پسند آئی کہ علم کلام اور تصوف کے مسائل نہایت خوش اسلوبی سے خلط کئے ہیں غزالی کی تصنیفات اکثر پسند آئیں فیصل التفرقہ بین الاسلام والزندقہ خاصی اچھی معلوم ہوئی شیخ اکبر کی فتوحات کبھی طائرانہ نظر سے دیکھی کبھی کوئی نکتہ پسند آیا لیکن نہ اس کتاب کا شوق نہ اس سے بدشوقی کا افسوس ہے۔

معقولات اور علم کلام

تمہیں تعجب ہو گا کہ ایام خواندگی میں جس قدر شوق سے دو کتابیں پڑھیں کوئی کتاب نہ پڑھی ایک بخاری دوسری حمد اللہ میں مجبوراً یہ لکھ رہا ہوں صدرا کی بحث جزء لا یتجزیٰ بھی شوق سے پڑھی شرح مواقف کا طرز پسندیدہ ہے شمس بازغہ بھی پسند آتی ہے۔

اصول فقہ اور فقہ

فقہ حنبلی کی کتاب المغنی نہایت پسند ہے لیکن مطالعہ میں نہیں رہی فقہ حنفی میں ہدایہ کو ایسی کتاب سمجھتا ہوں کہ آدمی کو اہل عراق کی فقہ سے اس کے ذریعہ سے کامل مناسبت پیدا ہو جاتی ہے اصول فقہ میں تحریر ابن الہمام اور توضیح و تلویح مجھے پسند ہے اجماع کی بحث جیسی تم توضیح میں دیکھو گے کہیں اور نہ ملے گی اس ایک بات کہتا ہوں وہ میرا نظریہ بلکہ عقیدہ ہے غالباً شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی کہیں اشارہ کیا ہے اصول فقہ مجتہد فیہ فقہی مسائل کی ایک توجیہ ہے جیسے نکات بعد الوقوع ہوتے ہیں اس کے باوجود اس فن سے مجھے طبعی ذوق ہے۔

امام ابن تیمیہ اور ابن قیم کی تصنیفات

شیخ الاسلام کی کتابوں میں سب سے پہلی کتاب ان کے فتاویٰ دیکھے اس کا نہایت اچھا اثر پڑا اور

ان سے انتہائی عقیدت پیدا ہوگئی پھر تو ہر کتاب انکی پسند آئی اور معلوم ہوا کہ متاخرین میں سے اگر کسی نے پہلے اسلام کی طرف دعوت دی تو وہ یہ دونوں بزرگ ہیں شیخ الاسلام کی کتابوں میں مضامین کی ترتیب و تہذیب اعلیٰ معنی میں نہیں ہے انکی پر از مصائب زندگی کا یہی مقتضیٰ تھا الغرض نہایت درجہ عقیدت ان صاحبوں سے ہوئی لیکن خدا کا شکر ہے کہ بعض مسائل میں انکی ہم آہنگی نہ کی مثلاً طلاق ثلاث فی مجلس واحد یا عصمت انبیا کے متعلق انکی رائے سے اختلاف ہے حافظ ابن قیم کی تصانیف میں سے زاد المعاد خاص طور سے قابل ذکر ہے میں لکھ چکا ہوں کہ میرے نزدیک وہ احادیث کا بہترین مختصر کتب خانہ ہے تم کو تعجب ہوگا مولانا سید عرفان رحمۃ اللہ علیہ (میرے رشتہ کے ماموں اور حضرت سید شہید کے حقیقی نواسہ) کبھی کبھی تشریف لاکر زاد المعاد جو ہمارے یہاں تھی مانگ کر دیکھنے لے جاتے ان کے بعد میں دیکھتا تو نہ لطف آتا نہ قدر معلوم ہوتی آج میں اسکی قدر سمجھتا ہوں حافظ ابن قیم کی شفاء العلیل بھی مجھے بہت پسند آئی نہایت عمدہ کتاب ہے اس میں قضا و قدر کے مسائل میں منشاء خیر و شر پر خوب بحث ہے۔

شعر فہمی

اس عنوان سے تم کو تعجب ہوگا میرا عقیدہ تھا اور اب بھی ہے کہ رائج الوقت نصاب درس سے یہ ذوق لطیف نہیں پیدا ہوتا ہے میں اس کو نہایت ضروری سمجھتا ہوں لوگوں کو کہتے سنا کرتا تھا کہ مولوی شعر کیا جانیں یہ شعر من بہ مدرسہ کہ برد مشہورات ہے نصاب درس کے اس نقص کی تلافی کتب ذیل سے کی اور انھوں نے مجھے فائدہ پہونچایا۔

آبحیات، تذکرہ گلشن بے خار، گل رعنا، مقدمہ دیوان حالی، شعر العجم، سب سے زیادہ فائدہ موخر الذکر نے پہونچایا، واقعی یہ کتاب مجتہدانہ طرز کی ہے مصنف کے مخالف بھی اس کتاب کے معترف ہیں گل رعنا کے نام پر مجھے وہ واقعہ یاد آگیا جس کو سنائے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا میں لاہور سے چھٹیوں پر آیا ہوا تھا تمھارے

والد مرحوم اور میں دوپہر کے وقت تھا رے مسجد لکھنؤ کے گھر کے مشرقی شمالی کمرہ میں سونے کے لئے لیٹے تھے مرحوم فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کا کلام بھی کران دو مہینوں میں ایک کام کیا ہے اور شعرائے اردو کا تذکرہ گل رعنا کے نام سے مرتب کرلیا ہے اس میں خصوصیت کے ساتھ مرزا صاحب کا کلام جہاں تک مل سکا ہے جمع کر دیا ہے ایک مصنف خود اپنی تصنیف اور سرچ ورک سنا رہا ہے لیکن ہم دوپہر کے سونے کے بیمار بدمذاقی سے غنودہ کر ترنگ میں سو رہے ہیں اور یہ نہیں معلوم کہ یکایک اس مخلص بزرگ کے انتقال کی خبر پہنچے گی۔

مختلطات

مندرجہ ذیل کتابوں میں سے ہر ایک مستقل کتب خانہ اور حلیات کا خزانہ ہے۔ زاد المعاد، حجۃ اللہ، اور مقدمہ ابن خلدون آخر میں ایک بات لکھ کر ختم کرتا ہوں طالب علم کے لئے جب کچھ استعداد ہو جائے ایک مجموعہ کتب ضرور اسکی مرضی پر چھوڑا جائے لیکن کبھی کبھی مشورہ بھی دیا جائے اس بات نے تم کو بھی فائدہ پہونچایا ہے اور مجھے بھی لیکن تمھارا مکتبہ ایک صدی سے اوپر زیادہ کا مجموعہ تھا اور علماء کا جمع کیا ہوا میرے یہاں کا مجموعہ محض نستعلیقی اور خوش سلیقگی کی تکمیل کے لئے جمع ہوا تھا۔

ضمیمہ میری محسن کتابیں

از جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خانصاحب شروانی

عنوان بالا پر جو مقالہ میں نے لکھا اس میں سہو سے اتفاق سے دو کتابوں کا ذکر رہ گیا۔ حالانکہ ان کا احسان عظیم تھا۔ دل محسوس کرتا رہا ہے کہ ان کا ذکر نہ کرنا احسان فراموشی ہے۔ اس لئے ضمیمہ پیش ہے وہ دونوں کتابیں یہ ہیں۔

(۱) بستان المحدثین شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی۔ محدثین کی تصانیف کے بیان میں تصنیف کے ذکر کے ضمن میں مصنف کا ذکر بھی تفصیل و تحقیق سے فرمایا ہے۔ یہ کتاب عرصے تک مطالعہ میں رہی۔ بزرگوں کے کتابخانے سے اتفاقاً پرانا مطبوعہ نسخہ مل گیا تھا۔ شوق سے بار بار پڑھا۔ صاف و سنجیدہ عبارت میں حالات و واقعات تحقیق کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ علمائے سلف وغیرہ رسائل کی تالیف میں جو تھوڑی بہت کامیابی مجھکو ہوئی اسکی اصل وہ ذوق ہے جو اس کتاب کے مطالعہ سے پیدا ہوا۔[1] رحمہ اللہ تعالیٰ مصنفہ۔

(۲) دو رسالے تصوف کے۔ ایک حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے حالات میں مولفہ حضرت شاہ غلام علی صاحبؒ دوسرا حضرت شاہ غلام علی کے حالات میں۔ نوشتہ شاہ عبد الغنی صاحب مجددی۔ یہ رسالے بھی اتفاقاً بزرگوں کی کتابوں میں سے ہاتھ آگئے تھے۔ سعادت تھی کہ دیکھکر شوق پیدا ہوا بستان المحدثین کی طرح عرصے تک مطالعہ کیا۔ یہ رسالے بھی مطبوعہ قدیم ہیں۔ حالات صاف اور سنجیدہ عبارت میں مبالغہ اور اغراق سے پاک محققانہ و چشم دیدہ بیان فرمائے ہیں۔ ان رسالوں کے مطالعہ سے یہ ذوق پیدا ہوا کہ تصوف کو بجائے مباحث کے حالات و واقعات کے آئینے میں دیکھا جائے۔ الحمد للہ یہی ذوق اب تک کارفرما ہے۔ بزرگان وقت سے ملنے اور ان کے متعلق خیال و عقیدت کے پیدا ہونے میں بھی یہی ذوق کارفرما رہا رضی اللہ تعالیٰ عن مصنفیہما۔

---

[1] علمائے سلف کی تالیف میں بستان المحدثین سے بھی مدد لی گئی ہے

حدیث کا ابتدائی تحریری سرمایہ

از عبدالسلام قدوائی

(۴)

حضرت عبداللہ ابن مسعود کی روایتیں یہی نہیں کہ صرف چند آدمی ان کے سامنے بیٹھ کر لکھتے ہوں بلکہ بہت سے ایسے بھی لوگ تھے جو ان کے پاس سے حدیثیں سن کر گھروں میں جا کر لکھتے تھے[۱]۔ یہ طریقہ خاص طور سے لوگوں نے اس زمانہ میں اختیار کیا تھا جب حضرت عبداللہ حدیثوں کو قید تحریر میں لانے کے مخالف تھے اس ترکیب سے ان کی ابتدائی زمانہ کی مرویات بھی کتابی شکل میں مرتب ہو گئی تھیں۔ تلامذہ اور عقیدت مندوں کی ان کوششوں کے علاوہ خود حضرت عبداللہ نے بھی کافی حدیثیں جمع کی تھیں جو ایک کتاب کے برابر ہو گئی تھیں انتقال کے بعد یہ مجموعہ ان کے گھر سے برآمد ہوا ان کے بیٹے عبدالرحمٰن نے قسمیں کھا کھا کر لوگوں سے کہا کہ یہ کتاب خود حضرت عبداللہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے[۲]۔

حضرت ابن مسعود کی روایات علماء کے نزدیک بڑی اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ اول تو انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت بابرکت میں حاضری کا کافی شرف حاصل رہا ہے اس کے علاوہ احادیث کی روایت میں الفاظ کی صحت کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے اور اپنے شاگردوں کو بھی اسکی تاکید کرتے تھے[۳] ان تمام خوبیوں کے ساتھ فہم و بصیرت اور علم و تفقہ میں بہت ممتاز تھے اور تبلار فقہا میں شمار ہوتے تھے[۴]۔

صحابہ میں حضرت زید ابن ثابت بھی بہت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں انہیں اتنا تقرب حاصل تھا کہ کتابت وحی کے فرائض انجام دیتے تھے آپ کے حسب ارشاد عبرانی زبان سیکھی تھی اور اس میں آپ کی ترجمانی کرتے تھے صحابہ کی نظر میں بھی ان کی بہت اہمیت تھی حضرت

---

۱ دارمی ص۲۶ ۲ جامع ص۲۳ ۳ تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص۱۳ ۴ ایضاً تذکرہ ص۱۳

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں جمع قرآن کی خدمت انھیں کے سپرد کی تھی پھر حضرت عثمانؓ نے جب صدیقی کے مرتب شدہ مصحف کی نقل دیار و امصار میں بھجوائی تو نقل و کتابت کا کام انھیں زید ابن ثابتؓ کے سپرد کیا[1] حضرت عبداللہ ابن عباس کے جیسے کثیر العلم صحابی انھیں راسخین فی العلم میں شمار کرتے تھے حضرت ابوہریرہ جو اپنی کثرت روایت اور ذوق علم میں مشہور ہیں وہ بھی حضرت زید کی وسعت علم کے قائل ہیں چنانچہ جب انکی وفات ہوئی تو فرمایا کہ مات حبر الامۃ اس امت کا غیر معمولی عالم وفات پا گیا[2]۔

ان خصوصیات کی بنا پر لوگوں کو خیال تھا کہ کسی طرح حضرت زید کی روایات بھی کتابی شکل میں مرتب ہو جائیں لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ کتابت حدیث کو پسند نہیں کرتے تھے ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے ان کی بیان کردہ حدیثیں قلمبند کرائیں لیکن جب انھیں معلوم ہوا تو مٹا دیں[3] بالآخر مروان نے خاص ترکیب سے انکی روایتیں قلمبند کرائیں اس نے ایک پردہ ڈلوا دیا اور اس کے پیچھے ایک آدمی کو بٹھا دیا پھر حضرت زید کو بلا کر ان سے حدیثیں دریافت کرنے لگا وہ حدیثیں بیان کرتے اور پس پردہ مقرر شدہ آدمی انھیں لکھتا جاتا[4]۔ مروان کے علاوہ حضرت زید کے ایک اور نامور شاگرد جناب عروہ بن زبیرؓ بھی ہیں انھیں اور ان کے صاحبزادے ہشام کو کتابت حدیث کا جس قدر خیال اور اس جانب جتنی توجہ تھی اس کا ذکر پچھلی اشاعت میں ہو چکا ہے۔

آنحضرتؐ کے خادم حضرت ابورافع کی روایتیں حضرت عبداللہ ابن عباس نے جمع کر لی تھیں[5] حضرت سمرہ ابن جندب ایک اور مشہور صحابی ہیں انکی روایتیں بھی انکی زندگی ہی میں مرتب ہو گئی تھیں یہ مجموعہ عرصہ تک ان کے خاندان میں محفوظ رہا انکے پوتے خبیب نے اس سے دیکھ کر روایتیں لکھیں[6]۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص۳۰ [2] تذکرہ جلد اول ص۱۷ [3] جامع بیان العلم ص۱۲ [4] دارمی ص۶۲ [5] خطبات مدراس بحوالہ الطبقات ابن سعد جلد ۲ قسم ۲ ص۱۲۳ [6] تہذیب التہذیب جلد ۴ ص۱۹۵

حضرت رافع ابن خدیج کے پاس آنحضرت کے بعض اقوال تحریری شکل میں موجود تھے[۱]

حضرت مغیرہ ابن شعبہ نے بھی بعض حدیثیں قلمبند کیں ایک مرتبہ حضرت معاویہ نے ان سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد کیا پڑھا کرتے تھے اس کے جواب میں انھوں نے وہ دعا لکھ کر بھیجی[۲]

حضرت براء ابن عازب ایک اور نامور صحابی ہیں انکی روایتیں بھی انکی زندگی ہی میں تحریری شکل میں مرتب ہو گئی تھیں ان کے شاگردوں کے شوق کتابت کا یہ حال تھا کہ کاغذ موجود نہ ہوتا تو ہتھیلیوں ہی پہ لکھ لیتے جنھیں پھر صاف کر لیتے[۳] حضرت سعد ابن عبادہ قبیلہ خزرج کے سردار اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب خاص تھے انھوں نے بھی حدیثیں کتابی شکل میں جمع کی تھیں جو ان کے بیٹے کے پاس بعد کو بھی موجود رہیں اور جنھیں انھوں نے اپنے شاگردوں تک پہونچایا[۴]

حضرت عبداللہ ابن ابی اوفی ایک خاص صحابی ہیں انھوں نے بھی حدیثیں لکھی تھیں ان کے شاگردوں نے ان کی تحریری روایتیں بعد کے لوگوں سے بیان کیں چنانچہ بخاری کی ایک روایت کے سلسلہ میں ایک صاحب سالم ابوالنضر کا بیان ہے کہ عبداللہ ابن ابی اوفی نے لکھا جسے میں نے پڑھا[۵]

حضرت حسن ابن علی رضی اللہ عنہما کی اہمیت محتاج تشریح نہیں آپ کو بھی جمع و تحریر احادیث سے خاص دلچسپی تھی وہ اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کو نصیحت کرتے تھے کہ

تعلموا العلم فانکم ان تکونوا صغار	علم حاصل کرو کیوں کہ اگر آج تم قوم
قوم تکونوا کبارھم غدا فمن لم	میں چھوٹے ہو تو کل ان کے بڑے ہو گے
یحفظ فلیکتب[۶]	جو یاد نہ کر سکے اسے چاہئے کہ لکھ لے۔

۱؎ مسند احمد ابن حنبل جلد ۴ ص ۱۴۱ ۲؎ ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب ما یقول الرجل اذا سلم
۳؎ دارمی ص ۶۹ ۴؎ ترمذی جلد اول باب القضاء بالیمین مع الشاہد ۵؎ بخاری جلد اول کتاب الجہاد
باب الصبر عند القتال ۶؎ جامع بیان العلم ص ۸۲

حضرت معاویہؓ حضرت ثوبانؓ اور حضرت ابو امامہؓ کی مرویات ان کے شاگرد خالد ابن معدان کے ذریعہ تحریری شکل میں مرتب ہوئیں انھوں نے ستر صحابہؓ سے ملاقات کی تھی تحریر و تدوین کی جانب اتنی توجہ تھی ان کے پاس ایک خاص باقاعدہ کتاب مرتب ہوگئی تھی۔[1]

مکثرین صحابہ کی تقریباً پچیس ہزار روایتوں کا ذکر گذشتہ اشاعت میں ہو چکا ہے جو ان کے سامنے ہی تحریر کا قالب اختیار کر چکی تھیں۔ آپ کی صحبت میں چند اور مشہور صحابہ کے تحریری مجموعوں کا ذکر کیا گیا ہے جو یقیناً ہزاروں روایتوں پر مشتمل تھے لیکن یہ تعداد یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس میں خلفاء راشدین اور صحابہ کرام کے ان ہزاروں بلکہ لاکھوں خطوط کو بھی شامل کرنا چاہئے جو انھوں نے اپنے زمانہ خلافت میں عمال، فوجی افسروں، معلمین و محصلین کے نام لکھے اور ان افسروں اور عاملوں کی جانب سے جو احکام و فرامین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی روشنی میں لکھے گئے اس طرح صحابہ کرام کے زمانہ ہی میں احادیث کے بہت سے مستقل اور بڑے بڑے کتابی مجموعوں کے علاوہ سارے اسلامی ممالک میں بے شمار تحریری روایتیں پھیلی ہوئی تھیں

[1] تذکرہ ص ۴۳ جلد اول و تہذیب جلد ۳ ص۱۱۹

یادِ ایّام

شب بود و صد ہزار تماشائے دلفریب
صبح از کرانہ سر زدہ دیدم کہ خواب بود
(شبلی)

معتمد تعلیم کا اصلی کام تو تعلیم کی نگرانی تھی مگر کام چلانے کے لئے بڑی چیز روپیہ ہے اسکی فراہمی بھلت پھرت والے شخص پر پڑ جاتی ہے ہمارے علامہ کی شخصیت نے خود ان سب کاموں کا ذمہ لے لیا لینا ایک سر ہزار سودا ہو گیا، دارالعلوم کی نگرانی ملک میں اسکی تبلیغ، روپیہ فراہم کرنا، رسالۃ الندوہ جو خود انکی ایجاد تھا چلانا اور ابتدا میں اس کو خود ہی بھرنا طباعت کی فکر اور نگرانی شعرالعجم کی تصنیف یہ کیا کچھ کم شامل تھے۔

علامہ کا معمول یہ تھا کہ شب کو ۹ بجتے بجتے سو جاتے کھانا عموماً بعد مغرب تناول فرما لیتے کھانے میں گوشت اور وہ بھی بھنے ہوئے تار پر مصالحہ دار کا شوق تھا خود بھی کھانا عمدہ پکا لیتے چار بجے صبح سے اٹھ بیٹھتے لیمپ کے چولہے پر چاء کی کیتلی رکھ دیتے شب کو خدمتگار سب سامان قرینہ سے رکھکر چلا جاتا آپ ہی چاء بنا کر پیتے شاعری کا وہی وقت تھا اول نماز سے فراغت کرکے کچھ تلاوت بھی کر لیتے پھر بستر پر یا کبھی فرش پر بیٹھکر تصنیف شروع ہو جاتی، اور یہ شغل صبح کو آٹھ بجے تک ختم ہو جاتا فرماتے تھے کہ بھائی، یہ وقت اپنا ہوتا ہے بلا خلت غیرے جو چاہو کرو۔ پھر تو جناب دنیا بھر کے شغلے چھڑ جاتے لوگ آنے والے کیا کم تھے میرے لئے کوئی پابندی نہ تھی کیونکہ اگر بے وقت بھی جا نکلا جاتا تو چپ چاپ ایک کونے میں انکو مشغول پا کر بیٹھا رہتا جب وہ خود مخاطب ہوتے تو چونکتا مجھکو اس علم کے دیوتا کیساتھ محویت تھی اگر کوئی فکر کلام کرتے یا کوئی نئی تحقیق ہوتی تو سب سے پہلے میں ہی سن لیتا جس زمانہ میں کسی تصنیف کو تیز رفتاری سے ختم کرتا ہوتا یا الندوہ بھرنا ہوتا تو اس زمانہ میں

اس وقت میں توسیع ہو جاتی دس بجے تک میں نے ایک مرتبہ عرض کیا یہ بات نوٹس چاہتی ہے لہٰذا دروازہ پر لکھ کر لگا دیجئے کہ احباب معاف فرمائیں میں دس بجے تک مصروف رہوں گا۔ دس گیارہ بجے کے درمیان کھانا کھاتے اس وقت بھی وہی ایک مرغوب غذا ہوتی دو قسم کے کھانے کم ہوتے تھے اس کے بعد اگر کوئی بے وقت آنے والا نہ آدھمکا تو دارالعلوم میں اتر کر آتے اور تعلیم کی نگرانی فرماتے یا مدرسین خالی اوقات مدرسین خود انشہ میں چلے جاتے ہر فن کی تعلیم کے بابت ان کو ہدایتیں فرماتے اور کبھی کتاب منگا کر خود پڑھ کر ان کو پڑھانا بتاتے۔ شروع میں بعد فراغت کچھ درسیات کی تعلیم دی تھی فرماتے تھے کہ میری صرف و نحو کمزور تھی وہ پڑھانے سے درست ہو گئی اس کے بعد تو علی گڑھ میں عربی فارسی کے درجوں کے کھلنے رہنے اور امتحان پاس کرنے کے سوا طلبہ کا رخ نہ رہ گیا تھا مگر اب بھی درسی علم حاضر تھا۔

یہ بھی ان پر خدا کی رحمت تھی کہ باوجود صحت کی اتنی خرابی کے دماغ صاف رہتا کہ سخت بخار کی حالت میں بھی وہ ساہی الفواد کبھی نہ ہوتے فرماتے تھے کہ اس قدر سخت قبض اور بواسیر کی تکالیف کے اثرات حلق تک رہتے ہیں دماغ کی طرف صعود نہیں کرتے لہٰذا بخار میں اور بخار تو کشمیری تحفہ تھا اکثر آ جاتا تصنیف کا کام نہ رکتا البتہ کتب بینی بند ہو جاتی مگر باتیں کرنے کا شوق تھا اس میں کوئی کمی نہ ہوتی شدت تکلیف میں چند منٹ کراہ لیتے پھر ہلکے ہو جاتے ملیریا کا بخار تھا سردی بھی لگتی تھی اس لئے لحاف یا کمل بستر سے کم ہٹتا۔ الکلام تو ساری کی ساری شدت بخار میں تصنیف کی مگر اس کی ٹھنڈک تو دیکھئے کہ کسی پر بھی بخار نہ تھا لاحق کہ ملاحدہ کے اعتراضات کے جواب میں بھی ان کا وہی اعتدال قائم رہا اور کہیں قلم نہ تیز ہوا ۱۲ سے ۴ تک کا وقت عموماً مطالعہ اور فراہمی مواد میں صرف فرماتے اس کے بعد اگر احباب آ جاتے تو خیر نہیں تو ٹہلنے کو نکل جاتے اور دور دور تک چلے جاتے میں اکثر ساتھ ہوتا دنیا بھر کے اگلے پچھلے عام دلچسپی کے واقعات کا ذکر رہتا علامہ حقہ اور پان کے تکلف سے بری تھے البتہ پان صرف شکر دان اور پیچہ تھا مگر وہ بھی لکھتے وقت جب کوئی طبیب ٹوک دیتا تو

دو چار دن گھر میں تساہلی فرماتے مگر پھر وہ سامنے آجاتا تیز شہابی کا بید شوق تھا لکھنی کے چاولوں میں شکر ڈاکٹر کہا تھا انہیں کو دیکھا مزاج میں اضطراب ہمیشہ کا تھا لکھتے وقت بھی اعضاء وجوارح متحرک ہو ہو جاتے ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک ڈاڑھ گرگئی فرمایا بھائی ایک ساعر بہ جسم خاکی کا ختم ہوا میں نے عرض کیا کہ بنوا لیجئے راضی ہو گئے جب ٹہلنے نکلے تو ڈاکٹر کرم حسین بھنوں کو یاد ہوں گے جنکی دوکان امین آباد کے چوراہے پر تھی اور بہت جوشیلے مسلمان تھے ان کے یہاں پہونچے ڈاکٹر صاحب فخر کے ساتھ خدمت کو مستعد ہو گئے چربہ لیا دوسرے دن شام کو دانت تیار تھا اس کو نصب کر دیا ٹہلنے چلے گئے راہ بھر خلش رہی اور خلش تو ہوتی ہی ہے غرض گھر پہونچتے پہونچتے اس کو نکال کر الماری میں ڈال دیا اور فرمایا بھائی یہ دوسری کون بول لے اصل' نقل میں بڑا فرق ہے مگر اسی شخص کی ہمت کی داد دیجئے کہ جب پاؤں کٹا تو مصنوعی پاؤں اور اسکی بندشوں کو برداشت کر کے تمام قومی تحریکوں میں حصہ لینے دور دراز کے سفر کرتے اور گھنٹوں کھڑے کھڑے تقریریں کرتے علامہ کو میرے ساتھ بڑی محبت اور خصوصیت تھی میں انکی صحبتوں سے بہت کم جدا ہوتا خواہ علماء کا مجمع ہو یا بے تکلف احباب اور طلبہ کا جمگھٹ اسی وجہ سے انکے ہر قسم کے حالات پر میری نظر رہی جیسے وہ تھے پھر آزاد ہو کر ندوہ کا پبلک کام کر کے اس کے مشکلات دیکھکر رفتار زمانہ پہچانکر انکے اگلے خیالات میں جو جو انقلاب اور جن جن وجوہ سے وہ پیدا ہوئے سب آئینے کی طرح میرے سامنے ہیں اپنی اپنی جگہ انکی جھلک نظر آتی جائیگی اور جو کچھ لکھوں گا وہ صاف صاف بلا رو رعایت۔ انسان ایک تغیر پذیر مخلوق ہے اور تغیرات عالم سے جو سمجھکر متغیر ہو وہی کامل انسان ہے ہوا سے لوٹنا سرنگی ہے انسانیت یا شجاعت نہیں ہے!

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتک دار العلوم قدیم رنگ کے جدت پسند بزرگوں کے ہاتھوں میں تھا جن میں دینداری کے ساتھ تقشف اور قدامت پرستی کے اثرات کافی موجود تھے۔ مگر ہم سب نوجوان تھے جوانی کے ولولوں سے بھرے حدیث پڑھتے تو تقلید کے دائرے سے باہر ہو جاتے علم کلام دیکھتے تو عقلیت

کی طرف رجحان زیادہ ہو جاتا ادب کے متعلق باوجود ادبی قابلیت کے لطائف شعری کا لطف اٹھاتے مگر تنقید سے نابلد تھے تاریخ کو ایک ادبی مشغلہ سمجھتے نفح الطیب اس لئے دیکھتے کہ اس کے کثیر اشعار کا لطف اٹھائیں اگر کبھی عیون الانباء اٹھا لیتے تو اس کے شعر پہلے پڑھ لیتے ابن خلکان میں مشہور ادیبوں کے حالات اور کلام کا مزہ لیتے مگر تاریخ پر نظر مورخانہ نہ کرتے ابن خلدون نے سب سے پہلے میری آنکھیں کھولیں جس علم کا قاعدہ ہے کہ جب طالب علم کی گرہ کا کچھ ہو تو یہ خوب رچتا ہے ورنہ برا خفش وغیرہ لوگ مدرسوں اور یونیورسٹیوں سے ہزاروں کی تعداد میں نکلتے ہیں مگر اس میں اخفش کی کیا خطا ہے!

اب جب ہمارے علامہ دار العلوم میں قدم رنجہ فرما چکے تو میری وہ تکلیف جو ہمارے مولانا کے تشریف لیجانے سے تھی رفع ہونے لگی اور نعم البدل پاکر یہ پژمردہ دل شباب علم کے ولولوں سے لبریز ہوکر چھلکنے لگا ہر مشکل کا حل سامنے تھا ہر گتھی سلجھانے والی انگلیاں چلنے لگتی تھیں بندھے ہوئے عقدے ایک ادنیٰ سے اشارہ میں کھل کھل جاتے اس منزل علم کے لئے ایسے ہی رہبر کی ضرورت تھی مجھکو حیدرآباد سے لکھ چکے تھے میں آؤں تو تمہاری تعلیم اپنے ہاتھ میں لوں۔ میں نے حماسہ شروع کیا تھا فرمایا کہ بھائی جب ہم حماسہ پڑھتے تھے اور اس کے بعد بھی مدتوں یہ معمول رہا کہ فجر کو تلاوت کے بعد اس کا بھی ایک ورد کر لیتے تھے شاگرد نے استاد کی یہ بات گرہ باندھی اور اس پر عمل شروع کر دیا یہ پہلا سبق تھا جو علامہ سے مجھکو ملا۔

اب دار العلوم کے نصاب میں انگریزی کی تعلیم لازمی ہو جاتی ہے جس کو یہاں کے اہل حل و عقد اختیاری کئے ہوئے تھے اور ایک حد تک وہ حق بجانب بھی تھے کیونکہ اب بھی ایسے طلبہ آجاتے تھے جن کے والدین انگریزی پڑھانا مکروہ سمجھتے تھے لیکن یہ تا کے اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بہت سے طلبہ بلا وجہ بھی دم چراتے تھے پڑھنے والے چند ہی طلبہ تھے اور مدرسین دو دو۔

اب نصاب کی کایا پلٹ تنقیدی اور تاریخی پہلو کو لئے ہوتی ہے مجھکو یہ بتانا ہے کہ اب

ہم نے کیا سیکھنا شروع کیا فن شعر سے مجھکو ہمیشہ دلچسپی تھی لہذا اب جب ہم کو نقد الشعر ابن قدامہ پڑھائی گئی تو کتنا لطف کہاں سے کیا ہو گیا۔ یہ کتاب مصر کے مطبع الجوائب میں صاف ستھرے ٹائپ اور اچھے کاغذ پر چھپی تھی مگر جیسا عموماً مصری مطبوعات میں ہوتا ہے بسیار خوشخط و بسیار غلط۔ یہ زحمت جو پیش آئی تو ہمارے علامہ کو اس پر مستقل محنت کرنا پڑی سیکڑوں شعرا کا کلام اور وہ بھی متفرق اس کی صحت کے لئے ہمارے استاد مولوی سید علی صاحب قبلہ اور خود علامہ دونوں کو بڑی جانکاہی کرنا اور جوئے شیر لانا پڑا یہ طریقہ جستجو خود سبق آموز تھا۔ الحمد للہ اس وقت جو محنت ہو چکی تھی وہ بہت کام آئی میں نے اپنے صوبے کے فاضل لوب میں جب اس کو رکھنا چاہا تو اسی نسخہ کو کچھ مزید صحت کے بعد مولانا سید علی صاحب کی تعلیقات کے ساتھ طبع کرا دیا اس کتاب سے فن بدیع کی حقیقت ہی اکیلی نہیں کھلی بلکہ اشعار کی تنقید ہر پہلو سے کرنے کا سلیقہ آگیا عرب جاہلیت کی نازک خیالی کے سیکڑوں نمونے پیش ہو سکتے ہیں مگر حادرہ کا ایک شعر اسی کتاب میں پڑھا ہو المغفن طبع کے لئے پیشکش ہے۔

جری بیننا منا رسیس یزیدنا
سقاما اذا ما استقیۃ المسامع

اب نوبت فن بلاغت کی طرف توجہ کی آئی ادبیات تو ختم کر لئے تھے مطول بحث ما انا قلت تک چاٹ چکے تھے شیخ عبد القاہر کے نام آشنا تھے قال الشیخ فی دلائل الاعجاز بھی پڑھا تھا مگر اب علامہ نے دلائل الاعجاز پڑھانا چاہی مجھکو اول چند سبق خود پڑھائے غنیمت یہ تھا کہ امام رازی کی نہایت الایجاز جو اس کا خلاصہ ہے پہلے پڑھ چکے تھے اس لئے مفہوم ذہن نشین ہو چکا تھا ورنہ یہ بے قابو پانی اپنی دھن میں کہیں کنارے سے ٹکراتا اور پھر نہ جانے کدھر کو نکل جاتا عبارت وہ جو دیکھنے میں ہیرے کی آب کبھی نظر پر چڑھتی اور کبھی ڈوب گئی۔ جو اس کی نقل اتارے تو بات کا تبنگر بنا نا سیکھے ایک ہی بات کہتے ہیں۔ اور کہہ نہیں سکتے دوسرے حصہ اسرار البلاغت میں جہاں اشعار پر کچھ لکھا ہے وہ صاحب ذوق کا مقام ہے

ایسے دیلے کی سمجھ سے باہر ہے غرض اس کے اسباق میں علامہ نے ایک ایک لفظ کا حسن کھول کھول کر بتایا اور واقعی بڑا لطف آیا اس درمیان میں ان کو باہر جانا پڑا وہ سلسلہ افسوس ہے کہ رک گیا پھر تو کتاب اپنے استاد سے ختم کرا ہی لی۔

اعجاز القرآن پہلے دیکھے ایک ہی کتاب ابو بکر باقلانی کی دستیاب تھی ان کے مذاہب شرح مواقف کے مطالعہ میں علم کلام کے متعلق پڑھے تھے یہ نہیں معلوم تھا کہ حضرت ادیب ہی تھے جیسے کچھ ہے ظاہر ہے پڑھی بھی مولانا حفیظ اللہ صاحب سے جو ایک بڑے ادیب کے شاگرد تھے مگر خود ادیب نہ تھے غرض اس کو پڑھ کر مایوسی ہوئی مگر شکر ہے کہ بلاغت کی دوسری کتابوں اور علامہ حمید الدین مرحوم کی رہبری کا کلینداق پیدا ہو گیا الندوہ میں بعد کو ایک سلسلہ مضامین میں میں نے اعجاز القرآن کا خاکہ بنا دیا ہے اب کوئی صاحب قلم اس کو بھرے۔ دقت یہ ہے کہ وحی کلامی یا حسن ذاتی کا مقابلہ تکلفات سے بھرے کلاموں سے قباے گل میں گل بوٹا کہاں ہے کا مضمون ہے۔ یہ چیز ذوق کی ہے مذاقِ سلیم اور عقل سلیم دونوں درکار ہیں جس طرح کوئی اچھا شعر ارسطو کی بوطیقا کے قواعد سے بالا ہے اسی طرح خدا کا کلام اگرچہ وہ ہماری ہی زبان کے سنے الفاظ میں ہو کسی بلاغت کے قواعد کا پابند نہیں ہو سکتا۔ انسانوں کے کلاموں کے لئے تو نحویوں نے مستثنیات اور خلاف کی ایک لمبی فہرست بنا رکھی ہے مگر یہ تو کلام ربانی ہے۔ گیٹے نے بلاتشبیہ عورت کے متعلق لکھا ہے۔

SIT SILENT & LET ME WORSHIP YOU

پھر تلاوت قرآن تو ہماری عبادت ہے اور اس عبادت کا صلہ نہ نہیم سلبنا ہے اس لئے خلوص اور خلوذہن کے ساتھ اگر زبان پر عبور ہے تو طبع سلیم لیکر بیٹھئے اور حسن کا جو رخ نظر آجائے اس کا لطف اٹھائیے اور بہاں بن پڑے اور زبان سے ادا ہو سکے تو اس کو ادا کیجئے یہی صحیح راستہ اعجاز القرآن تک پہونچنے کا ہے نہ کہ اس کا امراء القیس طرفہ اور لبید سے مقابلہ یہ تو جواب الزامی ہوا۔ نہ کہ اثبات

یہ رنگ تھوڑا بہت شریف مرتضیٰ علم الہدیٰ اور پھر شیخ محی الدین ابن عربی کو نصیب ہوا ہے نسبتی لوگ تھے و ما ینطق عن الہوی سے مناسبت تھی۔ جو وارد ہوا وہ کہہ ڈالا۔ فرق یہ ہے کہ شیخ عبد القاہر جرجانی نے بھی صفحے کے صفحے ایک آیت پر رنگے ہیں زبان کی لطافت جو کچھ بھی تھا اول تو اس کو سمیٹ نہیں سکے، دوسرے حال قلبی نہ تھا اس لئے کیف ہوتا ہے مگر وجد نہیں آتا۔ ان کا کلام انکے الفاظ میں کلام یدخل فی اذنک قبل اذنک کا مصداق نہیں ہے۔ علامہ ابن خلدون نے عربی بین کے ذوق کسبی کے پرداخت کے لئے جو باتیں بتائی ہیں پہلے ان کو پوری کرو پھر اس طرف متوجہ ہو تو کچھ سمجھ بیری کرے۔ آجکل تو جس کو عربیت میں شُدبُد درک ہوا اسنے ہم کہتے ہیں پانچویں سو اڈیشن کے اصول پر قرآن پاک پر خامہ فرسائی شروع کردی بصائر کے لئے بصیرت تو پیدا کر لو۔ ہمارے علامہ کو کسی آیت قرآنی کی بلاغت پر واقعی وجد آجاتا تھا اور پھر اس کے حسن کو بیان کرتے بعض مرتبہ ہندی دوہے پڑھ پڑھ کر اس کی مثالوں کو ذہن نشین کرکے اس حسن کی توضیح کرتے تھے مگر اپنے شاگرد اور عزیز علامہ فراہی کی تحقیق اور عمیق نظر کے ہمیشہ معترف رہتے ان دونوں بھائیوں کے مکالمے جن کو سننے کا اکثر اتفاق ہوا ہے بڑے علم آموز اور وسعت نظر پیدا کرنے والے ہوتے مگر فرق یہ تھا کہ علامہ ارسطو کی بوطیقا اور قواعد معانی و بلاغت سے گھرے تھے اور علامہ فراہی ان گرفتوں سے نکل چکے تھے ان میں قرآن فہمی کا ایک حسن باطنی پیدا ہو گیا تھا۔ انھیں مکالموں کا نتیجہ ہے کہ شعرالعجم میں شعر کی حقیقت پر جو بحث ہے وہ اس صدی میں شاعری پر بہترین مقالہ ہے۔

تہذیب الکلام اور شرح عقاید نسفی پڑھ کر علم کلام کی لطافتوں سے محروم ہے۔ شرح مواقف شرح مقاصد بیشک علم کلام اور فلسفہ کا بھی ضمناً مزا دیتی ہیں ہمارے مولانا نے ان کی چاٹ لگا دی تھی ہم ان کو بہت پڑھتے تھے معتزلہ کی نہ تو کوئی کتاب ملی دیکھنے کو اور جو کچھ دیکھا وہ بروایت ثانیہ مگر ان سب نے قرآن پاک کو بالائے طاق پیچ کر رکھ دیا ہے۔ اگرچہ امام رازی کی تفسیر قرآن پاک کی

سیر ہے عقاید وکلام فلسفہ تفسیر کا ایک امتزاج سا دیا ہے گر عقاید کا ثبوت یا دلہ قرانیہ اسمیں
اس پر دازکا نہیں ہے۔ امام غزالی نے مقاصد الفلاسفہ اور تفتازانی نے اس کی شرح
یونانی فلسفہ کا منوبہ اپنی سمجھ کے مطابق پیش کردیا ہے لیکن جو کچھ زور ہے وہ نفی پر خرچ ہوگیا اثبات
ھیلے پڑگئے ہیں تاہم اس لحاظ سے امام غزالی کی کتاب الاقتصاد فی الاعتقاد بہتر ہے ہم نے اب
وپڑھا اس سے اشاعرہ کا نکتہ نظر صاف صاف سامنے آگیا اس کے بعد ابن رشد کی کشف الادلہ
اس تکلم کوشش کی غلطی اور یونانی فلسفہ کی غلط ترجمانی معلوم ہوگئی اور علم کلام کی نئی ترتیب کا پرداز
میں آگئے امام غزالی نے مضنون بہ میں جو کچھ لکھا ہے یا الجام العوام اور جواہر القرآن میں وہ سب
بت کا پرداز سے لئے مگر علم کلام کی طلب کچھ اور چاہتی ہے ابن رشد نے اس جہت کو بھی کشف الادلہ میں
پرح کردیا ہے غرض یہ سب پڑھ کر اب اشکال سے نکلنے کی ترکیب علامہ کی رہبری اور علامہ فراہی
وضیحات کی بدولت سمجھ میں آگئی جو الحمداللہ ہمیشہ قائم رہی اور جب مغربی فلسفہ دیکھا اور بہت
ما اور برگسن سے فلسفی کی گاڑی رکتے دیکھی تو اس امر کی قدر ومنزلت دل میں اور زیادہ ہوگئی ہر مسئلہ کا
ی تکمیہ جواب اور معاملہ کا تسکین وہی ما ینطق عن الھویٰ ہی سے ممکن ہے ذرا الفتاہوری کی وسعت اور نزاکت معنی کو
لیکھئے یہی صحیح علم کلام ہے جس کو ہمارے دوست نے سیرۃ النبی کی جلدوں میں پیش کیا ہے۔ علم کلام اور حکماء اسلام
فلسفہ کا اب بھی مجھکو شوق ہے اور جب کوئی ایسی چیز سامنے آجاتی ہے تو ضرور پڑھتا ہوں مگر کیوں اس لئے کانت
بائزوزامی گو برگسن کے مقابلہ میں اس میں حق کا پہلو زیادہ ہے اور اس کو یونانیت کا غلام ٹھہرانا در اصل ہماری
اہ نظری ہے اسکو تو عمرانی حوالوں سے دیکھکر ڈیکارت دیکارت بنا حجۃ اللہ البالغہ کے درس نے شریعت کے
ات ہی نہیں تبلائے بلکہ میری سمجھ میں یہ بات بھی سے جم گئی کہ دنیاداری مطابق دین ہی در اصل دینداری ہے
میں نے اس زمانہ میں عبدالوہاب شعرانی کی کتاب الیواقیت پڑھی تھی جو تصوف اور علم کلام کی تطبیق پر پہلی
کوشش ہے اگر اس پرداز پر علم کلام لکھا جاتا تو زیادہ مفید ہوتا جس گھر میں ہم رہتے تھے علامہ کے تشریف

عرصے سے بہت پہلے اس کے ایک حصے میں جلسۂ تہذیب اور ملٹن سوشل کلب جو اب رفاہِ عام بلدہ وری میں ہے اٹھ آیا تھا ہمارے بھائی صاحب قبلہ جناب منشی ظہور علی صاحب ایڈیشنل اسسٹنٹ اس کے بڑے سرگرم ممبر تھے اور مولوی ظہور احمد صاحب وکیل چندوسی کے بڑے خدمت گذاروں اس کے سکریٹری تھے۔ اس لئے اس کلب کے دروازے میرے لئے کھلے تھے۔ بیڈمنٹن وہاں کھیلنا تاش کے کھیل وہاں دیکھنا اور جدید تہذیب کے بعد وہ ایک لڑکے کے لئے جو کچھ چاہئے تھا وہ سب وہاں جمع تھا اس ذکر کی وجہ یہ ہے کہ جلسۂ تہذیب کا کتب خانہ ایک خاص چیز تھی کتابیں فارسی کی کافی تھوڑی عربی کی تھیں اور اب تو انگریزی کا زور تھا اور جب منزل کے بعد انگریزی کی البتہ وہاں جمع تھا لیکن اس کا اردو کا سرمایہ بہت نایاب تھا نہ جانے اب باقی بھی ہے کہ نہیں۔ قدیم و جدید فسانے ناول معلومات کا ذخیرہ تھا مگر وہاں اردو کی علمی سرمایہ میں وہ کتابیں ہیں جنکو دیکھکر حیرت ہوتی تھی سنہ ضمیمہ اس نادیں پڑھا تھا مگر اردو کی کتابیں ناول و فسانے خوب میں نے پڑھے طلسم ہوشربا اور اس کے ساتھ کئی دفتر مجھ سے بوستانِ خیال اسی زمانے میں پڑھیں تھیں۔

سرسید کی تمام تصانیف میرے بھائی منشی واحد علی صاحب قبلہ اس کے پاس تھیں تہذیب الاخلاق رسالہ حسن حیدرآباد کے فائل اور معارف (قدیم) یہ سب ایک ایک کرکے پڑھ ڈالے تھے اردو کے سرمایہ پر کافی عبور ہوگیا تھا مولانا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری پر تنقید گھروں ہوتی تھی چچا سجاد حسین مرحوم کی صحبت تھی انکے فقرے اور کتاب پر نکتہ چینی ہمیشہ یاد رہی اگرچہ اب میرے خیالات میں انقلاب ہو چکا ہے حالی کی حقیقی عزت دل میں ہے اور انکی ہستی ہی ایسی تھی جنھے علامہ کو ہر ایک پر نکتہ چینی کرتے سنا ہے مگر حالی صاحب کی جب کی تو تعریف ہی کی اگرچہ بعض عالمانہ اختلافات مقدمہ سے انکو بھی تھے تذکرۂ گلشن ہند مولوی لطف کا مقدمہ تو پڑھا ہی ہوگا اس سے اس تذکرے کے پایہ پر حال معلوم ہوگیا ہوگا علامہ جب دکن سے تشریف لائے تو انکی بیاض میں چند اشعار میر اثر دہلوی کی مثنوی کے درج تھے اس کو دیکھکر یہ بات یاد آگئی کہ حضرت حالی نے مرزا شوق کی مثنوی کے متعلق لکھدیا ہے وہ اثر کی مثنوی کا تتبع ہے یک لکھنویت جوش میں آگئی جھٹ میں نے

اردوئے معلی میں ایک مضمون لکھ مارا اور اپنے خیال میں حالی صاحب کی اچھی گرفت کی بات تو یاد نہیں ہے کہ کیسا لکھا تھا مگر اثر کا ایک شعر یاد ہے اس سے اندازہ کیجئے۔

تاک ہے یا کہ ایک طوطا ہے چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے

اتفاق سے ایک مرتبہ جناب حالی لکھنؤ تشریف لائے اور اپنے بھانجے خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم کے یہاں ٹھہرے میں انکی خدمت میں حاضر ہوا ہمارے دوست بھی ساتھ تھے۔ میں بڑا ہی منفعل اپنی اس حرکت پر ہوا جب انھوں نے فرمایا کہ حضرت واقعی آپ نے ٹھیک لکھا میری نظر وہاں تک نہیں پہونچی تھی اس کو کہتے ہیں انصاف اور انکسار!

مشہور ہے کہ لکھنؤ میں معمار کے ہاتھ سے جو اینٹ گرتی ہے وہ بھی بھیرویں الاپتی گرتی ہے بچہ بچہ موزونیت سے بھرا ہے ایک ایک رگ پھڑکتی ہے جنھوں نے کھنڈ وہاں کے سنے ہیں وہ جانتے ہیں ایسے دائرے میں رہ کر سوال ہوتا ہے کہ میں نے شعر کہنا کیوں نہ شغل کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے عم زاد بھائی خدا بخشے منشی احمد علی صاحب مرحوم جن کا ذکر کہیں آگے آئے گا انھوں نے مجھکو سمجھا دیا تھا کہ یہ دور ہے ذہن کے سنوارنے کا شاعری ذہن سنوار کر زیب دیتی ہے یا پھر بیکاری میں بگڑ کر لاتی ہے اسکی ہمیشہ تائید فرماتے نے بھی کی عزیز لکھنوی کی مثال سامنے تھی انکی تعلیم ادھوری رہ گئی وہ تو شاعر تھا ادھر میں اگر بنتا بھی تو تشاعر الحمد للہ تضیع اوقات سے بچ گیا مگر اب کچھ مضائقہ نہیں کبھی کبھی دل کے بہلانیکو کچھ فکر کر لیتا ہوں۔

نوٹ الندوہ عموماً ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شائع ہو کر روانہ کر دیا جاتا ہے نہ پہونچنے کی صورت میں اسی مہینہ کی آخری تاریخ تک دفتر میں اطلاع بھیجنے پر دوبارہ رسالہ روانہ کیا جا سکے گا ورنہ قیمت رسالہ روانہ کرنے پر تعمیل ہو سکے گی۔ "منیجر"

باسمہ

نقد و نظر

بشریٰ | مصنفہ مولانا عنایت رسول صاحب مرحوم چریاکوٹی۔ کاغذ کتابت طباعت بہتر، صفحات ۴۲۲ ملنے کا پتہ۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی شروانی پرنٹنگ پریس علی گڈھ قیمت درج نہیں اہل علم کی خدمت میں ہدیۃً پیش کی جاتی ہے۔

مولانا محمد فاروق صاحب مرحوم چریاکوٹی استاذ علامہ شبلی نعمانی و سابق صدر المدرسین دار العلوم ندوۃ العلماء سے قارئین الندوہ بخوبی واقف ہیں مولانا عنایت رسول صاحب انھیں کے بڑے بھائی تھے مرحوم ہندوستان میں عبرانی زبان کے بے مثل ماہر تھے اس کے ساتھ انگریزی کلدی اور یونانی زبانوں سے بھی آگاہ تھے دینی علوم میں بھی بڑا تبحر تھا حدیث میں صرف ایک واسطے سے حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے شاگرد تھے مرحوم نے متعدد کتابیں تالیف و تصنیف کیں لیکن زیر نظر کتاب پر انھیں بہت ناز تھا فرمایا کرتے تھے کہ "یہ کتاب قیامت میں میری بخشائش کے لئے کافی ہے" اس کتاب میں توریت و انجیل کی وہ تمام بشارتیں جمع کر دی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے متعلق، مختلف صحف میں درج ہیں اردو ترجمہ کے ساتھ اصل عبرانی عبارت بھی نقل کی ہے اور اس پر پوری وسعت نظر سے بحث کی ہے سلسلۂ بحث میں کہیں کہیں بعض مشہور و مسلم اسلامی مسائل بھی آگئے ہیں جن کے بارے میں مصنف نے جمہور اہل اسلام کی رائے سے اختلاف کیا ہے جسکی طرف جناب مقتدیٰ خاں صاحب شروانی نے اپنے دیباچہ میں اشارہ کر دیا ہے لیکن یہ کتاب کا اصل موضوع نہیں ہے اصلی عنوان بحث وہ بشارتیں ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق صحف سابقہ میں مرقوم ہیں امید کہ اہل علم کے حلقوں میں کتاب دلچسپی سے پڑھی جائیگی۔

السیر الحثیث | مصنفہ ڈاکٹر محمد زبیر صاحب صدیقی پروفیسر اسلامیات کلکتہ یونیورسٹی مطبوعہ

دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کاغذ بہتر ٹائپ خوشنما صفحات ۵۵

الندوہ کی کسی گذشتہ اشاعت میں مذکورہ بالا کتاب کا ضمناً ذکر آچکا ہے جولائی ۱۹۳۰ء میں دائرۃ المعارف کی جانب سے مختلف علمی مسائل پر بحث و گفتگو کی غرض سے اہل علم کا ایک اجتماع حیدرآباد میں ہوا تھا اس موقع پر ڈاکٹر محمد زبیر صاحب صدیقی نے تدوین حدیث کی تاریخ پر ایک مقالہ پڑھا تھا جو کہ موضوع پر ان کی انگریزی تالیف کے ایک باب کا اردو میں خلاصہ تھا الیسیر الحثیث اس خطبہ کا عربی ترجمہ ہے مصنف نے اسے مختلف عنوانوں پر تقسیم کیا ہے اور ہر عنوان کے ماتحت قدیم و جدید ماخذوں کی مدد سے بیش قیمت معلومات فراہم کئے ہیں مصنف کی اصل انگریزی کتاب ہمارے پیش نظر نہیں ہے اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کا طرز بیان کیا ہے لیکن زیر نظر کتاب میں اختصار سے کافی کام لیا گیا ہے ضرورت تھی کہ واقعات کے بیان میں کسی قدر تفصیل سے کام لیا جاتا اس موضوع پر اردو میں متعدد اہل علم نے اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں معلوم نہیں یہ مضامین صاحب موصوف کے پیش نظر تھے یا نہیں لیکن کتاب میں ان مضامین کا کوئی اثر نظر نہیں آتا خطبات مدارس میں تدوین حدیث کے ابتدائی دور کے متعلق بہت کافی مواد فراہم کیا گیا ہے معارف الندوہ وغیرہ رسائل میں بھی اس قسم کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں جو غالباً ڈاکٹر صاحب موصوف کے علم میں ہوں گے حدیث کے ابتدائی تحریری سرمایہ کے متعلق گذشتہ تیس چالیس برس سے جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں دور کی جا رہی ہیں ان کی کوئی اصلیت نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عہد مبارک ہی میں روایتیں کتابی شکل اختیار کر چکی تھیں یہی تحریری مجموعے تھے جو بعد کو مسانید و جوامع کی شکل میں مرتب ہوئے ان آخری کتابوں کی جامعیت ترتیب و تہذیب اور ان سے استفادہ کی سہولتوں کی بناء پر ابتدائی مجموعوں کا استعمال کم ہوتا گیا اور وہ رفتہ رفتہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے کچھ انقلابات زمانہ کی نذر ہو گئے اور کچھ مختلف گوشوں میں دب دبا کر رہ گئے یہ حقیقت اب روز بروز واضح ہوتی جاتی ہے الندوہ میں کئی مہینے سے اس موضوع پر بحث ہو رہی ہے اس لئے اس جگہ مزید تفصیل کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

محمد رسول اللہ | مصنفہ جناب مقبول احمد صاحب سیوہاروی کتابت بہتر اور جلی کاغذ اچھا طباعت عمدہ صفحات ۱۶۰ تقطیع چھوٹی قیمت مجلد ۸ طلبہ کے لئے خاص رعایت ملنے کا پتہ اسلامی کتاب گھر سیوہارہ ضلع بجنور یا مکتبہ جامعہ دہلی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں چھوٹے بچوں اور کم پڑھے لکھے مردوں اور عورتوں کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے، عبارت بہت آسان، واقعات سادہ، طرز بیان دلچسپ اس کے ساتھ عرب اور دنیا کا نقشہ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، غار حرا، غار ثور، کوہ احد وغیرہ تاریخی آثار کے فوٹو بھی شامل ہیں کتاب اپنے مقصد میں پوری طور پر کامیاب ہے۔

ہندوستان اور مسئلہ امارت | مصنفہ مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی۔ کاغذ کتابت طباعت اچھی قیمت ۱۲ صفحات ۱۲۸ ملنے کا پتہ خانقاہ رحمانیہ مونگیر

مسئلہ امارت کی اہمیت محتاج بیان نہیں اسلام کی نظر میں اسکی اس درجہ اہمیت ہے کہ وہ اس کے بغیر صحیح اسلامی زندگی کا تصور نہیں کرتا اور اس حالت کی موت کو جاہلیت کی موت قرار دیتا ہے سفر و حضر ہر جگہ امارت

کو ضروری قرار دیتا ہے لیکن افسوس کہ اتنی تاکیدوں کے باوجود اس مسئلہ کی جانب سے سخت غفلت و اعراض برتا جاتا ہے زیر نظر کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ مسلمانوں کو فراموش شدہ سبق یاد دلایا جائے کتاب میں ہندستان کے مخصوص حالات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے اور ان حالات کے لئے بھی اسلامی اصول کی روشنی میں راہ دکھائی گئی ہو۔ (ن۔ ق)

عربی کا معلم | مولفہ مولوی عبدالستار صاحب۔ ملنے کا پتہ کتاب پر درج نہیں غالباً شرف الدین الکتبی اولاد
بھنڈی بازار [illegible] ممبئی

ہندستان میں ایک عرصہ سے عربی زبان کو سہل طریقہ پر کم از کم مدت میں حاصل کرنے کے لئے متعدد کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں لیکن اس وقت تک کوئی ایسی کتاب جو جامعیت کے ساتھ وقت کی ضرورت کو پورا کر سکے نظر

ذاتی تجربہ سے ہمیں معلوم ہوا کہ یہ کتاب افادیت کے اعتبار سے بہت قیمتی ہے ایک سال کے عرصہ میں اس کتاب کے ذریعہ عربی زبان حاصل کی جا سکتی ہے۔ البتہ جہاں فعل کے قواعد بیان کئے گئے وہاں کچھ زیادہ الجھاؤ ہے جس میں مصری عربی اداروں کو پیش نظر رکھنا زیادہ مناسب ہے کتاب فی الجملہ اس قابل ہے کہ عربی مدارس اور انگریزی اسکولوں میں داخل کی جائے تاکہ طلبہ کم از کم مدت میں زبان کو سیکھ سکیں۔ (م۔ ن)

حالات ندوہ

مئی سے دارالعلوم میں گرمی کی تعطیل ہے جس کا سلسلہ آخر جون تک رہیگا انشاءاللہ یکم جولائی کو دارالعلوم پھر کھلے گا مدرسہ کھلتے ہی حسب معمول تعلیم شروع ہوجائیگی امید ہے کہ طلبہ ٹھیک وقت پر پہونچ جائینگے تاکہ انکا نقصان نہ ہو۔

آج کل بیرون ہند یا ہندوستان کے دور دراز صوبوں کے طلبہ کے علاوہ باقی سب اپنے اپنے وطن چلے گئے ہیں تعطیل کے زمانہ میں عموماً مولوی نور الحسن صاحب نگرانی کے فرائض انجام دیتے تھے لیکن ابکی وہ اپنے بعض اعزہ کی ملاقات کی غرض سے حیدرآباد تشریف لے گئے ہیں اس لئے اس مرتبہ جناب ماسٹر عبدالسمیع صاحب نگرانی کے فرائض انجام دے رہے ہیں انکی امداد و اعانت کے لئے سابق نقیب عام (جنرل مانیٹر) محمد نواب خاں متعلم دارالعلوم مقرر ہوئے ہیں مولانا محمد عمران خاں صاحب انچارج مہتمم دارالعلوم بھی اس مرتبہ مکان تشریف نہیں لے گئے ہیں بلکہ دارالعلوم ہی میں مقیم ہیں۔

تعطیل کی وجہ سے دارالعلوم اور اس سے متعلق سب شعبے بند ہیں البتہ الندوہ معین الندوہ اور کتب خانہ میں کام ہورہا ہے الندوہ کے کاموں کی وجہ سے اس کے اسسٹنٹ منیجر جناب افتخار احمد صاحب بلی زیادہ تر ندوہ ہی میں رہتے ہیں کتب خانہ میں حسب معمول آج کل مولانا کلیم احمد صاحب کتابوں کا جائزہ لے رہے ہیں جو انشاءاللہ وسط جون تک ختم ہوجائے گا۔

تعطیل گرما سے پہلے ششماہی امتحان ہوا جس کا سلسلہ چند دن تک جاری رہا ۱۲ مئی کو نتیجہ کا اعلان ہوا اس مرتبہ کامیاب طلبہ کا تناسب توقع سے بڑھ کر رہا تفصیلی نتیجہ طلبہ کے والدین اور سرپرستوں کو

بھیج دیا گیا ہے تاکہ وہ اپنے بچوں کی تعلیمی رفتار سے باخبر رہ سکیں۔

مئی میں دارالعلوم کی پہلی ششماہی ختم ہوگئی اس موقع پر حسب دستور تمام شعبوں کا جائزہ لیا گیا آجکل تعطیل میں انجمن کے تمام شعبے بند ہیں صرف دارالاخبار کھلا ہوا ہے تاکہ جو طلبہ دارالاقامہ میں مقیم ہیں وہ واقعات عالم سے باخبر رہ سکیں۔

الندوہ کی پچھلی گذشتہ اشاعت میں معین الندوہ کی مجلس منتظمہ کی کارروائی شایع ہو چکی ہے اس اجتماع میں مطالبہ اور مسائل کے یہ بات بھی طے پائی تھی کہ خاص لکھنؤ میں معین الندوہ کے کام کو آگے بڑھایا جائے اس غرض سے مہتمم صاحب دارالعلوم کی سرکردگی میں ایک وفد مرتب ہوا تھا تاکہ اکابر شہر سے مل کر کام کی مناسب راہیں پیدا کرے لیکن دفعۃً لکھنؤ میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ مدح صحابہ کی تحریک پھر شروع ہو گئی جس نے شہر کی فضا میں ایک تلاطم برپا کر دیا ہے ان حالات میں وفد کا کام رک گیا ہے اور جب تک تمام معاملات قابل اطمینان طور پر طے نہیں پا جاتے کوئی دوسرا کام دشوار ہے۔

مولوی حامد علی صاحب ندوی ناظم معین الندوہ نے شروع مئی میں اودھ کے بعض قصبوں اور شہروں کا دورہ کیا آجکل پنجاب تشریف لے گئے ہیں اگر موقع ملا تو وہاں سے سرحد بھی جانے کا خیال ہے پشاور کے ندوی احباب معین الندوہ کے لئے عرصہ سے کام کر رہے ہیں چند مہینے ہوئے پنجاب میں مولوی محمد حنیف صاحب ندوی نے بھی کام شروع کیا ہے اپریل میں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ لاہور تشریف لے گئے تھے ان کی توجہ سے کام کی رفتار کچھ تیز ہو گئی تھی ہمیں امید ہے کہ ناظم صاحب معین الندوہ کے اس سفر سے ندوہ کے ہمدردوں اور دوستوں کی توجہ میں اور اضافہ ہوگا اور معین ندوہ کا دائرہ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔

تذکرہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

(یعنی قیمتی اضافات اور نہایت مفید ترمیمات کے ساتھ)

مشہور دینی ماہنامہ "الفرقان" بریلی کے

"شاہ ولی اللہ نمبر" کا

دوسرا کتابی ایڈیشن

طبع کی تیاری میں

ادارہ "الفرقان" کے علاوہ ملک کے منتخب علمائے کرام اور ممتاز اہل قلم و ارباب تحقیق نے بھی خاص حصہ لیا ہے جنکے اسماء گرامی صفحات مابعد کی فہرست مضامین سے معلوم ہوسکتے ہیں

افادیت اور مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے

کہ اسکا پہلا ایڈیشن نوری سنہ ۱۹۴۲ء میں شایع ہوا تھا جو صرف پندرہ دن میں ختم ہوگیا اب شائقین کے بیحد اصرار پر یہ دوسرا کتابی ایڈیشن تیار کرایا گیا ہے جو ہر حیثیت پہلے ایڈیشن سے زیادہ مکمل اور بہت فائق ہے۔ مگر کاغذ وغیرہ کی گرانی کی وجہ سے اس مرتبہ بہت تھوڑی تعداد میں تیار کرایا گیا ہے اور توقع ہے کہ یہ بھی بہت جلد ہی ختم ہوجائیگا۔ لہذا شائقین فرمائش بھیجنے میں تاخیر نہ فرمائیں

اسمیں کیا کیا ہے؟

اگرچہ بظاہر اس کا تعلق صرف حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ہے لیکن فی الحقیقت یہ

تاریخی معلومات سیاسی نکات مذہبی معارف اور دینی ہدایات کا بحر ذخار ہے

مختلف قسم کے مذہبی و سیاسی اور علمی و تاریخی مباحث کے متعلق اس دوسرے ایڈیشن میں قریباً ساڑھے تین سو عنوانات ہیں جنکے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ کے ارشادات اور طریق عمل کی روشنی میں اسمیں بحث کی گئی ہے۔ ان عنوانوں میں سے قریباً ڈیڑھ سو عنوان ناظرین کے ملاحظہ کیلیے یہاں بھی درج کیے جارہے ہیں تاکہ اسکی اہمیت اور جامعیت کا کچھ اندازہ آپ کرسکیں

نظمیں اور فوٹو بلاک

: حضرت شاہ صاحب کے متعلق بلند پایہ شعراء کی وجد آفریں نظمیں اور آپکے دست خاص کی لکھی ہوئی دو ایک تحریروں کے فوٹو۔ نیز آپکے مزار مبارک و حضرت شاہ عبدالرحیم و شاہ عبدالعزیز کے مزارات کے فوٹو، اور اکبرآبادی مسجد کا فوٹو جو حضرت شاہ اسحٰق صاحب کی آخری اقامت گاہ تھی لیکن آج اس کا نشان بھی موجود نہیں (اس مجموعہ میں آپ ملاحظہ فرمائینگے، یہ سب فوٹو آرٹ پیپر پر ہیں۔ ٹائٹل سہ رنگا نہایت حسین اور باصرہ نواز ہے جو بلاکوں کو نہایت اعلیٰ قسم کے آرٹ پیپر پر چھاپا گیا ہے کہ اس کی بہتر اس وقت ہندوستان میں دستیاب نہیں ہوسکتا۔ قیمت وغیرہ کی تفصیلات آخری صفحہ پر ملاحظہ فرمالیجیے۔

ناظم الفرقان بریلی۔ یو۔ پی

تذکرہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے

ساڑھے تین سو عنوانوں میں سے صرف ڈیڑھ سو عنوان یہ ہیں

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مدظلہ کی گرانقدر
ارشاد گرامی حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ
ہندوستان میں قرآن فہمی کا چرچا اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ
(از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدیر صدق)
شاہ صاحب سے پہلے ہندوستان میں اسلام کی سرگزشت
(از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی)
(اس مقالہ کے چند ضمنی عنوانات یہ ہیں :)
عرب، عجمی فاتحین اور ان کا نیا ذوق
دسویں صدی ہجری تک ہند اسلام کی حالت
سلطان شمس الدین التمش اور اعتصام دین
محمد تغلق اور خدمت دین
فیروز تغلق کی اسلامی اصلاح
سکندر لودھی کی اصلاحات
دور ضلالت یا عہد اکبری
حضرت مجدد الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ
شیخ عبدالحق کی دینی خدمات
عالمگیر اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ کی جدوجہد
امام ولی اللہ دہلوی کا ظہور

منصب تجدید کی حقیقت اور
تاریخ تجدید میں شاہ ولی اللہ رح کا مقام
(از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)
(اس مقالہ کے چند ضمنی عنوانات یہ ہیں :)
اسلام اور جاہلیت کی ازلی تاریخی کشمکش،
جاہلیت کی اقسام اور جاہلی نظریات
اسلام کا نظریہ تمدن،
نبی کے کام کی نوعیت
جاہلیت کا حملہ
کار تجدید کی نوعیت اور اس کے چند شعبے
مجددین کے کارنامے
حضرت عمر بن عبدالعزیز کی تجدید دین
ائمہ اربعہ کا تجدیدی کارنامہ
امام غزالی کی مجددانہ مساعی
امام ابن تیمیہ کا جہاد تجدید
امام ربانی مجدد الف ثانی کا تجدیدی کام
حضرت شاہ ولی اللہ کا کام اور پیغام
حضرت سید احمد و شاہ اسمٰعیل شہید
تحریک جہاد کی ناکامی کے اسباب
عہد حاضر میں کار تجدید کی ضرورتیں

اسلامی ہند کے طوفانی عہد میں خدا کا
ایک وفادار بندہ
(از مولانا سید مناظر احسن گیلانی مدظلہ)
(یہ مقالہ ۸۰ صفحات پر ہے اور اس میں سو
سے زیادہ ضمنی عنوانات ہیں جن میں سے چند یہ ہیں)
الف ثانی کے تجدیدی کارنامہ کی انتہا
عہد عالمگیری کے بعد فتنوں کا زور
شاہ عبدالعزیز کے خونی آنسو
دلی کے خونی نقشے اور شاہ ولی اللہ کی استقامت
سکھ تحریک اور مرہٹہ تحریک
مسلمانوں پر لرزہ خیز مظالم
نظریہ تقسیم ہند یا پاکستانی اسکیم
افسانوں کے ہیولے
مرہٹہ تحریک کا نصب العین
دلی کے لال قلعہ پر مرہٹوں کا قبضہ
حضرت شاہ ولی اللہ رح کا ایک تاریخی خواب
خواب کی تعبیر اور پانی پت کی تاریخی جنگ،
غازی ابدالی کا حملہ اور مرہٹہ طاقت کی شکست
پھر مسلمانوں کی غفلت اور شاہ صاحب کی طرف سے
خطرہ کا مسلسل الارم
مسلمانوں کے مختلف طبقات کو شاہ صاحب کا
پیغام اور مفصل پروگرام
سلاطین اسلام سے شاہ صاحب کا خطاب
امراء اور ارکان دولت سے خطاب
فوجی سپاہیوں سے خطاب
اہل صنعت و حرفت سے خطاب
پیرلوں اور پیرزادوں سے خطاب
غلط کار علماء سے خطاب
واعظوں اور زاہدوں سے خطاب
عام امت مسلمہ سے جامع خطاب
ہندی مسلمانوں کا جمود یا مرنے کا تہیا
خواب غفلت کی سزا، انگریزوں کا تسلط
کارتوسی بندوقوں کے ساتھ لارڈ کلائیو کا حملہ
میر جعفر وغیرہ کی غداری
سراج الدولہ کا لرزہ خیز قتل
مرشدآباد کے بازاروں میں سراج الدولہ کی لاش
بنگال بہار اڑیسہ کی دیوانی کمپنی بہادر کے نام

"قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا"

منجملہ ساڑھے تین سو عنوانوں کے جو ڈیڑھ سو عنوان یہاں درج ہوئے ہیں انہی سے آپ نے اس کی جامعیت اور افادیت کا اندازہ فرمالیا ہوگا

اس کے مطالعہ سے جو خاص چیزیں آپ کے علم میں آئینگی انکی ایک مختصر فہرست بطور خلاصہ یہ ہے۔

(۱) تجدید دین کی حقیقت، مقام مجددیت کی تشریح اور مجدد دین کے فرائض۔ — تاریخ اسلام کے مشہور مجددین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، امام غزالیؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، حضرت مجدد الف ثانیؒ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے تجدیدی کارناموں پر تبصرہ اور دور حاضر میں تجدید دین و احیاء ملت کا نقشہ اور اس کی فوری ضرورتیں۔

(۲) ہندوستان میں اسلام کے داخلہ سے لیکر عہد عالمگیری تک کی پوری دینی تاریخ کہ کس زمانہ میں عرب کے اس مسافر پر یہاں کیا گذری اور کن سلاطین نے خدمت دین کا حق ادا کیا۔

(۳) غازی اورنگ زیبؒ سے لیکر سلطنت مغلیہ کے سقوط، انگریزوں کے تسلط اور پھر شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک جہاد تک کے حالات پر مفصل تبصرہ یعنی سکھ تحریک، مرہٹہ گردی، نادر شاہ درانی کی خونریزی اور غازی احمد شاہ ابدالی کی جنگ کے اسباب و اثرات اور ان تمام سیاسی واقعات سے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے تعلقات اور تاثرات اور ان انقلابات کے متعلق آپ کے الہامات۔

(۴) حضرت شاہ ولی اللہ کی سوانح حیات ان کے آباؤ اجداد، اساتذہ و مشائخ، خاص تلامذہ اور اولاد امجاد کے حالات اور علمی و دینی خدمات۔

(۵) شاہ صاحب کی علمی و عرفانی خصوصیات قرآن، حدیث، فقہ اور تصوف سے متعلق علوم میں آپ کی تجدید اور فلسفۂ تشریع کی تاسیس و تدوین۔

(۶) دور حاضر کے مسلمانوں کے لیئے لائحہ عمل اور صحیح اسلامی انقلاب کا ولی اللہی پروگرام

ضخامت و قیمت:- ۴۳۴ صفحات، سائز یہی جو آپ کے پیش نظر ہے کتابت طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ سفید چکنا قسم عام (۸) قیمت دو روپیہ (عہ) قسم خاص ۲ (عہ) پیشگی الاکاغذ نہایت اعلیٰ ڈھائی روپیہ (۲ہ) محصولڈاک قسم عام ۸ قسم خاص ۹ مجلد کی قیمت ۸ زیادہ ہوگی جلد نہایت خوشنما ہوگی جس پر بلاک سے سنہری حروف میں نام کندہ ہے۔

ملنے کا پتہ مکتبہ الفرقان بریلی

Regd. No. A-596.

چند تاریخی اور اسلامی کتابیں

سیرۃ سید احمد شہید گذشتہ صدی کے مجاہدین اسلام کی قربانیاں اور ہندوستان میں احیاء کتاب و سنت کی جد و جہد کی پوری داستان مصنف کی تحریر میں ایک بے پناہ جذبہ پایا جاتا ہے کتاب بالکل مجاہدانہ رنگ میں لکھی گئی ہے اور اسمیں گذشتہ صدی کے ہندوستانی مسلمانوں کی پوری تاریخ ہے قیمت عہ

تازہ مضامین ابوالکلام مولانا کے چند اسلامی اور سیاسی مضامین ۱۰ر

محمد علی جناح مسلم لیگ کے قائد مولانا محمد علی جناح کے سوانح حیات قیمت عہ

حیاتِ آزاد حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے حالات اور سیاسی جذبات ۸ر

پھولوں کی ڈالی ولولہ انگیز اور مؤثر اسلامی نظموں کا قابل قدر مجموعہ عہ

ناموران اسلام بزرگان اسلام کے مختصر حالات زندگی عہ

ہم اور وہ ہمارے اور ہمارے اسلاف کے اعمال کا عبرت انگیز موازنہ ۱۲ر

سلطنت خداداد میسور سلطان ٹیپو شہید اور حیدر علی سلطان کے کارنامے للعہ

تاریخ مسلم لیگ مسلم لیگ کی ایک لکھی ہوئی تاریخ زمانہ غدر سے ۱۹۳۵ء تک عار

احکام القرآن قرآن پاک کے تمام احکام کا بامحاورہ ترجمہ بچوں کے پڑھنے کے قابل ۸ر

سلطان ابن سعود سلطان ابن سعود کے حالات اور حجاز و نجد و دیگر عرب ریاستوں کے حالات عار

مصطفیٰ کمال اور تاریخ ترکی و فلسطین اس کتاب میں انقلاب ترکی اور مصطفیٰ کمال کی سیرۃ مبارک پر بحث کی گئی ہے اور ترکی و فلسطین کے حالات پر بھی تبصرہ ہے عہ

سرورِ کائنات ﷺ اسپرٹ آف اسلام نامی کتاب کے حصہ سیرۃ النبی کا ترجمہ عہ

شمع انل مدح صحابۂ کرام پر ولولہ انگیز جذبہ نظموں کا مجموعہ عہ

ملنے کا پتہ :- **صدیق بک ڈپو لکھنؤ**

[illegible] ندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور مذہبی خدمت ہے

مرتبہ

سید ابوالحسن علی ندوی

باہتمام

عبد السلام قدوائی ندوی

[illegible]

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۲ جمادی الثانی ۱۳۶۰ھ مطابق جولائی ۱۹۴۱ء نمبر ۷

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر "منیجر الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ" کے پتہ پر ہونی چاہئے

شذرات

الحاد زدہ یورپ سے جو کفر و زندقہ اور بے دینی و لامذہبی کی صدائیں اٹھ رہی ہیں گو ایک عرصہ تک وہ صدا بصحرا ثابت ہوئیں لیکن بالآخر ایک عالم انکی گونج سے پرشور ہو گیا، پہلے ہم نے دیکھا کہ سواحل باسفورس اس سے متأثر ہو رہے ہیں، پھر وادی نیل میں جنبش نظر آئی، بالآخر وسط ایشیا میں ایسے بگولے اٹھے اور آخر کار ہمالیہ کی بلند چوٹیوں سے گذر کر یہ سیلاب قدامت پسند ہندوستان میں بھی آ ہی گیا، جسنے ایک حشر اضطراب اور عالم دار و گیر برپا کر دیا۔

جو کچھ ہونا تھا ہوا، حالات کی پوری تفصیل آپکے سامنے ہے لیکن کبھی آپنے اسپر بھی غور کیا کہ آخر اس الحاد عام کے اسباب کیا ہیں، دوسری قوموں اور جماعتوں کو چھوڑ دیجئے کہ آپ کا تعلق اُنسے نہیں ہے لیکن وہ مذہب اسکی زد میں کیوں آ رہا ہے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ خدا کا آخری پیغام ہے جو دین فطرت ہونیکا مدعی اور عالمگیر ہدایت کا دعویدار ہے جو کہتا ہے کہ میں دنیا کا دائمی نظام عمل ہوں اور میرے ہی پاس تشنہ کامان صداقت کو سامان سیرابی میسر آ سکتا ہے آخر اس دین حق کی تیرہ بختی کے اسباب کیا ہیں

اسلام کی تاریخ پر ایک نظر ڈالئے تو پہلے مکہ کی مقدس سرزمین پر آپ اس دعوت حق کو بلند ہوتے دیکھیں گے اور جبل ابو قبیس سے داعی حق کے پُر اثر و مقدس وعظ سنیں گے جسکی دعوت حق ہر قسم کے اختلاف، زور و شور کی مخالفت، انتہائی جبر و تعدی اور طاقت و قوت کی پوری نمائش کے باوجود نہ صرف مکہ، نہ صرف عرب، نہ صرف جوار عرب بلکہ زمین کے چپہ چپہ اور کرۂ ارض کے گوشہ گوشہ میں کامیاب ہو کر رہی، اسے نہ ابو جہل و ابو لہب کی شرارتیں روک سکیں، نہ طائف و مکہ کے

رئیسوں کی سختیاں بند کرسکیں نہ یورپ و حرب کا بغض و عناد متعصبانہ ہوسکا نہ آہن پوش فوجیں، اور خون چکاں اسلحہ اسکی مخالفت میں کامیاب ہو سکے۔

اسکے بعد اصحاب باصفا کی جماعت نظر آئیگی جسنے ظاہری بے سروسامانی اور اسباب مادی کے فقدان کے باوجود مشرق سے مغرب تک دین الٰہی کا پرچم اُڑا دیا اور اسطرح کہ جسطرف نکل گئے دوستوں نے نہیں بلکہ دشمنوں نے فرشتۂ رحمت سمجھکر ہاتھوں ہاتھ لیا، جہاں چلے گئے پورا علاقہ انھیں کے رنگ میں رنگ گیا۔ جس جگہ بیٹھ گئے دین و مذہب تہذیب و تمدن لسان و آداب آناً فاناً بدل گئے، اور اسطرح کہ آج صدیاں گذر جانے کے بعد بھی انہیں کوئی تغیر نہ ہوسکا۔

لیکن سوال یہ ہو کہ "جو دین کہ نکلا تھا بڑی شان سے وطن سے" آخر کیوں "پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے"؟ اگر سچ پوچھئے تو بات یہ ہو کہ وارثین نبوت اُسوۂ نبوی کو فراموش کرچکے ہیں دین و دُنیا کی جامعیت جو اسلام کا طرۂ امتیاز تھی عرصہ ہوا مسلمانوں سے رخصت ہو چکی ہو اور اسکے بجائے چرچ و اسٹیٹ کی راہبانہ تقسیم کا رواج ہو۔ اس تفریق نے ملت کی رگ حیات کاٹ دی ہو۔ زندگی کے تمام شعبے مذہبی رہنمائی سے محروم ہوتے جاتے ہیں، ضرورت ہو کہ مسلمان اب بھی اس حقیقت کو سمجھیں اور تعلیمی اداروں کے نصاب و نظام تعلیم میں انقلاب ہو، آیندہ نوجوانوں کی تربیت اسطرح کی جائے کہ انکی سیرت میں پختگی، ارادوں میں بلندی اور عمل میں استواری ہو۔ اسلام کے بنیادی عقائد ان کے دلوں میں اسطرح اُتر جائیں کہ پھر مخالفت کی آندھیاں اور کفر کے طوفان کوئی بھی انمیں تزلزل پیدا نہ کرسکے طبیعتوں میں ایسا استحکام اور عمل میں ایسا دوام ہو کہ اُن کے دم سے آیندہ زندگی کی راہیں بدل جائیں۔ مدت کے مرجھائے ہوئے چمن لہلہا اُٹھیں اور اس باغ کی خزاں پھر بہار سے بدل جائے

عربی مدارس کے نصاب کی اصلاح کا مسئلہ روز بروز مفکرین کی توجہ کا مرکز بنتا جا رہا ہے قارئین الندوہ کو یہ معلوم کرکے مسرت ہوگی کہ حکومت بھوپال نے بھی اس جانب توجہ کی ہے پرانے نصاب پر نظر ثانی اور نئے نصاب کا خاکہ تیار کرنے کی غرض سے پچھلے مہینہ بھوپال میں ملک کے مختلف اہل علم اور صاحب نظر علماء کا اجتماع ہوا ندوہ کے حلقہ سے مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہٗ بھی اس اجتماع میں شریک تھے بحث و گفتگو کے بعد اصلاح نصاب کے اصول اور درسی کتابوں کا ایک خاکہ تیار ہو گیا ہے امید ہے کہ رمضان بعد نصاب رائج ہو جائے۔

تعلیمی اور تدریسی حلقوں میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ۶ جولائی ۱۹۴۱ء کو مولانا عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی نے ناگہانی انتقال فرمایا۔ مولانا مدرسہ نظامیہ فرنگی محل کے پرنسپل تھے اور عرصہ سے یہ خدمت انجام دے رہے تھے، علوم عقلیہ سے خاص مناسبت تھی، اور درس نظامی کی اونچی کتابوں کا درس دیتے تھے، ان علوم سے انھیں گہرا تعلق تھا، اور وہ ہندوستان میں درس نظامی کے بڑے پرجوش حامی اور زبردست وکیل سمجھے جاتے تھے۔ ان تعلیمی اور تدریسی خدمتوں کے علاوہ سیاسی معاملات سے بھی بڑی دلچسپی رکھتے تھے اور اپنی فہم و بصیرت کے مطابق مسلمانوں کی خدمت سے کبھی غافل نہیں ہوتے تھے۔ خلافت کمیٹی کے زمانے میں فرنگی محل ان اطراف میں مسلمانوں کی سیاست کا مرکز تھا مولانا مرحوم اس کے پرجوش کارکن تھے، آخری زمانے میں مسلم لیگ کی طرف خاص توجہ تھی، اور اسکی ترقی کے لئے کوشاں رہتے تھے، خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

میری محسن کتابیں

جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم اے مدیر برہان

میری اردو اور فارسی کی پوری اور پھر عربی اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم آگرہ میں گھر پر ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ میرے والد صاحب قبلہ (اللہ اُن کی عمر دراز تر کرے) آگرہ کے نامی گرامی سرکاری ڈاکٹر ہونیکے باوجود انتہا درجہ کے مذہبی اور دیندار بزرگ تھے! اور وہ تعلیم سے زیادہ تربیت کو مقدم سمجھتے تھے انہوں نے میری عربی تعلیم کے لئے دیوبند سے ایک عالم کو معقول مشاہرہ پر بلا لیا تھا، جو ہر وقت میرے ساتھ رہتے تھے۔ اور تعلیم کے علاوہ اکثر بزرگان دین کی حکایتیں اور تاریخ اسلام کے مؤثر واقعات سناتے تھے شام کے وقت ایک ماسٹر صاحب انگریزی اور حساب وغیرہ پڑھانے آتے تھے۔ یہ سلسلہ تین سال تک قائم رہا۔ اس وقت تک اگرچہ مذہبی اعتبار سے میں نیک اور اسلامی عقائد کا پابند تھا، لیکن کوئی خاص علمی ذوق پیدا نہیں ہوا تھا۔ اکثر احباب کے اصرار پر ۱۹۲۲ء میں جبکہ میں پندرہ سال کا تھا۔ اباؔ نے بڑے اہتمام و انتظام سے مجھکو دیوبند کے مدرسہ میں داخل کرادیا۔ یہاں آکر میں درسی کتابیں تو پڑھتا ہی تھا، لیکن مجھکو خود بخود عربی ادب کا شوق پیدا ہوگیا اور خارج اوقات میں میں مصر کے جرائد و رسائل، اور عربی ادب کی قدیم جدید کتابیں بکثرت پڑھتا تھا۔ اباؔ میرے ماہانہ اخراجات کے لئے کافی روپیہ بھیجتے تھے، اسلئے مجھکو اپنے اس شوق کی تکمیل میں کوئی دشواری کبھی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے اس سلسلہ میں کامل للمبرد، اغانی، نہایۃ الارب، صبح الاعشیٰ یہ سب کتابیں دیکھیں اور پڑھیں، لیکن البیان والتبیین للجاحظ نے مجھپر سحر کا کام کیا اسکی ایک ایک فصل کئی کئی بار پڑھتا تھا اور ہر مرتبہ نیا حظ لیتا تھا نظم میں کتاب الحماسہ سے مجھکو بڑی محبت تھی، اُسکے سیکڑوں اشعار نوک زبان ہوگئے تھے۔ درسیات میں منطق، فلسفہ، فقہ، تفسیر، ہیئت، تاریخ معانی و بیان اور عروض وغیرہ سب کچھ پڑھا، لیکن ادبی ذوق کی وجہ سے معانی و بیان پر جتنا وقت

صرف کرتا تھا کسی اور علم پر نہ کرتا تھا فلسفہ اور منطق کے اسباق میں با دل نخواستہ شرکت کرتا تھا لیکن جب امام غزالیؒ کی مقاصد الفلاسفہ اور پھر تہافۃ الفلاسفہ میں نے خود مطالعہ کی تو فلسفہ میں بھی لطف آنے لگا۔ اور اس ذوق نے یہاں تک ترقی کی کہ ابن سینا کی اشارات امام رازیؒ اور محقق طوسی کی شرحوں سے حل کی اور اسکو اول سے آخر تک خود ہی پڑھا۔

عربی نظم میں درسی کتابوں کے علاوہ ابو العلاء معری کی سقط الزند اور لزوم مالا یلزم اور دیوان حسانؓ بن ثابت کا میں بہت گرویدہ تھا۔ آخر یہ کتابیں میرے ساتھ رہتی تھیں۔ لیکن یہ سارا شوق ذوق محض طالبعلمانہ تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ بعد میں جو میرا سنجیدہ ذوق علمی تعمیر ہوا اسمیں مولانا شبلی مرحوم اور مولانا سید سلیمان ندوی کی بعض کتابوں کو بھی بڑی حد تک دخل ہے۔ میں اردو کے ادبی رسالے، افسانے اور ناول پڑھتا ہی تھا مولانا ابو الکلام کے الہلال کی بھی جلدیں پڑھیں۔ اور انکا تذکرہ اور مسئلہ خلافت بھی پڑھا، اور بعض مضامین کئی کئی دفعہ پڑھے۔ لیکن یہ اثر عارضی تھا، دو ایک برس کے بعد اتر گیا۔ مولانا شبلی کی کتابوں میں سب سے پہلے شائد میں نے المامون اور الغزالی پڑھیں۔ مولانا کے انداز نگارش، طرز تحقیق، اور طریقۂ بحث نے دل پر عجیب اثر کیا۔ اور میں مولانا کی تحریروں کا ایسا گرویدہ ہوگیا کہ میں نے آپکی سب کتابیں خریدیں۔ اور پڑھیں۔ الفاروق اور سیرۃ النبیؐ جلد اول کئی بار پڑھیں، اور ان دونوں کے مقدمے تو خدا جانے کتنی مرتبہ پڑھے ہیں۔ ٹھیک یاد بھی نہیں اسی تقریب سے ارض القرآن کی دونوں جلدیں اور سیرت عائشہؓ و امام مالکؒ مطالعہ کیں۔ اور دلپر مولانا سید سلیمان ندوی کی کاوش و محنت، جمع و ترتیب واقعات کا حسن سلیقہ اور ان کے شبلوی انداز تحریر نے بھی دلپر گہرا اثر کیا۔ اب میں رسالہ معارف کا خریدار بھی بنگیا، اور بجائے محض ادبی رسالوں کے سنجیدہ اور ٹھوس رسالے پڑھنے لگا۔ معارف خود خریدتا تھا اور جامعہ، اردو اور زمانہ مانگ تانگ کا پڑھتا تھا۔ اب طبیعت ادب لطیف اور افسانوی ولفاظی کے بجائے سنجیدہ علمی حقائق کی جویا ہوگئی میں

اُس زمانہ میں معارف کے سب مضامین سمجھتا نہیں تھا لیکن یہ جانتا تھا کہ جب معارف میں چھپا ہو تو یقیناً بلند معیار کا ہوگا، اور مضمون نگار نے اسکے لکھنے میں کوشش کی ہوگی اسلئے دل میں قدر، اُن چھوٹے چھوٹے مضامین کی بھی ہوتی تھی۔ معارف کا ایک ایک پرچہ محفوظ رکھتا تھا اور جلد کے ختم پر اُسے مجلد کرالیتا تھا۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں تمام علوم و فنون درسیہ سے فارغ ہونیکے بعد مجھکو حضرت مولانا سید محمد انور شاہ مرحوم سے بسلسلۂ دورۂ حدیث بخاری اور ترمذی کا درس لینے کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت شاہ صاحب کا درس کیا تھا، علوم و فنون کا ایک بحر زخار تھا جو شروع سے آخر تک پوری تیزی سے موجزن رہتا تھا، حضرت شاہ صاحب اپنی تقریر میں کثرت سے نامور مصنفین و ائمۂ اسلام کے حالات، اُن کے علمی و عملی کارنامے، اجتہادات اور اُن پر تنقید وغیرہ بیان فرماتے رہتے، خصوصاً علامہ ابن جوزی، حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، حافظ ابن حجر وغیرہم کا ذکر بہت ہی رہتا تھا حضرت شاہ صاحب کی ان تقریروں سے ہی مجھکو حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی کتابوں کا شوق ہوا اور میں نے ان دونوں اماموں کی متعدد کتابیں پڑھیں۔ کچھ سمجھ میں آئیں اور کچھ نہیں آئیں بہرحال پڑھیں سب۔ مولانا شبلی مرحوم کی تصنیفات نے جستجوئے علمی ذوق کی طرح ڈالدی تھی حضرت شاہ صاحب کے درس نے اسمیں پختگی پیدا کردی۔ درس کے علاوہ میں یوں بھی حضرت کی پرائیوٹ مجلس میں شریک ہوتا رہتا تھا۔ آپکی عام گفتگو بھی درس سے کم نہیں ہوتی تھی، میں اس سے استفادہ کرتا تھا۔

جیسا کہ میں نے شروع میں لکھا ہے، ابا نے انگریزی اور عربی دونوں ساتھ شروع کرائی تھیں لیکن دیوبند میں پہنچکر انگریزی کا سلسلہ ختم ہوگیا تھا، اب فارغ التحصیل ہونیکے بعد خیال آیا کہ لاؤ انگریزی کی بھی تکمیل کرلوں، بعض امتحانات پرائیوٹ اور بعض کالج میں داخل ہوکر دیے سب میں سکنڈ کلاس کے نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ آخر میں ایم اے میں فرسٹ کلاس فرسٹ رہا۔ بی اے میں میرے استاد آگرہ یونیورسٹی کے ایک بنگالی پروفیسر تھے، وہ انگریزی کے بڑے اچھے ادیب تھے

انھوں نے مجھ میں بھی انگریزی لٹریچر کا شوق پیدا کر دیا۔ میں نے اس سلسلہ میں زیادہ تر ادبی کتابیں پڑھیں۔ ... انقلاب فرانس، مفکرین کے مقالات اور تاریخ ہند اور سیاسیات پر بھی بعض کتابوں کا مطالعہ کیا لیکن سید امیر علی کی اسپرٹ آف اسلام کئی بار مطالعہ کی اور آجتک اپنے دل میں اُسکی نمایاں قدر پاتا ہوں۔

فارسی میں میرا مطالعہ شعرا کے دواوین اور چند تاریخی کتابوں تک محدود ہے۔ دواوین میں میں نے قاآنی، خسرو، نظامی، جامی، نظیری، عرفی، خاقانی وغیرہم سب کو پڑھا ہے لیکن دیوان حافظؒ اور دیوان غالب مجھکو سب سے زیادہ عزیز ہیں اور خصوصاً دیوان حافظ کو تو میں اپنا مونس تنہائی شریک رنج و راحت اور پریشانی میں ہمدرد و غمگسار سمجھتا ہوں۔ میں نے بارہا تجربہ کیا ہے کہ جب کسی وجہ سے سخت اضطراب اور ہیجان کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو اسی حالت میں میں دیوان حافظؒ پڑھنے لگتا ہوں۔ دو ایک غزلوں کے بعد ہی محسوس ہوتا ہے کہ گویا کوئی اضطراب تھا ہی نہیں۔ ایک مرتبہ تو لسان الغیب نے پیر و مرشد ہی کا کام کیا اللہ تعالیٰ سے رجوع ہوا اسکی تفصیل کی تو اتنی ضرورت نہیں لیکن واقعہ یہی ہے کہ میں ایک مرتبہ سخت فتنہ میں مبتلا ہو گیا تھا، اگر حضرت لسان الغیب ایک شعر کے ذریعہ میری رہنمائی نہ فرماتے تو میں ارتکاب معصیت کے علاوہ شدید جانی و مالی نقصان سے دوچار ہو جاتا۔ بلبل شیراز کا یہ احسان اتنا بڑا ہے کہ میں اس سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اور اسی وجہ سے میں اُن کا دیوان حد سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ میں نے کئی دفعہ دیوان سے فال بھی نکالی ہے اور وہ صحیح ثابت ہوئی ہے۔

آخر میں عرض یہ کرنا ہے کہ یہ جو کچھ میں نے لکھا پڑھا یا اب جو کچھ لکھتا پڑھتا ہوں وہ میرے نزدیک فیض و برکت ہے میرے والد صاحب قبلہ کے حُسن نیت و عمل کا جنھوں نے عربی تعلیم کو بُرا سمجھنے والے لوگوں کی سوسائٹی میں رہنے کے باوجود محض خالصۃً لوجہ اللہ مجھکو عربی تعلیم دلائی اور اس پر اتنا ہی خرچ کیا جتنا کوئی مالدار اپنے اولاد کی انگریزی تعلیم پر خرچ کر سکتا ہے، اور یہ سب صدقہ ہے میری والدہ محترمہ

کی دعاؤں کا جنھوں نے تہجد کی نمازوں میں میرے حسن علم و عمل کے لئے بارگاہ ایزدی میں رو رو کر التجائیں کی ہیں اور کبھی انھوں نے یہ خواہش نہیں کی کہ دنیوی اعتبار سے مجھے کوئی جاہ و منصب ملے اللہ دونوں کی عمر دراز کرے اور مجھکو اُن کی تمناؤں کے مطابق حسن عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

فخرِ قوم ملا عبدالقیوم ؒ کی یاد میں

مجلہ نظامیہ حیدرآباد دکن کا خصوصی شمارہ آج سے ۵۲ سال سے اتحاد اسلامی، آزادی وطن اور قومی تعلیم کی جد و جہد میں فخرِ قوم ملا عبدالقیوم کا خاص حصہ رہا ہے اور اپنی تمام عمر خدمت ملک و مذہب میں صرف کی اس قابل یادگار ہستی کے کارنامے مجلہ نظامیہ کے خصوصی شمارہ میں جمع کئے گئے آپ کی سیرت ہر کارکن قومی کے لئے شمع ہدایت ثابت ہوگی رعایتی قیمت [illegible] روپے مجلہ نظامیہ حسینی علم حیدرآباد دکن سے حاصل کر سکتا ہے۔

مولوی حاجی معین الدین صاحب ندوی مرحوم

از جناب مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی مدیر کانفرنس گزٹ

موت کا کوئی وقت معین نہیں اسلئے جس وقت بھی وہ واقع ہو کوئی عجیب و غیر معمولی بات نہیں لیکن بایں ہمہ بسا اوقات جب ہم اچانک اپنے کسی عزیز یا دوست کی خبر وفات سنتے ہیں تو یہ ہمیں خلاف توقع چیز معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ مولوی حاجی معین الدین صاحب ندوی کی رحلت بھی ہماری جماعت کے لئے ایک خلاف توقع واقعہ ہے جو اچانک پیش آیا کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی یہ نہ سمجھتا تھا کہ حاجی صاحب مرحوم ہم سے اس قدر جلد جدا ہو جائیں گے۔

ابھی کل کی بات ہے کہ حاجی صاحب دار العلوم ندوۃ العلماء میں پڑھتے تھے۔ انکا عنفوان شباب تھا، اور صحت نہایت اچھی۔ بے فکری تھی اور آزادی، دنیا کے جھگڑوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ندوہ سے نکلکر عملی دنیا میں قدم رکھا۔ یہ گویا ان کی زندگی کا دوسرا دور تھا، جو تالیف و تصنیف اور درس و تدریس میں گذرا، اور اسی طرح گذر رہا تھا کہ پیام اجل آیا، اور وہ دفعتاً ہم سے جدا ہو گئے چونکہ مرحوم کی زندگی کا آغاز و انجام پیش نظر ہے اسلئے یہ سارا واقعہ ایک کھیل معلوم ہوتا ہے اور کھیل بھی ایسا جس کے سارے مناظر جلد جلد ہماری آنکھوں کے سامنے سے گذر گئے اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

جب میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت طالب علم داخل ہوا تو پہلے ہی روز حاجی صاحب مرحوم اور مولوی (اب حاجی) مسعود علی صاحب ندوی نیز دو تین اور طلبہ سے ملاقات ہوئی جو زمانۂ مابعد میں بہترین رفیق اور شریف دوست ثابت ہوئے۔ یہ سب میرے ہم سبق تھے لیکن حاجی صاحب مرحوم کے ساتھ یہ مزید خصوصیت تھی کہ ہم دونوں ایک ساتھ رہتے تھے۔ گویا پڑھنا لکھنا، رہنا سہنا، کھانا پینا، سیر و تفریح یعنی شبانہ روز کی پوری زندگی ایک ساتھ گذرتی تھی۔ کئی سال اسطرح گذر گئے

ایک شریف طالبعلم کی زندگی عمومًا ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح سب کے سامنے ہوتی ہے۔ وہ تصنع، ریاکاری اور زمانہ سازی سے عمومًا بالاتر ہوتا ہے، البتہ جب وہ عملی دنیا میں قدم رکھتا ہے تو ماحول کے اثرات اور دوسرے لوگوں کی صحبت سے اُس میں اس قسم کی کمزوریاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ حاجی صاحب بھی اپنی طالبعلمانہ زندگی میں بناوٹ اور ریاکاری سے بالکل دور تھے۔ البتہ طبیعت کسی قدر دیرآشنا تھی، اسلئے ہر کس و ناکس سے جلد مانوس نہیں ہوتے تھے لیکن جب مناسبت طبع اور اتحاد ذوق کی بنا پر کسی سے مانوس ہوجاتے تو پھر اس پر پورا اعتماد کرتے اور اخلاص و بے تکلفی سے ملتے تھے۔ ایک دفعہ اعتماد کرلینے کے بعد پھر اُن کے دل میں اپنے احباب کی طرف سے بدگمانی نہیں پیدا ہوتی تھی۔

حاجی صاحب طالبعلمی کے زمانہ میں بھی بلند نظر و باوقار تھے۔ عادات و اطوار میں شائستگی اور خودداری تھی، اور عزتِ نفس کا پاس، اسلئے کوئی مبتذل اور گھٹیا حرکت اُن سے کبھی سرزد نہیں ہوتی تھی، اور وہ ہمیشہ عامیانہ و سوقیانہ صحبتوں سے بچتے تھے۔ البتہ اپنے مخصوص احباب کے حلقے میں وہ بے تکلف اور خوش مزاج نظر آتے تھے۔ حفظ مراتب کا انہیں خاص خیال رہتا تھا۔ اسلئے وہ اپنے سے کم عمر اور چھوٹی جماعتوں کے طلبہ کو کبھی اس کا موقع نہیں دیتے تھے کہ وہ اُن سے مساویانہ بے تکلفی کے ساتھ بات چیت کریں۔ اسی طرح وہ اپنے اساتذہ اور بزرگوں کا پورا احترام کرتے اور ان کے ساتھ تہذیب و شائستگی سے پیش آتے تھے۔ لیکن اس میں بھی اعتدال پیش نظر رہتا، کسی بلند شخصیت کے سامنے جھکنا، اسکی ہاں میں ہاں ملانا اُن کی عادت نہ تھی۔ وہ طبعًا آزاد خیال تھے اور بے نیازی کی شان اُن کے ہر انداز سے نمایاں تھی۔

حاجی صاحب کی ایک خاص شرافت یہ تھی کہ وہ لوگوں کے عیوب اور اخلاقی کمزوریوں کی پردہ پوشی کرتے اور خلوت یا جلوت میں ان باتوں کا تذکرہ کرکے کسی کو رسوا [illegible]

بلکہ اگر کسی صحبت میں اس قسم کے تذکرے چھڑ جاتے تو وہ حتی الامکان موضوع گفتگو بدل کر لوگوں کو کسی اور طرف متوجہ کر دیتے تھے۔

حاجی صاحب کی زندگی نہایت سادہ اور معتدل تھی، وہ کبھی اپنی حیثیت سے زیادہ نہیں خرچ کرتے تھے اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انھیں کسی خاص چیز کا شوق نہیں ہے جس پر وہ بلالحاظ عواقب روپیہ خرچ کریں۔ اگر کسی موقع پر انکے پاس روپیہ نہ رہتا اور مکان سے آنے میں دیر ہوتی تو وہ اپنے ضروری خرچ بھی بند کر دیتے اور کسی سے قرض لیکر اپنی ضرورت پوری نہیں کرتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے کسی ضرورت کے لیے کبھی کسی سے قرض لیا ہو، وہ ہمیشہ ہر چیز نقد خریدتے اور "دارالاقامہ" کی فیس بروقت ادا کرتے۔ اسی عادت کی بنا پر کبھی کسی کا آنہ بھی مطالبہ ان کے ذمہ نہیں رہا۔ اسی طرح وہ سب معاملات میں صفائی کا لحاظ رکھتے تھے۔ دیانت اور ذمہ داری کا احساس انکی خصوصیت تھی۔

حاجی صاحب ایک ذہین و ذکی استعداد طالب علم تھے، انکی قوت مطالعہ اچھی تھی اور دماغ سلجھا ہوا، اسلئے وہ عموماً ہر چیز کو صحیح طور پر سمجھتے تھے۔ ایسا شاذ و نادر ہوتا تھا کہ ان کا دماغ کجی کی طرف مائل ہو، وہ عام طلبا کی طرح کسی کتاب و مضامین کا طوطے کی طرح رٹنا اور بار بار یاد کرنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ جب کسی مسئلہ کو سمجھنا اور ذہن نشین کرنا چاہتے تو کتاب لیکر ایک طرف بیٹھ جاتے اور کامل توجہ اور پوری انہماک و یکسوئی کے ساتھ مطالعہ میں مستغرق ہو جاتے یہاں تک کہ اس مسئلہ کو بخوبی سمجھکر محفوظ کر لیتے اور جب انھیں یقین ہو جاتا کہ مسئلہ ذہن نشین ہو گیا تو پھر فوراً کتاب بند کرکے دوسرے کاموں میں اسطرح مصروف ہو جاتے کہ گویا انھیں کتاب سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

جہاں تک عام حالت کا تعلق ہے حاجی صاحب روزمرہ زیادہ محنت نہیں کرتے تھے۔ بس مقررہ کام انجام دیتے اور پوری نیند سوتے۔ لیکن جب وہ قطعی طور پر محسوس کرتے کہ اب کام کرنیکا وقت آگیا تو دفعتاً ان کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہو جاتا اور وہ ہمہ تن کام میں مصروف ہو جاتے اور بڑی

مستعدی سے امتحان کے لئے تیاری کرتے اور کامیاب ہوتے۔

نماز عصر کے بعد وہ درسی سلسلہ کا کام بالکل بند کر دیتے اور یہ وقت عموماً اخبار بینی میں صرف کرتے تھے۔ وہ اخبار پوری توجہ سے پڑھتے اور زیر بحث مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرتے، وہ ہر مسئلہ کے متعلق اپنی مستقل رائے رکھتے تھے، کورانہ تقلید سے بالاتر تھے۔

اُس زمانہ میں دار العلوم ندوہ میں اردو عربی کے بہت سے اخبارات آتے تھے، جو طلبہ کے "دار المطالعہ" میں جس کا نام "دار المعلومات" تھا میزوں پر رکھ دیے جاتے تھے۔ دار المعلومات کا انتظام طلبہ کے ہاتھ میں تھا، ایک زمانہ میں حاجی صاحب بھی اُسکے ناظم تھے، وہ اخبارات فراہم کرنے کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم اس زمانہ میں دار العلوم کی پرانی عمارت کے احاطہ میں بالائی منزل پر رہتے تھے، مولانا مرحوم کے پاس بہت سے اخبارات آتے تھے، لیکن مولانا کو اس طرح ان کے پڑھنے کی کہاں فرصت تھی وہ ان اخبارات پر ایک سرسری نظر ڈال کر میز کے نیچے پھینک دیتے حاجی صاحب شام کو یہ اخبارات اُٹھا لاتے، اکثر ایسا بھی ہوتا کہ مولانا مرحوم ان اخباروں کو کمرہ کے ایک دروازہ سے (جہاں اُن کے لکھنے پڑھنے کی میز تھی) باہر پھینک دیتے۔ کمرہ کے نیچے ایک دوسرے کمرہ کا چھپر تھا۔ یہ اخبار اُس پر آکر گرتے، حاجی صاحب یہ کرتے کہ ایک لانبا بانس لیکر اُسکے سہارے سے یہ اخبار چھپر سے اُتار لیتے اور دار المعلومات میں لاکر رکھتے۔

اس زمانے میں امین آباد پارک میں ایک مسلم کلب بھی تھا، جہاں اُردو انگریزی کے بہت سے اخبارات آتے تھے۔ ہم لوگ نماز عصر کے بعد عموماً وہاں جایا کرتے تھے لیکن جب علامہ شبلی نعمانی لکھنؤ میں تشریف رکھتے ہوتے تو شام کو ہماری حاضری عموماً علامہ کے یہاں ہوتی۔ یہ عجیب صحبت تھی، یہاں سے ہم عموماً معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ لیکر اُٹھتے۔ مولانا بھی ہم لوگوں کو عزیز رکھتے اور تقریباً ہر حاضری کے موقع پر کسی نہ کسی معاملہ میں ہماری رہنمائی فرماتے تھے۔

جس روز اس صحبت میں کوئی خاص علمی یا تاریخی نکتہ ہمیں معلوم ہوتا تو ایک بے پایاں مسرت و خوشی حاصل ہوتی تھی، اب یہ مسرت کہاں میسر آسکتی ہے، بس ایک خواب تھا جو کبھی دیکھا تھا۔

اس زمانہ میں ہمارے احباب و رفقا میں ایک اور دلچسپ ہستی تھی، جسے ہم سب "خواجہ صاحب" کہتے تھے لیکن آخر میں ان کا ایک اور بہت دلچسپ نام مشہور ہو گیا تھا جس کا یہاں ظاہر کرنا مناسب نہیں، ورنہ خواجہ صاحب جو طالب علمی کے زمانہ میں بھی اس نام سے ناخوش ہوتے تھے اب اور زیادہ ناخوش ہوں گے۔ بہرحال خواجہ صاحب بھی ہم لوگوں کے ساتھ شام کو علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے، ان کے خاص انداز، اطوار، طبیعت کی جلد بازی، اور کثرت استفسارات کی وجہ سے علامہ کو بھی ان سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور وہ خواجہ صاحب کی حرکتوں پر اکثر ہنس دیا کرتے تھے۔

خواجہ صاحب کی عادت تھی کہ وہ علامہ کا ایک ایک لفظ غور سے سنتے اور جب کوئی ایسا لفظ سنتے جس سے ان کے کان پہلے سے آشنا نہیں یا اس کا محل استعمال معلوم نہیں تو وہ اسی صحبت میں آہستہ آہستہ بلکہ بار بار اس لفظ کا اعادہ کرتے تاکہ بھول نہ جائیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا کہ ادھر علامہ کی زبان سے کوئی نیا لفظ نکلا اور ادھر خواجہ صاحب کے ہونٹھ آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگے۔ وہاں سے اٹھکر خواجہ صاحب روزمرہ کی بات چیت میں کوئی نہ کوئی موقع نکال کر یہ نئے الفاظ ضرور استعمال کرتے تھے حاجی صاحب بلکہ ہماری ساری جماعت کو خواجہ صاحب سے خاص دلچسپی تھی، اب وہ ایک کالج میں پروفیسر ہیں اور ایک متین و سنجیدہ بزرگ سمجھے جاتے ہیں۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ خواجہ صاحب طلبائے دارالعلوم کی ایک انجمن کے ناظم (سکرٹری) منتخب ہو گئے۔ حاجی صاحب نے پیشگی رنگ برنگ کاغذوں کا ایک اونچا تاج بنایا اور اسے پھولوں سے خوب سجایا اور ایک جگہ محفوظ کر دیا۔ انتخاب کے بعد طلبہ ہال میں جمع ہوئے اور انجمن کا پہلا جلسہ منعقد ہوا، اسکے بعد خواجہ صاحب شکریہ کی تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو حاجی صاحب نے

پشت کے دروازے سے نمودار ہو کر تاج اُن کے سر پر رکھ دیا، جس سے خواجہ صاحب کی صورت عجیب مضحکہ انگیز بن گئی، انھوں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا اور نہایت سنجیدہ انداز اختیار کر لیا۔ مجمع میں ہر طرف سے قہقہہ بلند ہوا، مگر خواجہ صاحب نے اپنے اسی سنجیدہ انداز میں ایک تقریر کرتے ہوئے اس "تاج بخشی" پر حاجی صاحب اور طلبائے دار العلوم کا شکریہ ادا کیا، تقریر کے دوران میں تاج بدستور سر پر رہا۔ یہ مذاق دیکھتے دیکھتے سارا جلسہ سنجیدہ بن گیا اور خواجہ صاحب اپنی تدبیر میں کامیاب ہوئے۔

اسی طرح کے اور بہت سے دلچسپ واقعات حاجی صاحب کے زمانۂ طالبعلمی کے ہیں، جو بخوف طوالت نظر انداز کئے جاتے ہیں۔ یہ چند واقعات بھی اسلئے عرض کئے گئے کہ ایک ندوی بھائی اور مرحوم دوست کی طالبعلمانہ زندگی کی ایک جھلک ہمارے بھائیوں کے سامنے آجائے۔ اگر حاجی صاحب ابھی ہم سے رخصت نہ ہوتے تو کسی نہ کسی حیثیت سے بار بار اُن کا ذکر آتا اور شاید وہ خود بھی کبھی الندوہ میں لکھتے اور طلبائے قدیم کے جلسوں میں شریک ہوتے۔ اب یہ صورت ممکن نہیں اسلئے بے اختیار دل چاہا کہ رفیق دیرینہ کے متعلق چند الفاظ لکھ دیے جائیں جو بطور یادگار باقی رہیں، اب کون بار بار اُن کا ذکر کریگا۔ البتہ انکی تصانیف ایک زندہ یادگار ہیں جو مدت تک باقی رہیں گی۔

جب میں اور حاجی معین الدین صاحب دار العلوم ندوہ میں اپنی تعلیم ختم کرکے فارغ ہوئے تو ندوہ ایک دور انقلاب سے گذر رہا تھا، تعلیمی و انتظامی حالت میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور ارکان ندوۃ العلما کی باہمی کشمکش اور اختلافات سے شکستہ خاطر ہو کر علامہ شبلی نعمانی اپنے عہدۂ معتمدی سے دستکش ہو چکے تھے اور مستقل قیام کے ارادے سے اپنے وطن اعظم گڈھ تشریف لیگئے تھے۔ جہاں آپ "دار المصنفین" قائم کرنیکے لئے جد وجہد میں مصروف تھے۔ علامہ نے دار المصنفین کا ایک خاکہ مرتب کیا تھا اور یہ طے کر لیا تھا کہ اپنا بنگلہ اور باغ اس کام کے لئے وقف فرما دیں گے۔ دار المصنفین کے لئے علامہ کو ایسے صحیح المذاق ذہین الاستعداد نوجوانوں کی ضرورت تھی جو فی الجملہ تصنیف کا سلیقہ رکھتے ہوں اور انکے زیر تربیت

رہ کر تالیف و تصنیف کی خدمت انجام دے سکیں. گویا مختصر الفاظ میں دار المصنفین کا مقصد یہ تھا. کہ بہترین مصنف پیدا کئے جائیں جو موجودہ زمانہ کے حالات کے مطابق تالیف و تصنیف کا کام کرسکیں.

یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے نوجوان اُنھیں صرف دار العلوم ندوہ ہی سے مل سکتے تھے جنھوں نے سالہا سال تک علامہ کے زیر نگرانی تعلیم حاصل کی تھی اور برسوں تک اُنکی صحبت سے متمتع ہوچکے تھے. اسکے علاوہ ایک حد تک تالیف و تصنیف کے مبادی سے بھی آشنا تھے اسی بنا پر علامہ نے ہم میں سے چند طلبہ کو جو تعلیم سے فارغ ہوچکے تھے اور زمانۂ طالبعلمی میں اُن کے حلقہ نشین تھے اس کام کے لئے منتخب کرکے اعظم گڈھ طلب کیا تھا لیکن ابھی اس سلسلہ میں مراسلت ہو رہی تھی کہ علامہ نے رحلت فرمائی.

اس زمانہ میں حاجی صاحب عارضی طور پر وطن جاچکے تھے اور میں لکھنؤ میں تھا، اور رسالہ الندوہ کی ایڈیٹری کے فرائض ادا کر رہا تھا، یہ علمی و تاریخی رسالہ جو ندوۃ العلما کا آرگن تھا کچھ مدت پہلے بند ہوچکا تھا اور علامہ شبلی نعمانی جو رسالہ کے ایڈیٹر تھے، اس کام سے دستکش ہوگئے تھے.

غرض دار العلوم ندوہ سے فارغ ہونیکے بعد میرا قیام تو رسالۂ الندوہ کے کام کی وجہ سے لکھنؤ میں رہا، لیکن حاجی معین الدین صاحب چند روز بعد اعظم گڈھ چلے گئے. مولوی مسعود علی صاحب ندوی پہلے ہی (علامہ کی رحلت کے بعد) اعظم گڈھ جاچکے تھے. مولانا سید سلیمان صاحب ندوی بھی پونا سے اپنے پروفیسری کے عہدہ سے مستعفی ہوکر اعظم گڈھ چلے آئے تاکہ بحیثیت جانشین علامہ مرحوم دار المصنفین کی تاسیس و ترقی اور سیرت نبویؐ کی تکمیل کے لئے کوشش کریں.

علامہ کے ان سب مخلص تلامذہ نے نہایت ایثار و ہمت سے کام لیکر اپنا اپنا کام شروع کردیا. مولانا سید سلیمان ندوی سیرت کی تالیف و تدوین میں مصروف ہوگئے. مولوی مسعود علی صاحب ندوی نے انتظامی کاروبار سنبھالا یعنی منیجر کے فرائض اپنے ذمہ لے لئے. اور حاجی معین الدین صاحب ندوی تالیف و تصنیف میں مشغول ہوگئے.

"یادش بخیر" مولوی حاجی مسعود علی صاحب کا ذکر آگیا ہو تو برسبیل تذکرہ یہ کہنا بے موقع نہو گا کہ مولوی صاحب موصوف کو زمانۂ طالبعلمی ہی سے انتظامی اور کاروباری معاملات سے دلچسپی تھی اور ان امور میں ایک خاص سلیقہ آپکو حاصل تھا جس کا علامہ کو بھی اعتراف تھا، چنانچہ وہ اپنے ذاتی امور کے انصرام میں مولوی صاحب موصوف کے اس سلیقہ سے فائدہ اُٹھایا کرتے تھے۔ یہانتک کہ اکثر اوقات علامہ کی شیروانیاں وغیرہ بھی مولوی مسعود علی صاحب کے مشورہ سے اور ان کے زیر نگرانی تیار ہوتی تھیں۔ دارالمصنفین کے منیجر ہونے پر اُن کی یہ صلاحیت اور زیادہ نمایاں ہوگئی جبکہ اُنھوں نے اعظم گڈھ جیسے مقام پر ایک مطبع قائم کیا اور پھر بتدریج اُسکو شاندار پیمانہ پر پہونچایا اور دارالمصنفین کے کاروبار کو غیر معمولی ترقی دی۔

یہ ایک ضمنی تذکرہ تھا۔

غرض حاجی معین الدین صاحب دارالمصنفین کے اولین رفقاء میں تھے، اور انھوں نے ایک خوشگوار ماحول میں اپنا کام شروع کیا۔ اس سے میرا مقصد یہ ہو کہ دارالمصنفین میں سب کام کرنے والے ندوی تھے، اسلئے اُن کے خیالات و افکار میں یکسانیت تھی، اسکے علاوہ وہ سب علامہ کی بارگاہ فضل و کمال کے حاشیہ نشین تھے، اور کم و بیش اُن کے علمی فیوض و برکات سے مستفید ہو چکے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ ہو کہ علامہ کے مقصد حیات اور ندوۃ العلماء کے اعلیٰ نصب العین سے واقف تھے، ان حالات کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ دارالمصنفین کا کام اخلاص و ہم آہنگی کی فضا میں شروع ہوا۔ آج دارالمصنفین کو ہندوستان کے علمی و قومی اداروں میں جو درجہ حاصل ہو وہ اسی اتحاد فکر و عمل کا نتیجہ ہے۔

اس زمانہ میں جو سب سے مقدم کام دارالمصنفین کے پیش نظر تھا وہ "سیرت نبویؐ" کی تکمیل تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ اسکیم بھی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے بعد خلفائے راشدین رض اور صحابۂ کرامؓ کے مفصل حالات بھی مرتب کئے جائیں تاکہ خیر القرون کی تاریخ کا ایک مکمل سلسلہ تیار ہو جائے۔ سیرت نبویؐ کی تالیف و تدوین کی خدمت برادر محترم مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے اپنے ذمہ لی۔

کیونکہ سید صاحب ممدوح سیرت کے سلسلہ میں علامہ مرحوم کے ساتھ کام کرکے ایک خاص بصیرت حاصل کرچکے تھے اور علامہ کے دماغ میں جو سیرت کا خاکہ تھا اُس سے واقف تھے۔

سلسلہ "سیر الصحابہ" کا کام مولوی حاجی معین الدین صاحب کے سپرد کیا گیا۔ چنانچہ حاجی صاحب نے بڑی محنت سے اپنا کام شروع کیا، اور اس سلسلہ کی دو جلدیں تالیف کیں۔ پہلی جلد کا نام "خلفائے راشدین" ہے، اور دوسری کا "مہاجرین"۔ یہ دونوں کتابیں دار المصنفین کے سلسلہ تصانیف میں ایک خاص درجہ رکھتی ہیں، اور ان کے مطالعہ سے حاجی صاحب مرحوم کی محنت و تلاش کا اندازہ ہوتا ہے۔

دار المصنفین میں کچھ زمانہ تک قیام کے بعد حاجی صاحب کتب خانۂ ندوۃ العلماء کی از سر نو ترتیب کے لئے لکھنؤ طلب کئے گئے۔ لکھنؤ ہم ندویوں کا گویا گھر ہے، اور اپنی مادر درسگاہ کی کوئی خدمت ہر ندوی کے لئے باعث صد مسرت۔ اسلئے حاجی صاحب نے یہ خدمت خوشی سے قبول کی۔ حاجی صاحب کے ذمہ جو کام کیا گیا تھا، وہ بہت محنت طلب تھا۔ کتابوں کی مجوزہ فہرست کے جو عنوان تجویز کئے گئے تھے، وہ ایسے تھے کہ انکی خانہ پُری کے بعد ہر کتاب کے مضامین اور مصنف کے متعلق ضروری معلومات حاصل ہو جاتے تھے۔ لیکن ان معلومات کے حاصل کرنے کے لئے حاجی صاحب کو پوری توجہ سے ہر کتاب کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا۔ میں برابر دیکھا کرتا تھا کہ حاجی صاحب یہ کام کیسی محنت و شوق سے انجام دیتے تھے۔

ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں ایک معقول حصہ نادر الوجود قلمی کتابوں کا تھا، جو زیادہ تر علامہ شبلی نعمانی کے ذاتی کتبخانہ سے منتقل ہو کر آئی تھیں، کیونکہ ممدوح نے اپنا کتب خانہ جو ساری عمر کی کمائی تھی، اور برسوں کی تلاش و جستجو اور بلاد اسلامیہ کی سیاحت کا نتیجہ تھا، ندوۃ العلماء کے لئے وقف فرما دیا تھا۔ ترتیب فہرست کے وقت یہ قلمی کتابیں خاص توجہ سے دیکھی جاتیں اور ان کے متعلق تمام ضروری معلومات حاصل کئے جاتے تھے، مثلاً یہ کہ کتاب مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے یا کسی دوسرے شخص نے مصنف کے عہد میں لکھی ہے اور یہ کہ مصنف کی نظر سے گذری ہے یا نہیں، غرض حاجی صاحب کتاب کی جملہ خصوصیات

تلاش کر کے اُس کے وجوہِ ندرت قلمبند کرتے تھے۔ حاجی صاحب نے اس سلسلہ میں جو محنت کی اس کا تفصیلی ذکر یہاں ممکن نہیں اس کام سے خود حاجی صاحب کو یہ فائدہ پہونچا کہ قدما کی تصنیفات پر اُن کی نظر بہت وسیع ہو گئی اور تلاش و تحقیقات کا ایک خاص ذوق اُنہیں پیدا ہو گیا۔

لکھنؤ کے بعد حاجی صاحب "بوہار امپیریل لائبریری کلکتہ" میں ترتیب فہرست کے کام پر مامور ہوئے حسب معمول یہاں بھی آپ نے اپنا کام بڑی محنت و سلیقہ سے انجام دیا۔ کلکتہ کے بعد آپ "خدا بخش لائبریری یعنی اورنیٹل لائبریری بانکی پور پٹنہ" میں عربی کتابوں کی ترتیب فہرست کے کام پر مقرر ہوئے۔ نادر الوجود کتابوں کے لحاظ سے اس لائبریری کو جو شہرت و اہمیت حاصل ہے وہ اہلِ بصیرت سے مخفی نہیں۔ حاجی صاحب ضلع پٹنہ کی ایک مردم خیز بستی کے رہنے والے تھے اسلئے پٹنہ گویا حاجی صاحب کا وطن تھا۔

پٹنہ پہونچکر حاجی صاحب اطمینان کے ساتھ اپنے کام میں مشغول ہو گئے، اور مسلسل محنت و کوشش کے بعد ایک پُر از معلومات فہرست کی چند جلدیں انگریزی میں مرتب کیں جو اُنکی قابلیت کا خاص کارنامہ ہیں۔ یہ جلدیں حکومت کی طرف سے چھاپ کر شائع کر دی گئی ہیں، اور ارباب نظر و اہلِ بصیرت نے انکی خوبی کا اعتراف کیا ہے، کیونکہ ان کے مطالعہ سے حاجی صاحب کی محنت، تلاش اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

حاجی صاحب نے انگریزی کی باقاعدہ تعلیم کہیں حاصل نہیں کی تھی، صرف ندوہ ہی میں تھوڑی سی انگریزی پڑھی تھی، لیکن اپنی ذہانت اور مسلسل محنت و مطالعہ سے اچھی قابلیت بہم پہونچائی تھی۔

چند سال بعد پٹنہ کی یہ جگہ تخفیف میں آ گئی۔ اس فرصت میں حاجی صاحب ایک ضروری کام سے دو چار روز کے لئے علی گڈھ بھی تشریف لائے، ایک مدت بعد ان کی یہ چند روزہ صحبت نعمت غیر مترقبہ معلوم ہوئی۔

پٹنہ لائبریری سے جدا ہونیکے بعد حاجی صاحب نے دائرۃ المعارف حیدر آباد میں ہندوستان

کے قدیم تاریخی مقامات کا ایک جغرافیہ عربی زبان میں مرتب کیا جو شائع ہو چکا ہے، اسکے بعد کچھ مدت تک رامپور کے مشہور سرکاری کتاب خانہ میں کام کیا۔

ان تمام مراحل سے گذرنے کے بعد ۱۹۳۲ء میں حاجی صاحب کو پھر پٹنہ میں قیام کا موقع ملا، مدرسہ شمس الہدیٰ میں جو پٹنہ کی مشہور تعلیم گاہ ہے پرنسپل کا عہدہ خالی ہوا تو کمیٹی کے ارکان نے بلحاظ آپکی سابقہ علمی خدمات و قابلیت کے آپکو اس عہدہ پر معزز کیا۔ یہ آپکی آخری خدمت تھی جس پر آپ تادم واپسیں مامور رہے، اور حدیث کا درس دیتے رہے، یہاں تک کہ ۴ مئی کی صبح کو اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔

جس زمانے میں حاجی صاحب اورینٹل لائبریری پٹنہ میں کام کر رہے تھے مجھے بمعیت مولوی سید طفیل احمد صاحب علیگ، کلکتہ اور ڈھاکہ کے سفر کا اتفاق ہوا۔ واپسی پر زیادہ تر حاجی صاحب کی ملاقات کے لئے پٹنہ میں قیام کیا، حاجی صاحب نے جس اخلاص و بےحد مسرت کے ساتھ ہم لوگوں کا خیر مقدم کیا وہ آجتک یاد ہے، انھوں نے بڑے پیمانے پر ہم لوگوں کی دعوت کی، ندویوں کو جمع کیا، لوگوں سے تعارف کرایا۔ انکی ہر ادا سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس ملاقات سے کس قدر مسرور ہیں۔

آخری مرتبہ ۱۹۳۸ء میں حاجی صاحب سے ملاقات ہوئی، جبکہ پٹنہ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس تھا، اور اس سلسلہ میں مجھے بھی پٹنہ جانا پڑا، اس زمانے میں حاجی صاحب "شمس الہدیٰ" کالج میں پرنسپل تھے۔ جب میں اُن سے ملاقات کے لئے وہاں پہونچا تو جس گرمجوشی سے وہ پیش آئے اور جو مسرت بے پایاں انھیں حاصل ہوئی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے، وہی اخلاص تھا اور وہی بے تکلفی جو زمانہ طالبعلمی میں اُن کا شیوہ تھا، تھوڑی دیر کے لئے یہ محسوس ہونے لگا کہ ہم اُسی دور طالبعلمی میں واپس آگئے ہیں، جبکہ دنیا کے ہر قسم کے افکار و مصا

سے آزاد تھے، اور زندگی کی کشمکش سے ناآشنا۔

اس موقع پر بھی حاجی صاحب نے تمام برادران ندوہ کو جمع کیا، پُرتکلف دعوت دی، اور عہد ماضی کی داستانیں دُہرائیں، اس ملاقات سے دل۔ دماغ کو ایک عجیب طرح کی تازگی حاصل ہوئی۔

میری تحریک پر حاجی صاحب خود بھی اجلاس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اور دوسرے اساتذہ نیز طلبہ کو شرکت کی اجازت دی، یہ آخری ملاقات تھی جو اس عزیز ترین رفیق سے ہوئی ان کی وفات کے بعد سے میں برابر یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ایک ایسا جوہر گراں مایہ ضائع ہو گیا جس کا نعم البدل یا بدل اب کبھی نہیں مل سکتا، لیکن چارۂ کار کیا ہے۔

"شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن"

یادِ ایام

از جناب مولانا ضیاء الحسن صاحب ایم اے ندوی انسپکٹر مدارس عربیہ و رجسٹرار امتحانات شرقیہ الہ آباد

(۲)

الندوہ

دار العلوم کی تبلیغ اُسکے ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسوں اور انکی کارروائیوں تک محدود تھی اور اسمیں علاوہ وکلاء کی تحصیل کے کچھ چندہ بھی ہو جاتا تھا۔ سب سے پہلے علامہ نے چارج لینے سے قبل یہ کیا کہ ایک رسالہ "الندوہ" جاری کیا اسکے دو اڈیٹر قرار پائے۔ ایک تو خود علامہ، دوسرے ہمارے مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی۔ شروانی صاحب ملک میں مشہور ہو چکے تھے! ادبیات اور تاریخ انکی کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ انکو عنفوان شباب سے ندوہ کے ساتھ شغف تھا، اور اس پیرانہ سالی میں بھی وہی ایک حال بلکہ اس سے ڈبڑھکر آجتک باقی ہے۔ بہت کام کئے۔ اگرچہ دُور رہکر کئے۔ رؤسا کے طبقہ میں عالم اور شائق علم ہیں۔ کتب خانہ اور اسکے عجائبات کی فراہمی میں بہت کچھ دولت اور وقت صرف کیا۔ جب لکھنؤ تشریف لاتے تو اس تلاش میں چوک، نخاس، چوپٹیاں سب ایک کر ڈالتے، انکا گھر تحفہ جات کا ایک خزانہ ہے۔ قدر دان علم اور قدر شناس ہیں، خدا عمر دراز کرے اب ایسی ہستیاں کہاں ہیں! مگر دوسرے کھرے مولوی نہ تھے، انکی مصروفیت اپنی جائداد کے انتظامات میں کچھ غیر معمولی طریقہ پر اس زمانہ میں بڑھی ہوئی تھی اسکی طرح بچے بھی اس قابل نہ تھے کہ کچھ ہاتھ بٹاتے پھر لکھتے تو کچھ الندوہ کے قابل لکھتے۔ اسکے لئے وقت محنت تفحص اور نظر سب کچھ درکار تھیں، اسلئے گاہے ماہے لکھنے کی نوبت آتی۔ علامہ اکثر جز بز ہوتے، ایک مرتبہ تو لکھدیا کہ ان کو اپنے رئیسانہ مشاغل سے فرصت نہیں ملتی بعد کو اس لفظ پر ندامت ہوئی اور معافی چاہی۔ یہ انکی خاص خصوصیت تھی اپنی غلطی پر سخت انزجار

تھا تھا مگر علامہ کو علم کے سوا اور کام ہی کیا تھا۔ ان کو تو بہت کام تھے، خانگی امور کا سارا سر انجام ایک شاہانہ طبیعت کے بزرگ چچا کی اطاعت اور خدمت یہ کوئی معمولی کام نہیں ہوتا جو اسکو جو جانتے ہیں وہی جانتے ہیں۔ اسلئے الندوہ کا بوجھ بہت کچھ علامہ پر پڑتا، اس رسالہ کی اہمیت اس سے زیادہ کیا کہی جاسکتی ہے کہ اپنے زمانہ میں دنیا کا سب سے بڑا اسلامی مصنف اسکا اڈیٹر تھا۔

الندوہ نکلا، اگرچہ بڑے آب و تاب سے آجکل کے رسالوں کی طرح نہیں مگر بڑی آن بان کے ساتھ نکلا، ہر شخص کی نظر اٹھتی تھی شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد نے تو بے چین ہو کر اسکا اعتراف ان اشعار میں کیا ؎

يقولون ان العلم والفضل والنهى ۔۔۔ حبيس على المتقدم المتبصر

فلما تصفحنا صحائف ندوة ۔۔۔ وجدنا بان الفضل للمتاخر

تہذیب الاخلاق کچھ اور چیز تھا "معارف" چمکا، مگر جھلک دکھا کر ڈوب گیا لیکن الندوہ اسلامیات کا سب سے بڑا خدمتگذار ربع صدی ادھر ہو گذرا ہے۔ ہمارے اڈیٹر صاحب معارف خانسوں۔ انکو ایک تعریفنا نامول جوان کے حق میں پیشین گوئی ہو کر اترا۔ ایک دن شرر صاحب اور ہمارے علامہ بیٹھے تھے، دونوں نے اپنے اپنے پرواز پر اسلامی ادبیات کی خدمت کی تھی، میں نے عرض کیا کہ آپ لوگوں نے اتنا کر لیا ہے کہ ہمارے لئے کیا رکھا! علامہ نے فرمایا، ابھی ہوا کیا ہے، شرر صاحب جو ہمیشہ مبتدیوں کی ہمت افزائی کرتے تھے، بولے ہم نے تو داغ بیل ڈالی ہے، اب کیاریاں تم لوگ بھرنا۔" دراصل معارف کی خدمت ان دونوں بزرگوں کی یہی پیشین گوئی ہے۔

جوزف اڈیسن کے طرز تحریر کے متعلق ہمیشہ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ناقابل تقلید ہے، اور میری ناقص رائے میں ہر سچا مصنف اگر طبیعت میں زور ہو تو اپنی انشا آپ پیدا کر لیتا ہے، تقلید اس راہ میں رکاوٹ ہے۔ اس سے ذہنی اور قلمی گرفتگی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اگلے اردو انشا پردازوں میں سر سید اور نذیر احمد کو

چھوڑ کر علمی انشا پرداز آزاد حالی اور شبلی ہیں۔ آزاد کا طریقۂ تصنیف یہ کہ سادہ کاری پر نقش سمجھتے ہیں، نئی نیا مضمون لکھتے پھر اسکے کترنے کاٹ کاٹ کر ادھر کے چپے لگا لگا کر سارا صفحہ منبت کاری بنا دیتے لوگ ہمیشہ یہی سمجھتے رہے کہ عبارت میں آمد ہو معلوم تو ہوتی ہو مگر کسقدر پوشیدہ آورد کے بعد۔ حالی اپنا لکھا خود صاف کرتے اور صفائی کے وقت اسپر اصلاح دیتے جاتے۔ شبلی برجستہ لکھتے کہیں کہیں حاشیے پر گھٹاتے بڑھاتے طبیعتوں کا اختلاف تو دیکھو حالی صاحب کے مزاج میں جو سکون تھا وہ ان سے اپنا مسودہ صاف کرالیتا مگر علامہ کی طبیعت میں اضطراب تھا اسلئے مسودہ کسی منشی کے سپرد ہو جاتا۔

مجھے حیدرآباد سے لکھا تھا کہ تم کو مضمون نگاری کی تعلیم آکر دونگا، الندوہ کا تیسرا یا چوتھا نمبر تھا آکر مجھکو بلایا فرمایا اور المقتطف کا ایک مضمون حفظان صحت اور درازی عمر کے متعلق دیا کہ اسکا ترجمہ کر ڈالو میں نے صبح کو دوسرے روز ترجمہ پیش کیا۔ دیکھکر بہت خوش ہوئے، صرف ایک دو لفظ بدلے میں بدخط جیسا کا تھا۔ فرمایا منشی عارف الزماں کو صاف کرنیکو دیدو اسکو صاف کراکے الندوہ میں چھپوا دیا۔ میں نے سب سے پہلے اردوئے معلی میں اپنا ایک نیا مضمون "قدرت کی صناعیاں" جو نثری شاعری تھا لکھا تھا۔ وہ مضمون لوگوں نے بہت پسند کیا تھا، اسکے بعد تو جبتک لکھنؤ میں رہا الندوہ اور دیگر رسائل میں لکھتا رہا۔ علامہ مواد بتا دیتے، مگر اس تفحص میں میں اکثر دو چار قدم آگے بڑھ جاتا، فرماتے کہ تم مواد خوب نکال کر جمع کر لیتے ہو۔ ایک مرتبہ مقریزی دیکھتے دیکھتے اسطول یعنی بیڑہ جہازات پر نظر پڑ گئی فرمایا اسکا اقتباس کر ڈالو۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ خود از مقریزی لکھنا تو کچھ ٹھیک نہیں لاؤ اور جستجو کروں، کچھ تو مقدمہ ابن خلدون میں ملا، پھر خیال ہوا سواحل کی تاریخ پر نظر ڈالوں، تونس کی تاریخ المونس اٹھائی اسمیں اسقدر ملا کہ خاصہ ایک مضمون ہوگیا، اسکے بعد ایک رسالہ پڑھا، عربی میں اس مضمون پر مگر اسمیں اس سے کم مواد تھا اور اسکو ہمارے دوست نے اسی پر

ایک مستقل تصنیف کر ڈالی ہے۔

ایک مرتبہ مختصر تاریخ قرآن اور ان چار مصاحف کی تاریخ پر جو حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں مستند قرار دے کر اسلامی ممالک میں جاری کئے تھے، ایک مضمون لکھنے کا حکم دیا، وہ لکھ رہا تھا کہ ایک جگہ گاڑی رک گئی، نفح الطیب میں ایک صندوق کا اس قرآن کے لئے ذکر ہے جو کہ کانی سے کھلتا اور آپ سے آپ بند ہو جاتا، نفح الطیب کی مغلق عبارت کے سمجھنے میں پھنس گیا کتاب لئے ہوئے حاضر ہوا، ہنسنے لگے، فرمایا۔ میں تو میں بھی اٹکا تھا، پھر کہا مسلمان اور پیگانکس پر جو میرا مضمون رسائل شبلی میں ہے اس میں یہ ٹکڑا پورا موجود ہے مگر کس طرح سنو میں نے یہ ٹکڑا استاد صاحب کو دکھایا انکو زبان پر بڑی قدرت تھی انھوں نے اس کا ترجمہ کر دیا وہی صحیح ہے، اپنے الگ طرز تحریر کے مالک تھے۔ اُردو شعراء میں کون تھا جسکے کلام کا ذکر ہو اور ان کو کچھ نہ کچھ یاد نہ ہو، شاعروں میں غزل سنی اور باہر آکر سنادی، مگر اپنی زبان کو مستند کبھی نہ سمجھتے۔ ایک روز مجھے بڑی حیرت ہوئی، الفاروقؓ ان کو سب سے پیاری تھی، اسکا نیا ایڈیشن چھپا رہا تھا، کتاب دیکر مجھ سے فرمایا کہ منشی وارث علی صاحب کو دے آؤ میں نے اُن سے کہدیا ہے وہ اسکی زبان پر نظر کرلیں اور درست ضرور کر دیں۔ میں لے گیا تو انھوں نے کئی دن اسکو غور سے پڑھکر چند مقامات پر نشان بناکر واپس دیدی اور کہا کہ شبلی خود صاحب طرز بیان ہیں۔ علامہ نے وہ سب اصلاحیں منظور کرلیں، ساری عمر ایسے حلقہ میں بسر کی جہاں دلی ہی دلی تھی مگر لکھنؤ رہکر یہاں کی زبان کا چٹخارہ لینے لگے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے کہا بھی تو فرمایا یہ چاٹ پرانی ہے، علی گڈھ سے بہت پہلے کی۔ مزاحاً فرمانے کہ اگر مجھکو موقع ملتا تو میں دو شادیاں کرتا، ایک کسی ایرانی عورت سے جو فارسی بولتی اور ایک لکھنؤ کی کسی بیگم سے جسکی زبان سنتا انکی طبیعت میں لوچ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، اور دل اسقدر نرم تھا کہ بعض واقعات حیرت انگیز دیکھے۔ گرمیوں میں پنکھا نہ کھنچواتے، ایک مرتبہ کسی علالت کے موقع پر میں نے عرض کیا تو فرمایا کہ بھائی کسی دوسرے کا پنکھا کھینچنا اور غلامی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔

یہی وجہ ہو کہ ان کے خیالات میں سیاسی انقلاب ذہنی وجہات سے زیادہ قلبی نزاکتوں پر مبنی تھا۔ اس زمانہ میں لے دیکے مسلمانوں کی علمی اور نام نہاد سیاسی جماعت صرف ایجوکیشنل کانفرنس تھی، مگر میرٹھ کان کانگریس سے بھی آشنا تھے۔ ہمارے چچا سجاد حسین مرحوم مسلمانوں میں کانگریس کے بڑے حامی تھے اور سرسید اور ان کے حواریوں کے سخت مخالف، سنتا ہوں کہ جب ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں ہوا تھا اور اسکے صدر ان کے خود ایک بزرگ جناب منشی امتیاز علی صاحب مرحوم مغفور تھے تو بزرگی خوردی بالائے طاق رکھکر انھوں نے کانفرنس کے بھرے اجلاس میں سرسید کو خوب خوب سنائی تھیں، انکی صحبت میں کانگریس سے خوب واقفیت ہوگئی تھی، مگر اب مسلمانوں میں ایک کافی گروہ ایسا پیدا ہوگیا تھا جو کانفرنس کی عرضداشتوں سے گھبراکر مسلمانوں کی سیاسی تیاری اور حقوق طلبی کے لئے ایک علیحدہ جماعت چاہتا تھا۔ لکھنؤ میں امروہہ کے ایک بیرسٹر صاحب حامد علیخاں صاحب بہتوں کو یاد ہونگے، بڑے زندہ دل شاعر اور خوش مزاج قومی آدمی تھے اور حق کے پتلے، نواب وقار الملک مرحوم اس گروہ کے نقیب و ترجمان تھے چنانچہ خوب یاد ہو کہ لکھنؤ کی رفاہ عام بارہ دری میں زیر صدارت عم محترم خان بہادر منشی اطہر علی صاحب ایک جلسہ کرکے مسلم لیگ کی داغ بیل پڑی جس کا دفتر برسوں ہمارے یہاں کوٹھی جناب منشی احتشام علی صاحب میں قائم رہا۔ پھر تو لیگ، لیگ اُسوقت ہوئی جب بقول ہمدرد مرحوم آغا خاں لارڈ منٹو سے لیگ مانگ لائے۔ میرا اشارہ شملہ کے مسلم ڈپیوٹیشن کی طرف ہے۔

علامہ کے سیاسی خیالات میں انقلاب ہوچکا تھا، یہ تو محض غلط ہو کہ وہ ہندوؤں کے دوش بدوش چلکر کوئی کام کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کا سیاسی نسخہ لئے خیال ڈاکٹر سر اقبال مرحوم کے نکتۂ خیال سے کبھی نہیں متجاوز ہوا۔ دوسری قوم کی کوششیں دیکھکر متاثر ہوتے اور ان کو اپنے یہاں کرکے دکھنا چاہتے۔ گرکل دکھا تو سرائے میر میں مدرسۃ الاصلاح قائم کیا۔ ان کا خیال پہلے اپنے میں اہلیت پیدا کرنیکا

تھا۔ سرسید کی کوششوں کا نتیجہ ان کے نزدیک "نسیاً منسیاً فی غیر محلہ" ہوکر رہ گیا تھا اسی وجہ سے ان کو کوئی رغبت ایجوکیشنل کانفرنس سے نہیں باقی رہی تھی۔ نکتہ چینوں نے کہا کہ سرسید کے بنائے علی گڑھ اب سرسید کے خلاف ہو گئے۔ اسمیں جرم کیا تھا۔ کتنے سرسید کے پیدا کئے ان کے خلاف ہو چکے تھے وہ ایک تجربہ کو کامیاب نہ پاکر مسلمانوں کے لائحۂ عمل کو ضرور بدلنا چاہتے تھے کسی وقتی سیاسی ضرورت سے اتحاد عمل دوسری قوم کے ساتھ جیسا محمدؐ اور شوکت مرحومین نے کیا اور پھر تائب ہو گئے۔ اس سے زیادہ پسند نہ فرماتے۔ وہ کانگریسی کبھی نہیں ہوئے۔ بہر و دل میں کانگریس کی کوئی عظمت نہیں قائم ہوئی جب بنگال میں جوتیوں میں دال بٹی تو حقیقت آشکارا ہو گئی۔ غوغائیاں کسی غیر حربہ پاکر آتے دیکھ کر غل مچانے لگیں۔ لیگ حقوق طلبی کے بجائے اگر اصلاح قومی پر زور دیتی تو زیادہ کام کر چکتی۔ مگر اصلی خدمت قوم کی اس سے بھی نہ بن پڑی۔ میرے دل میں یہ خیالات ہمیشہ پختہ ہوتے گئے اور آج تک انھیں پر میں قائم ہوں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ کانگریس اور لیگ دونوں انیس ہیں۔

یقولون اقرالا و لا یعلمونہا اذا قیل لہم حققوا ام یحققوا

انکو سالانہ میلہ کرنے اور جوش دکھانے اتنے دن ہو گئے مگر پایا کیا چند کا غذی گھوڑے چلی عقدوں کی گرہ کشائی دونوں سے نہ بن پڑی اسکے ذمہ دار ہم میں فقدان اہلیت ہے۔ "ان الارض یرثہا عبادی الصالحون" حال کے تجربوں میں پڑ کر صلاحیت کا سر کھل گیا۔ جن باتوں پر دوسروں حرف گیری کی تھی اس سے زیادہ خود کر دکھائیں۔

نقد و نظر

نمونہ اردو انسائکلوپیڈیا مرتبہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

دنیا کی ہر زندہ زبان و ادب کے لئے انسائکلوپیڈیا کی جس قدر ضرورت ہے، اس کے اظہار کی ضرورت نہیں، دنیا کی اکثر زبانوں اور ہندوستان کی بعض بعض زبانوں میں عام اور فنی دائرۃ المعارف مرتب ہو چکے ہیں، اردو میں اہل علم اور اہل قلم کو عرصہ سے اردو انسائکلوپیڈیا کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، بعض ضمنی معلومات کے لئے بعض مرتبہ سیکڑوں صفحے پڑھنے پڑتے ہیں اور پھر بھی قابل وثوق معلومات حاصل نہیں ہوتے، لیکن یہ کام کسی ایک فرد کے بس کا نہ تھا، اسی لئے بعض لوگوں کو شروع کرنے کے بعد مجبوراً اس عظیم الشان کام سے دستبردار ہونا پڑا، یہ کام یا تو کوئی بہت بڑا ادارہ کر سکتا تھا جس کے پاس علمی اور مالی وسائل کی کمی نہو، یا کوئی حکومت، اردو کی خوش نصیبی ہے کہ اس کو یہ دونوں چیزیں یکجا حاصل ہو گئیں، اور حیدرآباد کے ادارۂ ادبیات اردو نے اس کام کا آغاز کر دیا، یہ ادارہ اپنے متعلق اشخاص، ایک بڑے علمی مرکز سے تعلق اور ایک اعلیٰ علم دوست اور اردو کی سرپرست ریاست کی امداد کی بنا پر ہر طرح اس مہتم بالشان کام کو انجام دینے کا اہل ہے۔

ادارہ نے اپنے کام کا ابتدائی نمونہ تنقید و مشورہ کے لئے بھیجا ہے، اس نمونہ کو دیکھنے سے اس کا اطمینان ہوتا ہے، کہ مرتبین کے سامنے ایسے دائرۃ المعارف کا جو اردو کے لئے موزوں اور اردو داں اصحاب کے لئے کافی ہو، صحیح تصور ہے اور وہ کام کو محنت اور دلچسپی سے کر رہے ہیں، بڑے سائز کے ۱۲ صفحوں میں، جن میں ہر صفحہ میں تین کالم ہیں، مختلف تاریخی، جغرافی، ادبی، طبی، فنی مضامین اور عام معلومات پر ۹۱ مضامین ہیں، جو مطالعہ اور تحقیق سے لکھے گئے ہیں، بعض مضامین بعض ایسے ماہرین کے قلم سے ہیں، جو اس موضوع پر لکھنے کا پورا حق رکھتے ہیں اور یہ ادارہ کی کامیابی ہے کہ

اس کو ان کا تعاون حاصل ہے مثلاً نظریہ اضافیت پر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا مضمون عربی زبان وادب کے شعبے میں کسی غیر مستشرق ہندوستانی عالم کا نمونا ایک کمی ہے اور منتظمین ادارہ کے وسعت خیال کے منافی ہے بعض جگہ ظاہر ہوتا ہے کہ مقالہ نگار اسلامی تمدن اور مسلمانوں کے تمدن کے درمیان فرق نہیں کرتا ہارون رشید اور بابر کی طرف اسلامی تمدن کی توسیع کی نسبت اسی غلط فہمی پر مبنی ہے (صلا کالم ۱) اسی طرح اکبر کو ایک نئے ہر دلعزیز تمدن کا بانی قرار دینا مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے محل بحث ہے (صتہ کالم ۲) لیکن یہ مسامحات جو زبان اور خیالات میں پیوست ہو چکی ہیں ایسی نہیں کہ ان سے اس اہم علمی کارنامہ کی عظمت میں کچھ فرق آئے۔

ادارہ کو اپنے موضوعات کی فہرست مرتب کرنے میں کافی دقت نظر اور وسعت نظر سے کام لینا پڑے گا اردو ادبیات میں (اپنے وسیع معنیٰ میں) بہت سے ایسے الفاظ اور اشخاص داخل ہو گئے ہیں جن کے متعلق اس کے انسائکلوپیڈیا میں ضرور معلومات ہونے چاہئیں، کوشش کرنی چاہئے کہ کوئی ایسا اہم موضوع نہ رہ جائے اور کوئی غیر اہم موضوع کتاب کے صفحات کو نہ گھیرے اس بارہ میں ادارہ کو مختلف موضوع اور ذوق رکھنے والے اصحاب کے امداد و مشورہ کی ضرورت ہے

ادارہ اس اہم علمی اور ادبی خدمت پر قابل مبارکباد ہے اور زبان سے محبت رکھنے والوں اور اس کی خدمت کرنے والوں کے لئے مسرت کا موقع ہے کہ اس کام کا موزوں ماحول اور معاون حالات میں آغاز ہو گیا ہے، خدا تکمیل کی توفیق عطا فرمائے ۔ ۔ ن

اس سلسلہ میں اس پتہ پر خط و کتابت کی جا سکتی ہے،

فیض محمد صاحب صدیقی و سید بادشاہ حسین صاحب، ادارہ ادبیات اردو

خیریت آباد، حیدر آباد دکن

معاشیات ہند | ترجمہ مولوی رشید احمد صاحب بی اے (علیگ) شائع کردہ دارالترجمہ حیدر آباد

کاغذ، کتابت، طباعت متوسط، صفحات ۱۸۴، قیمت درج نہیں۔

معاشیات ہند کے موضوع پر (JATHAR AND BERI) کی (INDIAN ECONOMICS) ایک بے نظیر تصنیف سمجھی جاتی ہے دارالترجمہ کی جانب سے اس کتاب کے ۱۹۳۷ء کے ایڈیشن کا ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ کتاب کی پانچویں اشاعت تھی اس کے بعد ملک کے معاشی حالات میں تغیر ہوا نومبر ۱۹۳۹ء میں چھٹا ایڈیشن شائع ہوا جدید اصلاحات کی روشنی میں تازہ ترین اعداد و شمار کی مدد سے تقریباً سارے مباحث پر نظر ثانی کی گئی لیکن موضوع کی تغیر پذیری کا یہ حال ہے کہ کتاب کے بازار میں آتے آتے بعض مباحث پھر نظر ثانی کے محتاج ہو گئے اور اب تو دو برس میں کتاب کی از سر نو اشاعت کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے کاش دارالترجمہ کی جانب سے کوئی ایسا انتظام ہو جاتا کہ اصل کتاب کی اشاعت کے چند ماہ بعد ہی اس کا ترجمہ شائع ہو جایا کرتا تاکہ اردو داں طبقہ بھی اپ ٹو ڈیٹ معلومات سے مستفید ہو سکتا بہر حال بحالت موجودہ یہ بھی غنیمت ہے کہ ۱۹۳۷ء ہی تک کی معلومات اردو خواں طبقہ کے سامنے آگئیں اب اس کے ساتھ اگر ۱۹۳۹ء کے ایڈیشن کو اور اس کے بعد کے تغیرات کو پیش نظر رکھ کر ایک ضمیمہ شائع کر دیا جائے تو یہ کمی پوری ہو جائے اور کتاب بالکل مکمل ہو جائے امید ہے کہ دارالترجمہ کے محترم ارکان اور ناظم صاحب سررشتہ تالیف و ترجمہ اس جانب خاص توجہ فرمائیں گے اس بارے میں ہمیں جناب مولوی محمد الیاس صاحب برنی سے خاص توقعات ہیں بہتر ہوتا کہ اس سلسلہ میں جناب مولوی صاحب اپنی کتاب معیشت الہند نظر ثانی کے بعد پھر سے شائع فرماتے۔ (ع ق)

حالات ندوہ

تعطیل گرما کے بعد حسب معمول پہلی جولائی کو دار العلوم کھل گیا مدرسین و طلبہ تقریباً سب آ گئے ہیں، تعلیم تیزی سے ہو رہی ہے مفتی محمد سعید صاحب ندوی البتہ ابھی تک نہیں آسکے تعطیل کے کچھ پہلے ہی وہ سخت علیل ہو گئے تھے تعطیل بھر علالت کا سلسلہ جاری رہا، اب بحمد اللہ مرض جا رہا ہے۔ لیکن ضعف کافی ہے، غالباً جولائی کے آخر تک کام شروع کر سکیں۔

ان صفحات کے قارئین کو معلوم ہے کہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ اور مولانا مسعود علی صاحب ندوی مدظلہ وقتاً فوقتاً دار العلوم تشریف لاتے رہتے ہیں تاکہ اپنے مفید اور مناسب مشوروں سے کارکنوں کی رہنمائی فرمائیں۔ چنانچہ ابکی وسط جون میں مولانا مسعود علی صاحب تشریف لائے تقریباً دو دن قیام رہا۔ آخری ہفتہ میں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے شرفیاب فرمایا۔

دار العلوم سے متعلق بعض تعمیری اور تنظیمی اصلاحات کا ذکر ان سطور میں ہوتا رہا ہے، اس مرتبہ تعطیل میں بھی اس قسم کے کچھ کام انجام پائے۔ دار العلوم اور دار الاقامہ کے درمیان سڑک ایک کچی تھی جس سے آنے جانے والوں کو خاصی تکلیف ہوتی تھی، برسات میں خصوصاً سخت پریشانی کا سامنا ہوتا تھا۔ ندوہ کے طلبہ اور متعلقین کو یہ سنکر مسرت ہوگی کہ اب یہ مصیبت دور ہوگئی اور سڑک پختہ ہوگئی دار العلوم کے مغربی جانب ایک خوشنما پارک کی داغ بیل پڑ رہی ہے، سامنے کا میدان بھی رفتہ رفتہ صاف کرایا جا رہا ہے، چھوٹے بچوں کے لئے ایک علحدہ دار الاقامہ کا نقشہ بن رہا ہے، اُمید ہے کہ جلد ہی تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا۔

مجلس شوریٰ کا ذکر وقتاً فوقتاً ان صفحات میں ہوتا آرہا ہے تعطیل بعد نیا انتخاب عمل میں آیا اور حسب ذیل اصحاب اس خدمت کے لئے منتخب ہوئے۔

نقیب عام۔	محمد اسحاق پشاوری
نقیب	عبدالغفار۔ عبدالحلیم
نقبائے تعلیم۔	رحید الرحمن محمد مصطفیٰ
نقبائے صلوٰۃ۔	مصلح الدین۔ محمد یوسف الہ آبادی
نقبائے صحت۔	سراج الحسن، محمد انور بری

---

۹ جولائی کو مجلس الدعوۃ الارشاد کے ماتحت ایک جلسہ منعقد ہوا جسمیں مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی نے ایک مؤثر سبق آموز، ولولہ آفریں اور ولولہ انگیز تقریر فرمائی جسمیں طلبائے دارالعلوم کو ان کے بلند مقصد زندگی کی طرف توجہ دلائی اور زمانہ کے اس انقلاب انگیز دور میں انھیں اُمت وسط بننے کی دعوت دی۔ آپنے فرمایا کہ آج کفر و الحاد اور شک و ارتیاب کے اس پُر شور دور میں پیغمبرانہ عزم ہمت سے کام لینے کی ضرورت ہے، تاکہ ظلمت کے سیاہ بادل چھنٹ جائیں اور حق کا اُجالا ایک بار پھر اس دنیا کو مطلع انوار بنا دے۔

ندوہ کی تبلیغی جد و جہد کا ذکر ہو چکا ہے اس سلسلہ میں ترجمہ قرآن مجید کا کام بھی شروع ہوا ہے ڈالی گنج میں شاہ عزالدین صاحب ندوی ہفتہ وار درس دیتے ہیں عنقریب دوسرے محلوں میں بھی یہ کام شروع ہونے والا ہے۔

قہر تبسم

(دوسرا ایڈیشن)

یعنی

ہندوستان کے مقبول ترین مزاح نگار ادیب اور سنجیدہ ظرافت میں صاحب طرز انشاپرداز

حضرت شوکت تھانوی

کے ان بائیس شاہکاروں کا مجموعہ جنمیں کا ہر مضمون مزاح لطیف کا ایک معیار تسلیم کیا گیا ہے۔ پہلا ایڈیشن ختم ہونے کے بعد مصنف کی نظر ثانی اور متعدد

جدید مضامین کے اضافہ کے ساتھ

جن سے مزاح نگار کے قلم کی شوخیوں میں ترقی اور مزاح کی شیرینی میں زمانہ کی تلخی چھپانے کا اندازہ نہایت آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔

قیمت مجلد دو روپیہ

صدیق بکڈپو لکھنؤ

پبلشر حامد علی ندوی پرنٹر بانکے لال ایکسپریس پریس لکھنؤ

[illegible]

[illegible] ندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتبہ

سید ابوالحسن علی ندوی

استاذ تفسیر و ادب

عبدالسلام قدوائی ندوی

استاذ تاریخ و اقتصادیات

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۲ رجب المرجب ۱۳۶۰ھ مطابق اگست سنہ ۱۹۴۱ عیسوی نمبر ۸

قیمت فی پرچہ تین آنے   سالانہ دو روپے

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر منیجر رسالہ الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہئے

شذرات

وائسرائے کی مجلس عاملہ میں توسیع کی اطلاع عام طور سے اخبارات میں شائع ہو چکی ہے، اس جدید توسیع شدہ مجلس کے ایک رکن سر اکبر حیدری صدر اعظم ریاست حیدرآباد بھی مقرر ہوئے ہیں، اس نئے تقرر کی وجہ سے ریاست میں جو منصب خالی ہوا ہے اس کے لئے نواب سر احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری کا تقرر عمل میں آیا ہے، ستمبر میں موصوف اپنے عہدہ کا چارج لے لیں گے اور باضابطہ کام شروع کر دیں گے۔ نواب صاحب کے تجربہ اور صلاحیت کے متعلق کسی تعارف کی ضرورت نہیں، موصوف صوبجات متحدہ اور حکومت ہند کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہ چکے ہیں، برسہا برس صوبجات متحدہ میں ہوم ممبری کے فرائض انجام دئے، کچھ عرصہ تک وائسرائے کی مجلس عاملہ کے ممبر رہے، کئی بار گورنری کے لئے انتخاب ہوا اور بعضوں خوش اسلوبی سے یہ خدمت انجام دی، ۱۹۳۵ء کے دستور کے مطابق جب صوبوں میں نئی اصلاحات رائج ہوئیں تو سب سے پہلی وزارت آپ ہی نے مرتب کی اور اس دشوار عبوری دور میں نہایت قابلیت سے اپنے فرائض انجام دئے، اس عرصہ میں صوبہ کی ترقی اور یہاں کے باشندوں کی فلاح و بہبود کے لئے جو کام ہوئے ان کی تفصیل اس سرکاری بیان میں آج بھی ملاحظہ کی جا سکتی ہے، جو آپ نے وزارت سے علیحدگی کے وقت اپنے کابینہ کی جانب سے شائع کیا تھا۔

دنیاوی عزت و وجاہت کے ساتھ نواب صاحب کی ذات اپنی سادگی، وضعداری، مشرقی تہذیب اور اسلامی اخلاق کے اعتبار سے بہت ممتاز ہے، حکومت کے بلند مناصب کے باوجود انکی اس وضعداری میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا، ندوہ اور اسکے کارکنوں سے موصوف کا دیرینہ تعلق ہے، مسجد کی تعمیر میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا، ابھی حال میں نظام اسلامی کی ترتیب و تدوین کی غرض سے جو کمیٹی مقرر ہوئی ہے وہ تمام تر آپکی کوششوں کی رہین منت ہے، ہم آپکے اس تازہ تقرر کو ایک فال نیک سمجھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آپ کی صدارت عظمیٰ سے حیدرآباد میں ایک نئے شاندار دور کا آغاز ہوگا۔

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رفقاء پچھلی مرتبہ لاہور تشریف لے گئے تھے تو آپ نے وہاں بعض حضرات کو ندوہ کی مشکلات کی جانب توجہ دلائی تھی جون میں مولوی حافظ جلیل صاحب ندوی ناظم معین الندوہ لاہور تشریف لے گئے تاکہ اس کام کو اور آگے بڑھائیں اس سفر کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب میں بھی معین الندوہ کی شاخ قائم ہو گئی جناب مولوی محمود علی صاحب بار ایٹ لا اس کے صدر خواجہ عبدالوحید صاحب سکریٹری اسلامک انسٹیٹیوٹ اس کے ناظم مولوی محمد حنیف صاحب ندوی اس کے خازن اور صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور جناب عبداللہ خاں صاحب بٹ بی اے حکیم عبدالمجید صاحب چغتائی اور شیخ محمد العربی پروفیسر اورینٹل کالج لاہور اس کے ارکان منتخب ہوئے ہیں ہمیں امید ہے کہ اس مجلس کا حلقہ اثر ابھی اور بڑھے گا اور یہ مسلمانان پنجاب اور دارالعلوم ندوہ کے درمیان خاص رابطہ تعلق کا باعث ہوگی اس سلسلہ میں احسان ناشناسی ہوگی اگر جناب سر شیخ عبدالقادر صاحب اور جناب نواب مظفر خان صاحب کی نوازشوں اور کرم فرمائیوں کا اعتراف نہ کیا جائے ناظم صاحب معین الندوہ کی کامیابی بڑی حد تک آپ ہی حضرات کی توجہات کی رہین منت ہے ہمیں امید ہے کہ کرم فرمائیوں کا یہ سلسلہ آئندہ بھی اسی طرح جاری رہے گا۔

ناظم صاحب معین الندوہ کے اس دورہ کے علاوہ مولوی مظفر حسین شاہ ندوی نے بھی مخلصانہ کام کیا تعطیل کے زمانہ میں ریاست پونچھ و کشمیر کے متعدد مقامات کا دورہ کیا اور وہاں کے ممتاز و سربرآوردہ احباب کو ندوہ کی جانب توجہ دلائی ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ندوہ کے ہمدردوں کا ایک اچھا خاصہ حلقہ پیدا ہو گیا ہے اس بارہ میں ہم جناب خواجہ غلام السیدین صاحب ڈائرکٹر تعلیمات ریاست جموں و کشمیر اور جناب خان بہادر عبدالقیوم خاں صاحب ناظم اعلیٰ ریاست پونچھ کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ندوہ کی جانب خصوصی توجہ فرمائی اور نقد امداد و اعانت کا یقین دلایا ہمیں امید ہے کہ آپ حضرات کی عنایت و ہمدردی کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رہیگا اور آپکی توجہ سے ندوہ کو بیش از بیش فوائد حاصل ہوتے رہیں گے اس سلسلہ میں ہم جناب پیر محمد کبیر شاہ ناظم تعلیم اسلامیہ جناب شیخ نبی بخش صاحب نظامی مدیر المجاہد و ناظم عام انجمن اسلامیہ پونچھ اور جناب ڈاکٹر محمد حیات خان صاحب میڈیکل آفیسر انچارج باغ اسپتال کے بھی شکرگذار ہیں کہ انھوں نے اس جد و جہد میں مولوی مظفر حسین صاحب کو کافی مدد دی جس کا سلسلہ امید ہے کہ آئندہ بھی جاری رہیگا۔

میری محسن کتابیں

(از جناب پروفیسر نواب علی صاحب ایم، اے، سابق وزیر تعلیم ریاست جوناگڈھ)

ایک وقت تھا جب علامہ شبلی مرحوم کے الندوہ میں مضامین لکھا کرتا تھا۔ مولانا تو اب فردوس نشین ہیں، لیکن الندوہ فیض سلیمانی سے مرکر جی اٹھا ہو۔ البتہ میری حالت یہ ہے -

"اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند"

پھر بھی عزیزی ابو الحسن علی کا اصرار ہوا اور مجھے خاطر عزیز منظور ہو اسلئے یہ چند سطریں تحریر ہیں۔

(۱)

بچپن میں جب سے مکتب میں بٹھایا گیا اُسوقت سے ابتک جبکہ عمر رواں کے ۶۴ مرحلے طے کر چکا ہوں طالبعلم ہوں، لیکن واقعہ یہ ہو کہ "معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد"

خیر، اگرچہ فلسفیانہ رنگ میں کچھ معلوم نہ ہو سکا لیکن میری دُعا یہی رہی اور رہیگی "رب زدنی علماً"

میرے والد ماجد میر فرزند علی صاحب قبلہ وکیل مرحوم تہجد گذار تھے اور نماز فجر کے بعد تلاوت کلام اللہ کے عادی تھے۔ میری عمر قریب گیارہ برس کے تھی، جب وہ آخر مرتبہ حیدرآباد تشریف لیگئے، چلتے وقت کلام مجید کا ایک نسخہ دیا جو ۱۲۷۰ھ کا چھپا ہوا تھا، مطبع نظامی کی مہر تصیح لگی ہوئی، متن کے ساتھ شاہ عبدالقادر دہلوی کا ترجمہ اردو۔ یہ نسخہ اُسوقت شائع ہوا تھا جب سنا ہو کہ مطبع میں کام کرنیوالے باوضو اور احتیاط سے کلام مجید چھاپتے تھے۔ جناب قبلہ نے نسخہ دیکر فرمایا کہ روزانہ تلاوت کرتے رہنا اور ترجمہ بھی پڑھا کرنا، کچھ عرصہ تک میں محض تعمیل ارشاد کرتا رہا، لیکن پھر شوق پیدا ہو گیا، اور ابتک شاید ہی کسی دن تلاوت میں ناغہ ہوا ہو۔ نسخہ اگرچہ اب بہت بوسیدہ ہو گیا ہو اور باوجودیکہ عمدہ چھپے ہوئے نسخوں کی اب کمی نہیں ہے لیکن اسی کہنہ نسخے کو سینے سے لگائے رہتا ہوں، اسکے صفحوں پر کہیں کہیں کچھ مٹے ہوئے دھبے بھی

نظر آتے ہیں جو اس عمر رفتہ کی یادگار ہیں جب قلب میں اسقدر قساوت نہ تھی۔ میری زندگی میں گو ناگوں انقلاب ہوئے متعلم سے معلم بنا اور مصنف کی حیثیت سے نشانۂ ملامت بھی، لیکن خواہ کوئی مانے یا نہ مانے میرا تو یہی یقین ہے کہ۔

"ہرچہ کردم ہمہ از دولتِ قرآں کردم"

میری پہلی محسن کتاب کتاب اللہ ہے اسی سے مجھے ہدایت نصیب ہوئی! وہ یہی دونوں جہان میں میرے لئے نورٌ علیٰ نور ہے۔

(۲)

میری تعلیم مکتب سے شروع ہوئی اور تھوڑے عرصہ کے بعد انگریزی اسکول اُناؤ میں داخل کردیا گیا، لیکن مدرسہ کے ساتھ مکتب کی پرانی تعلیم ساتھ ساتھ چودہ برس کی عمر تک جاری رہی۔

اسکول میں مولوی ظہور احمدؒ صاحب لاہر پوری مرحوم فارسی کے پروفیسر تھے جو متقی اور پرہیزگار اور امام حجۃ الاسلام غزالیؒ کی تعلیمات کے شیدا، فارسی کورس پڑھاتے وقت اکثر امام موصوفؒ کا تذکرہ فرماتے تھے! اور جب میں اُن کی خدمت میں مکان پر حاضر ہوتا تھا تو امام صاحب کے حالات زندگی مؤثر پیرایہ میں بیان فرماتے تھے! اسکا اثر یہ ہوا کہ میں امام صاحب کی تصانیف کا ایسا گرویدہ ہوگیا کہ جب ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج لکھنؤ میں پڑھنے گیا تو امام صاحب کی کوئی نہ کوئی تصنیف سفر و حضر میں اپنے ہمراہ رکھتا تھا۔ کیمیائے سعادت، احیاء العلوم اور المنقذ من الضلال نے مجھ پر خاص اثر کیا، بعد کو اگرچہ میں نے ملحدوں اور دہریوں کی تصانیف اور مختلف مذاہب کی مشہور کتابوں کا مطالعہ کیا لیکن ہمیشہ "توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین" کی دُعا دل سے نکلتی رہی۔ میرا اب تک یہ معمول ہے کہ ۱۴ جمادی الثانی کو جو امام صاحب کے وصال کا دن ہے صبح سے احیاء العلوم یا کیمیائے سعادت یا منہاج العابدین کا کوئی جزو پڑھتا ہوں اور امام صاحب کی حیاتِ طیبہ پر غور کرتا ہوں پھر بعد عصر فاتحہ پڑھکر ایصال ثواب کرتا ہوں۔

لکھنؤ کے قیام میں مولانا شرر مرحوم کے دلگداز اور دیگر مضامین و تصانیف کے مطالعہ نے اردو ادب کا شوق پیدا کر دیا۔ شعر و سخن کا ذوق بھی انیس، آتش، غالب اور حالی کے کلام سے پیدا ہوا۔ اسلامی فرقوں کے باہمی مناظرے کی کتابیں اگرچہ اس زمانہ میں بہت دیکھیں، لیکن جنگ عقائد و بحث بجائے سکون قلب کے الجھن پیدا کرتی تھی۔ البتہ کتب تصوف اور ملفوظات بزرگان دین میں ایک دلکشی پاتا تھا۔ شیخ عطارؒ کی تذکرۃ الاولیا، عارف رومؒ کی مثنوی، اور فتوح الغیب حضرت غوث الاعظمؒ اکثر پڑھا کرتا تھا۔

(۳)

سنہ ۱۹۰۰ء میں جب علی گڈھ گیا تو یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ اگرچہ سرسید مرحوم کا نام بچہ بچہ کی زبان پر تھا لیکن ان کی مذہبی تصانیف خاصکر تفسیر القرآن کا کوئی بھولے سے بھی نام نہیں لیتا تھا۔ لکھنؤ کے قیام میں سرسید کی مذہبی تصانیف خصوصاً تفسیر نیچریت کی تعلیم سنا کرتا تھا، لیکن علی گڈھ میں دل نے کہا کہ مخالفین اسلام کی کتابیں تو پڑھتے ہو، کیا وہ درد دل رکھنے والا سید انسے بھی بدتر ہے۔ اب میں نے خطبات احمدیہ، تفسیر القرآن، اور دیگر تصانیف کا بالاستیعاب مطالعہ شروع کیا۔ سورۂ انفال کی تفسیر میں جہاں سرسید نے جملہ غزوات ایک جا جمع کرکے لکھے ہیں مجھے بہت پسند آئے، خصوصاً غزوۂ بدر میں جو محققانہ بحث ہے، مجھ پر سرسید مرحوم کے خلوص، تلاش حق اور محبت اسلام کا ایک خاص اثر ہوا۔ اگرچہ بعض مقامات پر جہاں علوم جدیدہ سے مرعوبیت ٹپکتی تھی، میں انکی رائے سے متفق نہ تھا اور سلف صالحین کا متبع تھا۔ افسوس ہے کہ سرسید کی مذہبی خدمات کی قدر نہ کی گئی۔ کاش علیگ بھی ندویوں کی طرح کچھ کرتے اور مسلم یونیورسٹی دار المصنفین کی طرح کوئی دینی کارنامہ پیش کرتی۔ میں یہاں کسی جماعت کو گرانا یا بڑھانا نہیں چاہتا، صرف دلی دردمند کا اظہار خیال ہے۔ خدا کرے ادھر بھی توجہ ہو۔

سرسید کی تصانیف کے ساتھ میں نے جسٹس امیر علی مرحوم کی اسپرٹ آف اسلام اور ہسٹری آف دی سراسینز اور آرنلڈ کی پریچنگ آف اسلام کا بھی غور سے مطالعہ کیا اور علامہ شبلی مرحوم کی الکلام، الغزالی اور رسائل سے مستفید ہوا۔ اب مجھ میں تاریخ و سیر کا شوق پیدا ہوا۔ اور کچھ خدمت دین بجالانے کے لئے تیار ہوا۔

۱۹۰۸ء میں جب میرا تقرر بڑودہ کالج میں ہو گیا تو سب سے پہلے آنحضرت صلعم کی سیرت پاک پر دس مضامین سیرۃ المصطفیٰ کے نام سے لکھنا شروع کئے۔ اُس زمانہ میں مولانا شبلی بڑودہ تشریف لےگئے اور جسٹس عباس طیب جی مرحوم کے بنگلہ پر پہلی ملاقات ہوئی۔ مولانا کی تصانیف نے مجھے پہلے ہی گرویدہ کر چکی تھیں، اب ان کے حسن اخلاق، لطف تقریر، ذوق سخن اور تبحر علمی نے اور بھی گرویدہ کر لیا۔ خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تعطیلوں میں جب بھوپال جاتا تھا تو منشی منصب علی صاحب کے مکان پر مولانا سے اکثر شرف ملاقات حاصل ہوتا تھا۔

تذکرۃ المصطفیٰ سنہ ۱۹۱۴ء میں شائع ہو گئی تو مولانا کا یہ ناقدانہ فقرہ کہ "کتاب پرانے رنگ میں اچھی ہو مگر ایک نئے تعلیم پائے ہوئے سے کچھ اور ہی امید ہو" تازیانہ کا کام کر گیا۔ اور میں نے فلسفہ اور سائنس کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا خصوصاً اسپنسر، ڈارون، ہکسلے، ہیگل، الیور لاج ولیس، ہالڈ ینگ اور برگسن کی تصانیف پر غور کرتا رہا، پھر معارج الدین کا حصہ اول شائع کیا، مگر افسوس مولانا اسی سال رحلت فرما چکے تھے۔

اس اثناء میں ہز ہائنس مہاراجہ صاحب گائکواڑ نے علم موازنۂ مذاہب کی ایک شاخ ہندوستان میں سب سے پہلے بڑودہ کالج میں کھول دی اور اسکے ناظم پروفیسر وجری جو فرانس اور جرمنی میں الٰہیات کی تکمیل کر چکے تھے اور ہیسٹنگز کی انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن کے مضمون نگار تھے مقرر ہوئے۔ پروفیسر موصوف سے بہت جلد بے تکلفی ہو گئی، وہ علم موازنۂ مذاہب پر ایک کتاب

لکھ رہے تھے اور میں نے تاریخ صحف سماوی لکھنا شروع کی تھی! ور مہاراجہ صاحب نے ایک کافی رقم فراہمی کتب کے لئے عطا فرمائی تھی۔ ودجری صاحب نے کتب یہود و نصاریٰ کے معتبر ماخذ میرے لئے جمع کر دیئے اور میں نے تفسیر حدیث رجال تاریخ اور سیر کی اسلامی مستند کتابیں فراہم کریں۔ اور ان سے مستفید ہونے لگا اور ودجری صاحب کو اسلام کے متعلق نوٹس لکھوانے لگا۔ تاریخ صحف کے خاتمے پر میں نے ان ماخذوں کی ایک فہرست دیدی ہے لیکن چونکہ یہ کتاب جو ۱۹۱۹ء میں چھپی تھی اب کمیاب ہے اسلئے چند کتابوں کے نام جن سے خاص طور سے مستفید ہوا ہوں ذیل میں درج کرتا ہوں۔

(۱) وریدم ریغزنس بائبل (۲) ابوکریفہ جس کا ترجمہ انگریزی میں چارلس نے ۱۹۱۲ء میں کیا۔ (۳) جیوئش انسائیکلوپیڈیا (۴) وسٹ کاٹ کا ہشارک فیتھ (۵) گرانز ہسٹری آف دی جیوز (۶) نانن ہوڈان کی کیس آف نیو ٹسٹامنٹ (۷) ڈالمر کی ونٹرو پولوجی۔

تفاسیر میں اگرچہ کسی واقعہ کو تفسیر کبیر خازن ابن کثیر بیضاوی وغیرہ میں ایک ساتھ دیکھتا تھا لیکن تفسیر ابن جریر خاص طور سے پیش نظر رہتی تھی جسمیں موافق اور مخالف سب روائتیں کسی واقعہ کے متعلق جمع ہوتی تھیں انکو میں طبقات ابن سعد اصابہ اور میزان الاعتدال کی کتب رجال سے جانچ کر کے کوئی رائے قائم کرتا تھا تفسیر صافی اور مجمع البیان بھی پیش نظر تھیں اور صحیحین کے ساتھ کافی بھی دیکھتا تھا آجکل کی افسوسناک فضا میں میری پرنم آنکھوں کے سامنے وہ وقت پھر تا ہے جب علمائے فرنگی محل اور مجتہدین دونوں ایک دوسرے سے علم حاصل کرتے تھے۔

میں نے اپنی محسن کتابوں کے چند نام تحریر کر دیئے۔ اصل احسان مصنفین کا ہے انھیں کا رہین منت ہوں اور انکے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں باستثنائے ایک مصنف کے جو عالم الغیب حکیم و علیم ہے اور جس کی بارگاہ قدس میں سر نیاز جھکا کر یوں عرض کرتا ہوں رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا۔

رسالت

بسلسلۂ مضامین قرآن

از
ابوالحسن علی ندوی

فطرت انسانی کے سوالات

انسان کی فطرت کے کچھ سوالات ہیں جو رہ رہ کر اسکی گہرائیوں سے اٹھتے ہیں، ان سوالات کو نہ حیلوں بہانوں سے ٹالا جا سکتا ہے، نہ ان کے جواب سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے، اس عالم کو کون چلا رہا ہے، اس کے کیا صفات ہیں، اس کا ہم سے اور ہمارا اس سے کیا تعلق ہے، اس کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند؟ اور یہ کہ اس زندگی کا انجام اور اس عالم کا منتہا کیا ہے؟!

یہ وہ سوالات ہیں جو بالکل طبعی اور قدرتی ہیں، اور انسان کی فطرت سلیم کو پورا حق ہے کہ وہ انسان سے پوچھے کہ وہ جس دنیا میں بستا ہے اس کو کس نے بنایا اور کون اس کو چلا رہا ہے، جب تک اس کو اس کے صفات نہ معلوم ہوں، اس کو اس سے کوئی قلبی لگاؤ اور ذہنی تعلق نہیں پیدا ہو سکتا، دنیا کا بھی یہی حال ہے کہ جبتک کسی شخص کی سیرت اور اخلاق و صفات سے ہمیں واقفیت نہیں ہوتی، ہمیں محض اس کے نام سے تعلق پیدا نہیں ہوتا، پھر اگر ہم خالق کائنات کے متعلق اس کے سوا کہ وہ موجود ہے کچھ نہ جانتے ہوں، اس کی ربوبیت و رحمت، قدرت و اختیار، علم و اطلاع، محبت و رافت، اور اس کے جلال و جمال کی دوسری صفات، اس کا ہم سے قریب ترین تعلق، اور ہماری اس کی طرف شدید ترین احتیاج اور اس کے سہارے ہمارے قیام و بقا کا حال معلوم نہو، اس سے ہمیں وہ تعلق پیدا نہیں ہو سکتا جو ایسی ذات سے پیدا ہونا چاہئے،

اسی طرح وہ اپنے اس سوال میں بالکل حق بجانب ہے کہ زمین کی اس مملکت میں بسنے والوں سے صاحب مملکت کے کیا مطالبات ہیں، اس لئے کہ کسی کی سلطنت میں رہنے والوں کا پہلا فرض ہے کہ اس کا نظام و

قانون معلوم کریں۔

اسی طرح سے یہ بھی بالکل بدیہی امر ہے کہ وہ اس زندگی کے متعلق جاننا چاہے کہ اس کا آخر کیا ہے اور اس کے بعد کیا ہونا ہے؟ اس لئے کہ اس سوال کا تعلق نہ صرف اس کے مستقبل سے ہے بلکہ اسکے حال سے بھی ہے، جس شخص کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی بھی ہے جس میں پہلی زندگی کا حساب کتاب ہوگا، اور اس پہلی زندگی کے اعمال کے مطابق اس کو جزا و سزا ملے گی، اس شخص کا طرز عمل موجودہ زندگی میں اس شخص سے بالکل مختلف ہوگا جو موجودہ زندگی کے علاوہ کسی دوسری زندگی کا کوئی تصور نہیں رکھتا، اس لئے یہ سوال اس کی اس زندگی میں بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور اس کے جواب میں تاخیر کی گنجائش نہیں کیونکہ اس مسئلہ کو طے کئے بغیر اس زندگی کی صحیح تشکیل نہیں ہو سکتی!

ہماری زندگی کے بنیادی سوالات ہیں جن پر نجات و سعادت کا دارومدار اور ہماری قسمت کا فیصلہ موقوف ہے، جن کے جواب میں ذرا سی غلطی یا لغزش ہماری ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے، یہ زندگی ہم کو صرف ایک مرتبہ کے لئے ملی ہے، اور یہ ہماری بہت قیمتی متاع ہے وہ محض قیاس و تخمین، اور آزمائش و تجربہ میں گذاری نہیں جا سکتی،

ان سوالات کے علاوہ کچھ سوالات اور بھی ہیں، جن کا تعلق بھی ہماری روزمرہ زندگی سے ہے، ہمارے گرد و پیش کائنات کی جو طویل و عریض بساط پھیلی ہوئی ہے اس میں ہمارا اصل محل و مقام کیا ہے؟ ہمارا اپنے گرد و پیش کی دنیا سے اور اس کا ہم سے کیا تعلق ہے، ہماری اس ہنگامہ ہستی میں حیثیت اور مقصد کیا ہے؟ ہم تحت ہیں یا خود مختار، ذمہ دار ہیں یا غیر ذمہ دار، اگر ذمہ دار ہیں تو کس کے سامنے اور ہماری ذمہ داری کس حد تک ہے؟ ہماری قوتیں اور صلاحیتیں ہماری اپنی ہیں یا کسی دوسرے کی ملک، انکا طریق استعمال کیا ہے اس زندگی کا کمال مطلوب اور منتہائے نظر کیا ہے، یہ اور ایسے متعدد سوالات ہیں، جو ہمارے لئے فوری طور پر حل طلب ہیں، اور زندگی کے مرکزی سوالات ہیں،

سوالات کے جواب کی دو ہی راہیں

ان سوالات کے جواب کی دو ہی راہیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ ان کا جواب ہم اپنے ذاتی علم و فہم اور غور و فکر کی بنا پر خود دیں، لیکن اس طریقہ سے ہم زیادہ سے زیادہ جس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں وہ یہ ہوگا کہ اس عالم کا کوئی ضرور بنانے والا ہے، لیکن اس کے صفات کیا ہیں؟ اس کا جواب ہم اپنے ذاتی تفکر کی بنا پر نہیں دے سکتے، ہمارا دماغ اپنی انتہائی بلند پروازیوں میں بھی قیاس کے حدود سے آگے نہیں بڑھ سکتا، لیکن اس معاملہ میں قیاس کی گنجایش نہیں، کہ خالق و مخلوق کے درمیان کوئی مشابہت نہیں ہے۔

اس کے بعد دوسرا مشکل سوال اس کا تعین ہے کہ وہ ہم سے کیا چاہتا ہے، کیا اس کو پسند ہے اور کیا ناپسند ہم دیکھتے ہیں کہ دوستوں اور عزیزوں اور خاص رفیقوں کی خوشی، پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے بارہ میں بھی قیاس مشکل ہے، اور اس میں بعض مرتبہ بڑی بڑی غلطیاں ہو جاتی ہیں، پھر ایک نادیدہ ذات اور وراء الوراء ہستی کی مرضیات و نامرضیات کی یقینی تعیین محض قیاس سے کس طرح ممکن ہے،

پھر اس علم و فہم اور غور و فکر کا نتیجہ ایک نہیں ہے، نتیجہ میں سخت اختلاف و تعارض ہے،

کسی نے اپنے غور و فکر کی بنا پر یہ نتیجہ نکالا ہے، کہ یہ کارخانہ بغیر کسی بنانے والے کے بن گیا اور بغیر کسی چلانے والے کے چل رہا ہے، اور خود ہی ختم ہو جائے گا،

کسی کے نزدیک اس کا اگر کوئی صانع ہے تو اس کا اب اپنی مصنوعات سے کوئی تعلق نہیں رہا، کسی کے نزدیک اس کا صانع ہی اس کا حقیقی مالک ہے، مگر اب وہ دوسروں کے حق میں اپنے مالکانہ حقوق سے دستبردار ہو گیا ہے، اور اصلی مملکت میں وہ بادشاہی کر رہے ہیں،

کسی نے اس دنیا کی ہر چیز کو جس نے اس کو بظاہر نفع و ضرر پہونچایا ہے یا پہونچ سکتا ہے اپنا اِلٰہ بنایا اور ہر صاحب طاقت کو اپنا حاکم بنا لیا، اور اس کے ظاہری حواس، روزمرہ کے تجربات اور عقل و فہم نے اس کو اسی نتیجہ پر پہونچایا۔

کسی کے نزدیک انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے جو کچھ ضرورتیں رکھتا ہے اور کچھ خواہشیں وہ آزاد

خود مختار ہے اور قطعاً غیر مسئول اس کی طاقت غیر مقید اور اس کا اختیار غیر محدود ہے، اس کے قانون کا نہ کوئی الٰہی ماخذ ہے نہ اس کے علم کا کوئی غیبی سرچشمہ، دنیا ایک ہنگامہ کارزار ہے جس میں اصل قانون طاقت ہے، اخلاق، نیکی، بدی، شر، حسن و قبح۔ یہ سب بے معنی الفاظ ہیں[1]

خدا کی ہستی کو تسلیم کرنے کے بعد اس کے صفات کے بارہ میں حکما اور فلاسفہ نے جو جو قیاس آرائیاں اور موشگافیاں کی ہیں اور جس طرح انھوں نے اس کی طرف ان نقائص کی نسبت کی ہے جن کی نسبت وہ خود اپنی طرف پسند نہیں کرتے، وہ انسانی عقل کے عجائبات میں سے ہے[2]

جواب کی دوسری راہ یہ ہے کہ ہم اس بارہ میں کسی دوسری جماعت پر اعتماد کریں لیکن سوال یہ ہے کہ وہ جماعت کونسی ہو؟ اگر وہ حکما کی جماعت ہو تو پوچھا جا سکتا ہے کہ ان مسائل میں ان کو ہمارے مقابلہ میں کونسا امتیاز حاصل ہے اور ان مابعد الطبیعاتی مسائل کے حل کے لئے ان کے پاس کون سے علمی ذرائع ہیں؟ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان مسائل میں نہ حواس کام کرتے ہیں نہ عقل کا کچھ دخل ہے، ان کو اس علم کے مبادی بھی حاصل نہیں پھر ان کو اس بارہ میں ہماری رہنمائی کا کیا حق ہے؟ اور ہم آخر کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں[3] ان سے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے

هَا أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ فِيمَا لَكُم بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ	تم نے ان مسائل میں بحث کی جن کا تم کو تھوڑا بہت علم
تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ وَاللَّهُ يَعْلَمُ	تھا اب ایسے مسائل میں کیوں بحث کرتے ہو جن کا تم کو کچھ بھی
وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۔ (آل عمران)	علم نہیں، اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

اب صرف یہی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ان مسائل میں ہم کچھ ایسے انسانوں پر اعتماد کریں جن کا علم

[1] یہ سب اقوال و عقائد جاہلیت اولیٰ جاہلیت وسطیٰ اور جاہلیت جدیدہ کے عقلا اور فلاسفہ کے ہیں، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں، کتب فلسفہ و مابعد الطبیعیات

[2] ملاحظہ ہوں اقوال حکماء یونان، و ابن سینا و ابن رشد،

[3] ملاحظہ ہو بحث "غیب" مضمون "قرآن سے استفادہ کے شرائط اور اس کے موانع"،

اس بارہ میں قیاسی نہو بلکہ یقینی اور قطعی ہو، جنھوں نے ان علوم و حقائق کو اپنے مشاہدہ سے اسطرح حاصل کیا ہو جس طرح ہم کو اس عالم کے مسموعات و مبصرات کا علم ہوتا ہے، ان کے لئے یہ چیزیں ایسی ہی بدیہی ہوں جس طرح ہمارے لئے دنیا کی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں، جن کو مشترک انسانی حواس کے علاوہ ایک حاسۂ زائد ملا ہو، جس کو ہم حاسۂ غیبی کہہ سکتے ہیں، جو خدا سے براہ راست اسکی مرضیات اور احکام معلوم کر سکیں، اور دوسرے انسانوں تک پہونچا سکیں، یہ صرف پیغمبروں کی جماعت ہے۔

سابق الذکر جماعتیں (حکماء و فلاسفہ) اپنے علم کے یقینی اور قطعی ہونیکا دعویٰ نہیں کرتیں نہ ان کو اس بارہ میں کسی مشاہدہ کا دعویٰ ہے، ان کے اقوال و دعاوی کا حاصل یہ ہے کہ ایسا ہوگا یا ایسا ہونا چاہئے، ہمارے قائم کئے ہوئے مقدمات (جو بدیہی اور قطعی الثبوت نہیں ہیں) ہم کو اس نتیجہ پر پہونچاتے ہیں، اور وہ اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتے ہیں؟

لیکن پیغمبروں کو اپنے علم کے یقینی اور قطعی ہونیکا دعویٰ ہے، وہ صرف یہ نہیں کہتے کہ خدا ہے یا اس کے یہ صفات ہیں، بلکہ وہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں، کہ ہم اسکی باتیں سنتے ہیں، ہم اس سے ہم کلام ہوتے ہیں ہمارے پاس اس کے پیغام پہونچتے ہیں، ہمارے پاس اس کے فرشتے آتے ہیں، ان کے لئے کوئی چیز اتنی یقینی اور بدیہی نہیں جتنی خدا کی صفات، اس کے احکام، پیغام اور اپنی نبوت و رسالت، اس لئے ان کو ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے عقائد میں کوئی شک و تذبذب نہیں ہو سکتا اور کسی کے کہنے سننے سے اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا،

ایک پیغمبر[1] سے جب اسکی قوم نے خدا اور اسکی صفات کے بارہ میں حجت کی تو اس نے نہایت سادگی سے اپنا اور بے دلیل بحث کرنے والوں کا فرق بیان کیا،

وحاجه قومه قال اتحاجوني في الله وقد هدان (انعام ع ۹)	اور اس سے اسکی قوم نے حجت کی اس نے کہا کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں حجت کرتے ہو حالانکہ اس نے میری رہنمائی کی ہے۔

---

[1] حضرت ابراہیم علیہ السلام

ایک دوسرے پیغمبر[1] نے بھی فرق اس طرح بیان کیا

قَالَ يٰقَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَآتَانِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُوْنَ (ہود ع ۳)

ہود نے کہا کہ اے قوم دیکھو تو اگر میں اپنے رب کی طرف سے صاف راستہ پر ہوں اور اللہ نے مجھے اپنے پاس سے رحمت بخشی پھر وہ تمہاری نظر سے مخفی رہی کیا ہم تم کو اس پر مجبور کر سکتے ہیں اس حالت میں کہ تم اس کو پسند نہیں کرتے

ایک تیسرے پیغمبر[2] کے متعلق یوں کہا گیا،

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم ع ۱)

وہ اپنے نفس کی خواہش سے نہیں بولتا، وہ محض وحی ہے جو دی کی جا رہی ہے۔

انہی کے مشاہدہ کے متعلق کہا گیا

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى لَقَدْ رَأٰى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى (النجم ع ۱)

نہ اسکی نگاہ بہکی، نہ حد سے بڑھی، بیشک اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأٰى أَفَتُمَارُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى (النجم ع ۱)

رسول کے دل نے جھوٹ نہیں کہا جو کچھ دیکھا، کیا تم اس سے جو کچھ اس نے دیکھا اس پر جھگڑتے ہو۔

اس یقینی مشاہدہ کے مقابلہ میں جو کچھ ہے اسکی حقیقت بھی سن لیجیے۔

إِنْ يَّتَّبِعُوْنَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى (النجم ع ۱)

وہ محض اٹکل اور دل کی خواہشوں پر چلتے ہیں حالانکہ انکے پاس انکے رب کی طرف سے ہدایت آچکی ہے۔

وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ إِنْ يَّتَّبِعُوْنَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (النجم ع ۲)

ان کو اس کی کچھ بھی خبر نہیں، وہ محض اٹکل پر چلتے ہیں، اور قیاس حقیقت کے قائم مقام نہیں ہو سکتا۔

---

[1] حضرت ہود علیہ السلام [2] حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

زندگی کی کمل توجیہ وحی اور پیغمبروں کی بصیرت کے بغیر ممکن نہیں

ان مابعد الطبیعاتی سوالات کے علاوہ جن کا جواب دئے بغیر ہماری زندگی حیوانی زندگی سے ممتاز نہیں ہوسکتی، ہم یوں بھی وحی کی روشنی اور پیغمبروں کے نورِ بصیرت کے بغیر اپنی زندگی کی کمل توجیہ نہیں کرسکتے اور نظام کائنات کا حقیقی مرکز اور اس ہمہ گیر اور حکیمانہ قانون کو دریافت نہیں کرسکتے جو اس عالم میں کارفرما ہے، اپنی ذاتی بصارت سے ہم کو یہ زندگی ایک وحدت کے طور پر نظر نہیں آئیگی بلکہ ایک منتشر شیرازہ ملے گا جس کے اوراق بکھرے ہوئے ہیں اسکی کچھ سطریں اور اس کے بعض عنوانات ہم غور کرکے پڑھ سکتے ہیں، مگر اس صحیفۂ کائنات کا موضوع اس کتاب کا خلاصہ اور اس کے مصنف کی معرفت ہم کو پیغمبروں کی بصیرت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی!

حکما اور ماہرینِ طبعیات نے کائنات سے متعلق جو تحقیقات کی ہیں، زندگی سے متعلق جن حقائق کا انکشاف کیا ہے، طبعی قوتوں کو اپنے علم و تجربہ سے انسان کیلئے جسطرح مسخر کیا ہے، اور جسطرح کائنات کے ایک ایک شعبہ اور زندگی کے ایک ایک گوشہ کے لئے مستقل علوم مرتب کئے اور کتب خانے فراہم کردئے وہ انسانی علم کا ایک کارنامہ ہے۔

لیکن یہ جو کچھ بھی ہے یہ زندگی اور کائنات کے اصل مجموعہ کے کسور و اجزاء ہیں، جنمیں باہم کوئی ربط نہیں ہے، نہ انکا کوئی مرکز معلوم ہے، یہ سب کس نظام کے ماتحت ہیں، کس مقصد کے تابع ہیں، اور کس اہم غرض کے خادم ہیں، ہمارے لئے عملی طور پر یہ سوالات زیادہ اہم ہیں، اخلاق، طریق کار اور زندگی کے اصل نقطۂ نظر پر جو تمدن کا اصل محرک و عمود ہے یہ مباحث زیادہ اثر انداز ہیں لیکن یہ تمام سوالات ان حکماء اور ماہرین کے موضوع بحث سے خارج ہیں، انھوں نے اپنے علم و تحقیق کا سفر اصل نقطۂ آغاز (خالق کی معرفت) سے شروع نہیں کیا اس لئے وہ ہمیشہ آفاق میں گم رہیں گے اور زندگی کے معمہ کو کبھی حل نہ کرسکیں گے۔

لیکن اس کے بالکل برخلاف جب ہم وحی کی روشنی اور پیغمبر کی بصیرت سے اس عالم پر ایک نظر ڈالتے ہیں، تو وہ ایک "وحدت" نظر آتا ہے، اور ایک اعلیٰ و عقلانی نظام معلوم ہوتا ہے جس کے اجزاء میں باہم پیوست

نمایاں ہیں، سب ایک مرکز کے تابع ہیں۔ انکی ہر حرکت و عمل ایک مقصد کے ماتحت ہے، انمیں نہ باہمی تصادم ہے، نہ خود مرکزیت، دنیا ایک مرتب و متوازن مشین ہے، جس کا ہر پرزہ اپنی جگہ پر کارآمد ہے اور دوسرے پرزہ کی امداد کررہا ہے، دنیا ایک بڑا کارخانہ ہے جسمیں صدہا مشینیں چل رہی ہیں، ہر مشین کو دوسری مشین سے پورا تعلق ہے اور یہ پوری مشین یا پورا کارخانہ ایک صاحب علم و صاحب اختیار طاقت کے ہاتھ میں ہے جو اس کو ایک قانون و انتظام کے ماتحت جو اسی کا وضع کیا ہوا ہے چلا رہا ہے۔

انبیاء اور محققین کے طریق نظر اور طریق کار کا اختلاف

انبیاء اور حکماء و محققین کے طریق نظر و طریق کار کا اس کائنات کے بارہ میں جو اختلاف ہے اسکی وضاحت ہم ایک مثال سے کرتے ہیں،

کسی شہر میں علماء و محققین کی ایک جماعت داخل ہوتی ہے، انمیں سے ایک گروہ یہ تحقیق کرتا ہے کہ اس شہر کا محل وقوع کیا ہے، اس کے حدود اربعہ کیا ہیں، اس کے پاس کتنے دریا اور کتنے پہاڑ ہیں، وہ دریا کہاں سے آتے اور وہ پہاڑ کہاں تک چلے جاتے ہیں، شہر کا رقبہ کیا ہے، وہاں کیا کیا چیزیں پیدا ہوتی ہیں، یہ جغرافیہ دانوں کا گروہ ہے۔

دوسرا گروہ یہ دریافت کرتا ہے کہ یہ شہر کب سے آباد ہے، شہر میں کون کون سے آثار قدیمہ پائے جاتے ہیں، انکی تاریخ کیا ہے، یہ مورخین اور علماء آثار کی جماعت ہے!

کچھ لوگ اسکی زمین کی حیثیت معلوم کرنا چاہتے ہیں، وہ کھدائیاں کرتے ہیں، اور اسکی معدنیات دریافت کرتے ہیں، یہ ماہرین طبقات الارض کا گروہ ہے!

کچھ لوگ وہاں ایک رصدگاہ قائم کرتے ہیں جہاں سے سیاروں اور ثوابت کا مطالعہ کرتے ہیں، انکے زمین سے فاصلے دریافت کرتے ہیں، زلزلوں اور بارش ہواؤں کے متعلق پیشین گوئیاں کرتے ہیں، یہ علماء طبعیات و ہیئت کی جماعت ہے!

کچھ لوگ وہاں کیمیائی معمل قائم کرتے ہیں، جہاں ادویہ کے خواص کا تجربہ کرتے ہیں، مفردات و مرکبات

کی تحلیل و تجزیہ کر کے نئی نئی تحقیقات کرتے ہیں، یہ علم کیمیا اور نباتات کے ماہرین ہیں؛

کچھ لوگ شہر کی زبان کے متعلق تحقیق کرتے ہیں، اس کے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں، اس کے لغت کی تدوین اور اس کے قواعد وضع کرتے ہیں، یہ ادباء اور علماء السنہ کی جماعت ہے!

کچھ صاحب ذوق ان خشک مباحث سے ہٹکر گلشن کی سیر کرتے ہیں، پھولوں پتیوں اور مناظر طبعی کا لطف اٹھاتے ہیں اور ان کے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں، یہ شعراء کی جماعت ہے!

کچھ لوگ وہاں کے عادات و رسوم اور اخلاق کا مطالعہ کرتے ہیں اور انکی تنقید کرتے ہیں، وہ سراغ لگاتے ہیں کہ یہ عادات و رسوم ان میں کہاں سے داخل ہوئے کس طرح پیدا ہوئے، ان میں سے کون صحیح ہیں اور کون قابل اصلاح، یہ علماء اجتماع اور اخلاق ہیں!

کچھ لوگ شہر کے متعلق کچھ اصلاحات پیش کرتے ہیں، شہر کی تنظیم و ترقی اور اہل شہر کی راحت رسانی کیلئے ان کے پاس کچھ تجاویز ہوتی ہیں، یہ علماء تمدن ہیں!

یہ سب جماعتیں اپنے اپنے کام میں مشغول ہوجاتی ہیں، اور دلچسپی اور انہماک کیساتھ اپنے اپنے شعبوں کی تحقیقات کرنے لگتی ہیں۔

اب ایک شخص اس شہر میں داخل ہوتا ہے، وہ پورے شہر پر ایک گہری نظر ڈالتا ہے، وہ دیکھتا اور سنتا سب کچھ ہے مگر مشغول کسی چیز میں نہیں ہوتا، اس کے نزدیک اہم سوالات یہ نہیں ہوتے کہ شہر کا رقبہ کیا ہے، اس کی عمارات کیا ہیں، اس کی زمین کی تہ میں کونسی معدنیات پائی جاتی ہیں۔ اور وہ دوسرے سوالات جو سابق الذکر جماعتوں کے نزدیک اہم تھے، اس کے سامنے آتے ہیں اور اہم ترین سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ شہر اس حسن و صنعت کیساتھ کس نے تعمیر اور آباد کیا، یہاں کسکی حکومت ہے، شہر کے باشندے کسکی رعیت ہیں، اس کا نظام حکومت کیا ہے، شہر کی آبادی اور عام زندگی سے اس کو کسطرح کا اور کس درجہ کا تعلق ہے، وہ اس اعلیٰ تنظیمی طاقت سے براہ راست واقفیت پیدا کرتا ہے، اس کے اصول و مقاصد معلوم کرتا ہے پھر تمام شعبہائے زندگی پر ایک تنقیدی

نظر ڈالتا ہو، اور سب کو مرکز کے تابع اور مقصد کے ماتحت کرتا ہو اور انکی اصلاح اور باہمی تعاون سے ایک منظم اور اعلیٰ زندگی پیدا کرتا ہو، وہ حکومت اور رعیت کے درمیان واسطہ بنتا ہو، حکومت کا ترجمان اور اسکے احکام کا شارح ہوتا ہو، پس وہ تمام علمی اور تحقیقی جماعتیں ملکر بھی اس ایک شخص کی قائم مقام نہیں ہو سکتیں اسکے بغیر وہ پورا شہر صرف ایک عجائب خانہ اور سیرگاہ بنکر رہجاتا ہو،

اس عالم میں جو اللہ تعالیٰ کی سلطنت ہو اور جس میں رہنے والے اسکی پیدائشی رعیت ہیں، انبیاء کا طریق نظر حکماء اور محققین سے اسطرح جدا ہوتا ہو، انکا کام موجودات کے اسرار و حقائق کے انکشاف و اظہار پر ختم نہیں ہو بلکہ انکا اصل موضوع "موجد کی ذات و صفات اور اس کے احکام" ہے، صحیفۂ کائنات کے اوراق و صفحات انکے سامنے بھی اسطرح کھلے اور پھیلے ہوئے ہوتے ہیں جسطرح دوسرے اہل نظر کے سامنے، مگر انکی نظر کہیں الجھتی نہیں، وہ اس صحیفہ کے مصنف سے براہ راست تعلق پیدا کرتے ہیں، وہ "آفاق" و "انفس" میں اسکی کھلی نشانیاں دیکھتے ہیں، وہ اسکی سلطنت کا ایسا مشاہدہ کرتے ہیں کہ اس زمین و آسمان میں انکو صرف اسی کا حکم چلتا نظر آتا ہو، اور صرف اسی کی بادشاہی کا جلوہ دکھائی دیتا ہو، اس کا قانون انکو کسی گوشہ میں بھی ڈھیلا نظر نہیں آتا، اور اس کا حکم کہیں بھی انکو ٹلتا دکھائی نہیں دیتا، تمام بلندیاں اس کے سامنے سرافگندہ دکھائی دیتی ہیں اور تمام طاقتیں اس کے سامنے سپر افگندہ نظر آتی ہیں، ہر عالم میں اسی کا غیبی ہاتھ کام کرتا نظر آتا ہو، زمین و آسمان اسی کے سہارے تھمے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اور اس کا "قیوم السموات والارض" ہونا انکے لئے عین الیقین بنجاتا ہو۔

یہی خدا کی وہ بادشاہی ہو جو انکو بے نقاب دکھائی دیتی ہو اور جس کا علم سب سے بڑا علم اور حقیقی حکمت ہو جس سے حکماء و محققین کے علوم کو ذرہ کی بھی نسبت نہیں، اور جس کے مقابلہ میں انکی حقیقت طفلانہ معلومات سے زیادہ نہیں۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ (انعام ع ۹)

اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی دکھاتے ہیں اور تاکہ اس کو یقین آجائے۔

پیغمبروں کی تعلیم زندگی کی صحیح اساس ہے،

پیغمبروں کو خدا کی طرف سے جو بڑی علوم و حقائق اور اخلاق اور تمدن کے جو کلی اصول و قواعد حاصل ہوتے ہیں، انکے بغیر نہ کسی صحیح زندگی کی تعمیر ہو سکتی ہے نہ کسی صحیح تمدن کی تاسیس نہ اخلاق کی تہذیب نہ نفس کا تزکیہ، زندگی کی تاریکیوں میں، انہیں کی تعلیم ہی تنہا ایک روشنی ہے جہاں یہ روشنی نہ پہونچے، یا پہونچکر کسی سبب سے گل ہو جائے، وہاں کی تاریکی کو کسی مصنوعی روشنی سے روشنی نہیں کیا جا سکتا، اسی کا نام "جاہلیت" ہے خواہ وہ کسی عہد میں پائی جائے اور وہ کیسے ہی انسانی علوم و فنون کے ترقی کا عہد ہو۔

دنیا کا سب سے بڑا علم جس سے علم کے سارے چشمے پھوٹتے ہیں خدا کی معرفت ہے، جس کے بغیر خود اس دنیا کا مجمل ہوتا ہے انسان کو اپنی معرفت حاصل ہوتی ہے، خدا کی معرفت انسان کی فطرت میں ودیعت ہے لیکن اس خوابیدہ قوت کو بیدار کرنے کیلئے اکثر اوقات انبیاء کی تحریک ضروری ہوتی ہے اور اسکی وضاحت و تصحیح کے لئے انکی رہنمائی ہمیشہ ضروری رہتی ہے اسکے لئے، نہ سلامت جسم کافی ہے، نہ سلامت فطرت، نہ ذکاوت اور سرعت ادراک دنیا کے بڑے بڑے مفکر و فلسفی، ہر زمانہ میں لاکھوں اور کروڑوں سلیم الفہم اور سلیم الفطرت اور ذکی انسان پیغمبروں کی تحریک کے بغیر اس حقیقت کا ادراک نہ کر سکے، یا اس کا کچھ ادراک کرنے کے بعد وہ بعض ایسی شدید غلط فہمیوں اور غلط نمیوں میں مبتلا ہو گئے جنھوں نے انکو اس علم سے مستفید ہونے سے باز رکھا۔

تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفس بھی پیغمبروں کی رہنمائی اور تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ انسان کی فطرت سلیم کے ظہور کے لئے دنیا میں کثرت سے موانع اور حجابات ہیں، طبیعت، تربیت، ماحول اور غلط علم کے ایسے موٹے موٹے پردے پڑ جاتے ہیں، جو انبیاء کی طاقتور روشنی کے بغیر چاک نہیں ہو سکتے، انسان کے دل و دماغ کے قفلوں کو صرف انہیں کی کلید ہدایت کھول سکتی ہے اور انہیں کا صیقل اسکے آئینہ کا زنگ دور کر سکتا ہے۔

اخلاقیات میں حدود کی صحیح تعیین کا اعتدال، جامعیت اور صحیح توازن کیلئے جس اعتدال مزاج جس عقلی سلامت روی اور جس وسعت نظر کی ضرورت ہے وہ صرف انبیاء میں پائی جاتی ہے، وہ مزاج کی طبعی اور

اخلاقی حیثیت سے خدا کی صنعت کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں، صرف انھیں کے اعمال اور تعلیمات، غلو، افراط و تفریط، خشک فرائی اور تنگ نظری سے پاک ہوتی ہیں۔ پھر ان سے جو لوگ جتنے زیادہ قریب ہوتے ہیں وہ اسی جامعیت و توسط کا نمونہ ہوتے ہیں۔ انبیاء کرام اور انکے اصحاب کی سیرتیں اسکی شاہد ہیں۔

انبیاء کی دعوت | انبیاء کرام کو جب اس حقیقت کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہو جاتا ہو کہ یہ عالم خدا کا پیدا کیا ہوا ہو اسکی حکمت ہو، اور اسکے حکم سے یہ انتظام ہو رہا ہو تو پھر وہ انسانوں کی طرف توجہ کرتے ہیں اور تعجب سے دیکھتے ہیں کہ کائنات اور اسکے تمام اجزا نے چار و ناچار جس بڑی طاقت کے سامنے سر جھکا دیا ہو، اور اپنے کو اس کے تابع فرمان بنا دیا ہو، انسان جو اس کائنات کے مجموعہ کا سب سے اہم جزء ہو اس کے سامنے اپنے ارادہ اور خواہش سے جھکنے میں تامل کر رہا ہو اگرچہ وہ بلا ارادہ اسکے سامنے جھکا ہوا ہو اور اس کے تکوینی احکام و قوانین کے زیر فرمان ہے وہ اسی کے حکم سے پیدا ہوتا ہو اسی کے حکم سے نشو و نما پاتا ہو بچے سے جوان ہوتا ہو اور جوان سے بڈھا، اسکی پیدائش ہوتی ہو، بیمار پڑتا ہو، اسکے حکم سے بیمار ہوتا ہو اور اسی کے حکم سے صحت پاتا ہو، وہ زندگی کی تمام ضروریات میں اور اپنے تمام جسمانی احکام فطرت میں خدا کے بنائے ہوئے نظام و قوانین کے اسیطرح تابع ہے جسطرح جمادات و نباتات و حیوانات کا لیکن جب اس سے کہا جاتا ہو کہ جس طاقت کے سامنے تم بلا ارادہ جھکے ہوئے ہو، اسکے سامنے تم با ارادہ بھی جھک جاؤ کہ تمھارے شرف و فضیلت اور علم و حکمت کے یہی شایان شان ہو تو اس کو اس میں عذر ہوتا ہو! انبیاء کرام نے جب پہلی حقیقت کے بالکل برخلاف یہ واقعہ دیکھا اور انھوں نے دیکھا کہ انکی انسانی برادری کے بہت سے افراد نے خالق کے بجائے، اسکی بعض مخلوقات کے سامنے سر جھکایا ہو اور انکی عبادت و اطاعت اختیار کرلی ہے تو انکی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ وَلَہٗ اَسْلَمَ	کیا اللہ کی فرمانبرداری کے سوا کسی اور کی فرمانبرداری کے
مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا	طالب ہیں حالانکہ اللہ کے سامنے زمین و آسمان کی سب چیزیں بخوشی
وَاِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ (آل عمران ع ۹)	یا زور سے جھکی ہوئی ہیں اور اللہ ہی کی طرف ان سب کو لوٹ کر آنا ہے

عالم کی بھی فطرت کی اور کائنات کا یہی مجموعہ ہے جو قرآن کی آیات سجدہ میں کثرت سے بیان کیا گیا ہے،

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (النحل ع ۶)

اور اللہ ہی کے سامنے زمین و آسمان کی تمام مخلوقات اور فرشتے سربسجود ہیں، وہ انہیں خدا کے سامنے تکبر کا کوئی جذبہ نہیں، اپنے رب سے جو ان کے اوپر ہے ڈرتے ہیں اور اسکے احکام کی اطاعت کرتے ہیں،

بس انبیاء کی دعوت یہ ہوتی ہے کہ انسان بھی اسی طاقت کے سامنے سر تسلیم خم کر دے جس کے سامنے ساری کائنات سرافگندہ ہے، اور کائنات کا ایسا جز ہو کر زندگی گذارے جو اپنی حرکت و عمل میں اسکی مجموعی حرکت و رفتار سے ہم آہنگ ہو، خالق کائنات اور مدبر ارض و سموات کے احکام و قوانین کے تابع ہو، وہ اپنی تمام غلط خواہشات اختیار مطلق انسانی اور آزادی و خود مختاری کے دعوؤں اور اپنے "حقوق مالکانہ" سے دستبردار ہو کر اپنے کو اسکے حوالے کر دے، اسی کا نام "اسلام" ہے جسکی دعوت لیکر تمام انبیاء آئے۔

ظاہر ہے کہ اس "دین" اور "اسلام" (اطاعت مطلق اور تسلیم کامل) کے بعد اور اس تصور کے ساتھ کہ بالآخر کار واسطہ اسی سے پڑنے والا ہے (والیہ یرجعون) اور اس کے سامنے اس زندگی کا حساب کتاب پیش کرنا ہے، انسان میں مطلق العنانی اور خود مختاری کا جذبہ کسی طرح نہیں پیدا ہو سکتا، اسکی زندگی کا نقشہ اس کے دماغ کے سانچے سے ڈھلکر نہیں نکلیگا، بلکہ اسی کا تجویز کیا ہوگا جس نے کائنات کا پورا نقشہ بنایا ہے اور خود اسکا بھی خالق ہے، اس کے اخلاق و عادات، سیاست و اجتماع اور احکام و قوانین اس کے اپنے تصنیف نہوں گے، بلکہ اس کو سب خدا کی طرف سے ملیں گے،

جاہلیت | وحی و رسالت کے اس راستہ کے مقابل دوسرا راستہ یہ ہے کہ انسان اپنے کو اس عالم میں ایک وجود مستقل فرض کرے جسکی زندگی کا رخ کائنات کی دوسری چیزوں سے بالکل جدا ہو اور اس میں وہ کسی بالائی طاقت کے زیر فرمان، کسی آسمانی نظام کا تابع، اور کسی غیر انسانی عدالت کے سامنے جوابدہ نہیں ہے، یہ جاہلیت کا راستہ ہے، جو در حقیقت خدا کی اس سلطنت میں چھوٹی چھوٹی متعدد آزاد اور خود مختار سلطنتیں قائم کرنیکی باغیانہ کوشش ہے،

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زندگی اور متعلقات زندگی پر ان دو متقابل نظریوں اور تصورات کا جو اثر پڑتا ہے واضح کر دیا جائے۔

پیغمبرانہ نظامِ زندگی اور جاہلیت

اخلاق، تمدن، اور سیاست الگ الگ نظام نہیں ہیں، بلکہ ایک ہی نظام کے اجزا ہیں اس نظام کی بنیاد ایک مابعد الطبیعاتی نظریہ یا تعلیم پر ہے، دنیا میں متعدد مابعد الطبیعاتی نظریے ہو سکتے ہیں اور ہو چکے ہیں، ان میں ہر ایک کی بنیاد پر زندگی کا ایک پورا نظام مرتب کیا جا سکتا ہے اس نظام میں عبادت بھی ہو گی، اخلاق بھی ہونگے، تمدن بھی ہوگا اور سیاست بھی ہوگی، ان میں سے ہر ایک نظام دوسرے نظام سے اپنی روح اپنے اشکال میں اسی قدر مختلف ہوگا جس قدر انسانی زندگی اور حیوانی زندگی میں اختلاف ہے، حیوانوں اور انسانوں میں بہت سی چیزیں عام اور مشترک ہیں، حیوان اور انسان یکساں جسم اور جسمانی ضروریات کی مطلق حقیقت میں بھی اشتراک ہے لیکن اسکے باوجود یہ دو ذیں ہیں، اسی طرح دونوں نظاموں میں بعض جنسی اور نوعی اشتراکات کے باوجود بڑا فصل ہوگا، دونوں نظاموں کے ماننے والے بہت سے مظاہر زندگی میں شریک ہونگے، کھانے پینے اور پہننے اور بہت سی تمدنی ضرورتوں میں انمیں آپس میں اختلاف نہ ہوگا لیکن پھر بھی بڑا اختلاف ہوگا، ہو سکتا ہے کہ جتنا جانور اور انسان کی زندگی میں ہوتا ہے،

ان نظریات میں دو نظریے بہت قدیم اور کامیاب ہیں، اور ہر انسانی دور میں، دنیا کی انسانی آبادی انمیں بٹی رہی، ان دونوں نظریوں میں ہمیشہ جنگ جاری رہی ہے، اور ایک کو دوسرے پر غلبہ ہوتا رہا ہے

ایک نظریہ یہ ہے کہ اس دنیا کو خدا نے پیدا کیا ہے وہی اس کا منتظم، مالک، اور حقیقی حاکم ہے، انسان اسکی مخلوق بندے، اور رعیت ہیں، اس زمین پر وہ اسکی حکومت کے نائب اور اس کے خزانوں کے امین ہیں یہ زندگی امتحان کیلئے ہے، اس کے بعد ایک دوسری زندگی آئیگی جسمیں پہلی زندگی کا محاسبہ ہوگا، اور وہاں صرف وہ لوگ کامیاب ہونگے، جنھوں نے یہاں، خدا کے احکام و قوانین کے مطابق زندگی بسر کی ہے،

اس عقیدہ کی تہ سے جو اخلاق ابھرینگے اور اس نظریہ کے تخم سے جو تمدن اگیگا اور اس تصور کی بنیاد پر

جو حکومت قائم ہوگی اس کے پورے جسم میں خدا پرستی اور خدا ترسی کی روح ہوگی تقویٰ اور احتیاط اسکے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہوگا، یہیں بادشاہی کی شان نہ ہوگی بلکہ بندگی کی شان ہوگی، وہ اپنے کو زمین میں امن کا پاسباں حق کا وکیل، صداقت کا علمبردار، مظلوموں کا حامی، سمجھینگے، اور قوامین بالقسط شہداء للہ (عدل و انصاف کے علمبردار اور محض اللہ کے گواہ) کی تعبیر کے مصداق ہوں گے۔

انہیں ذاتی سربلندی اور شخصی اقتدار کا جذبہ کبھی پیدا نہ ہوگا، طاقت اور حکومت کا نشہ ان پر کبھی سوار نہ ہوگا اور کبھی اپنے ذاتی فوائد کے لئے دوسروں کے فوائد کی قربانی پسند نہ کریں گے اور انکی ذات سے کبھی زمین پر فساد برپا نہ ہوگا اس لئے کہ انھوں نے سنا ہوگا کہ

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ۝ (قصص ع ۹)

وہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو دینگے جو زمین میں اپنا تفوق نہیں چاہتے اور نہ فساد اور انجام خدا ترس لوگوں کے لئے ہے۔

انکے یہاں شخصی اور اجتماعی اخلاق کی کوئی تقسیم نہ ہوگی وہ دونوں قسم کے اخلاق میں خدا ترس اور محتاط ہوں گے، وہ خدا کے خوف سے (نہ کہ قانون اور پولیس کے خوف سے) جرائم سے مجتنب اور قانون کے پابند ہوں گے، اسلئے حکومت کے اندر بھی وہی ہوں گے جو گھر کے باہر تخت سلطنت پر بھی وہی ہوں گے جو گھر کے بستر پر، وہ جلوت و خلوت دونوں میں یکساں ہوں گے اس لئے کہ خدا دونوں جگہ موجود ہے، اور انکا اعتقاد ہوگا

مَا يَكُونُ مِن نَّجْوَىٰ ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا أَدْنَىٰ مِن ذَٰلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ (مجادلہ ع ۲)

تین آدمیوں کا مشورہ بھی ہوگا تو انکا چوتھا خدا ہوگا پانچ آدمیوں کا ہوگا تو چھٹا وہ ہوگا اور نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ مگر یہ کہ وہ ان کے ساتھ ہوگا پھر قیامت میں انکو انکے اعمال کی خبر دیگا، بیشک اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔

انکی حکومت چند اشخاص یا کسی خاندان کے عیش و کامرانی یا کسی قوم اور ملک کے تفوق اور برتری کا ذریعہ نہ ہوگی، بلکہ اخلاق حسنہ کی عام اشاعت، نیکی اور خدا ترسی کے رواج، حق و صداقت کے غلبہ، اور بداخلاقی اور فساد کے زوال کا سبب ہوگی،

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (حج ع ۶)

وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انکو زمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، بھلائی کا حکم دیں گے برائی سے روکیں گے اور انجام امور اللہ ہی کے ہاتھ ہے،

ان کا تمدن عیش و عشرت، شان و شوکت، لہو و لعب اور زینت و تفاخر اور مال و دولت کے مظاہرہ کا مظاہرہ نہ ہوگا بلکہ ایک پاکباز اور محتاط تمدن ہوگا جس میں عمل اور دینداری کی مسابقت ہوگی، تقویٰ معیار فضیلت ہوگا، شراب اس میں حرام ہوگی، سود لینا ناجائز ہوگا، سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال ممنوع ہوگا، تصاویر اور پتھر کے بت اور انسانی مورتیں دیکھنے میں نہ آئینگی، قمار خانے ناپید ہونگے، فسق و فجور پر سخت بندشیں اور سزائیں ہونگی، موسیقی اور غفلت و تعیش کے اسباب پر قیود ہوں گے،

اس تمدن کی روح یہ نہ ہوگی کہ "بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" بلکہ دنیا کی زندگی کے بارہ میں انکا نقطۂ نظر یہ ہوگا کہ

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (حدید ع ۳)

دنیا کی زندگی محض کھیل تماشا، آرایش، ایک دوسرے پہ فخر، مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش ہے جیسے ایک بارش جس کا سبزہ کھیتی کرنے والوں کو اچھا معلوم ہوا پھر وہ کھیتی لہلہاتی ہے پھر تم اس کو زرد دیکھتے ہو پھر وہ بھوسہ بنجاتی ہے اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور معافی بھی ہے اللہ کی طرف سے رضامندی اور دنیا کی زندگی تو دھوکہ کا سامان ہے،

جامع، مکمل اور مستقل نظام زندگی ہے جو اپنی بنیاد سے لیکر آخری بلندی تک دوسرے نظاموں سے اپنی ایک ایک اینٹ میں ممتاز ہے، اس کا سنگ بنیاد وہی ابعد الطبیعاتی نظریہ ہے جو اوپر گذرا
اس نظریہ کے داعی اور اس نظام زندگی کے بانی پیغمبر ہیں جن کا سلسلہ حضرت آدمؑ سے شروع ہو کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوتا ہے، آپنے اس نظام زندگی کو عملی طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا، اور آپنے اور آپکے سچے جانشینوں نے منظم و مرتب طریقہ پر اس کو خارج میں قائم کرکے دکھا دیا، جاہلی نظام کے مقابلہ میں یہی سب سے بڑی طاقت ہے، جو ہمیشہ زندہ رہیگی، سا

دوسرا نظریہ یہ ہے، کہ ممکن ہے اس دنیا کو خدا نے پیدا کیا ہو لیکن اس کا اب اس کائنات سے کوئی عملی اور انسان کی زندگی سے کوئی داخلی تعلق نہیں ہے، انسان کائنات کی سب سے بڑی طاقت ہے، وہ زمین اور قدرت کے خزانوں کا حقیقی مالک ہے، یہی زندگی اصل زندگی ہے، اس کے بعد اندھیرا ہی اندھیرا ہے، اس لئے جس قدر اس زندگی میں عیش کیا جا سکے کر لیا جائے، انسان اپنی طاقتوں کے استعمال میں بالکل آزاد ہے، طاقت اصل قانون اور اغراض و مصالح عمل کے اصل محرک ہیں، یہ جاہلیت کا نظریہ ہے،

اس نظریہ سے ایک ناخدا شناس تمدن اسطرح پھوٹتا ہے جسطرح بیج سے درخت نکلتا ہے جو اپنی تمام ٹہنیوں اور شاخوں میں اس بیج کے خواص اور اثرات رکھتا ہے، ساری زندگی میں بے قیدی اور آزادی سرایت کر جاتی ہے، نفع اندوز ذہنیت، اور خود غرضانہ نقطۂ نظر زندگی پر چھا جاتا ہے، گناہ و ثواب کا تصور جاتا رہتا ہے بلکہ یہ اصطلاحیں قابل مضحکہ بنجاتی ہیں اخلاق کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں، پرائیویٹ اور پبلک پرائیوٹ اخلاق قابل اعتراض نہیں رہتے، اس لئے ایک ہی شخص کی دو حیثیتیں ہو جاتی ہیں، خانگی اور خارجی شخصی اور خانگی طور پر اسکو آزادی دیدی جاتی ہے، اور اجتماعی طور پر اس کو کچھ ضوابط کا پابند کر دیا جاتا ہے، جرائم سے مانع صرف قانون کی لفظی پابندی، اور سزا یا پولیس کا خوف ہوتا ہے، اس لئے جہاں یہ موانع دور ہوتے ہیں، جرائم کے ارتکاب میں کوئی چیز مانع نہیں رہتی، قانون کی عظمت دل سے جاتی رہتی ہے، اس لئے کہ وہ اپنے

جیسے انسانوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے جن کا ذہن میں کوئی تقدس نہیں ہوتا، اور جو زیادہ تر قانون سازی کے منصب پر اپنی ذکاوت یا دولت یا طاقت کی وجہ سے زبردستی قابض ہوجاتے ہیں اس لئے اس کو عاجز و مغلوب کرنے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کیجاتی ہے زندگی کا مقصد صرف عیش ولذت قرار پاتا ہے، اسلئے زیادہ سے زیادہ عیش کا سامان پیدا کیا جاتا ہے، اس کیلئے دولت کی ضرورت ہوتی ہے سو اسکے پیدا کرنے میں سخت مقابلہ ہوتا ہے، اس سے قلبی قساوت بہیمیت تنافس اور طبقاتی کشمکش پیدا ہوتی ہے اسکے حاصل کرنیکے بعد اسکو اپنے نفس کی خواہشات میں آنکھ بند کرکے صرف کیا جاتا ہے جس سے فسق و فجور اور جرائم پیدا ہوتے ہیں اور شہری زندگی میں سخت ابتری پیدا ہوتی ہے۔

خداشناسی کی جگہ پہلے خودشناسی لیتی ہے، لیکن وہ جلد خود فراموشی میں تبدیل ہوجاتی ہے کہ خدا فراموشی کا نتیجہ ہمیشہ خود فراموشی ہوتا ہے پھر خود فراموشی رفتہ رفتہ قومی خودکشی کی شکل اختیار کرلیتی ہے حیوانی یا انسانی نقطۂ نظر کے بجائے بہیمانہ نقطۂ نظر قائم ہوجاتا ہے، اور زندگی بالکل غیر انسانی بنکر رہجاتی ہے حکومت کا مقصد ایک شخص یا ایک خاندان کا اقتدار قائم کرنا ہوتا ہے، اسکی خاطر خونریز جنگیں ہوتی ہیں، بعد میں یہ نظریہ ترقی کرکے قومی اور وطنی اقتدار کی شکل اختیار کرلیتا ہے، پہلے اگر خاندان خاندانوں سے لڑتے تھے تو اب قومیں قوموں سے اور ملک ملکوں سے برسرپیکار رہتے ہیں، اور زیادہ انسانوں کا خون بہتا ہے اور دنیا انسانوں کیلئے جہنم بنکر رہجاتی ہے،

اس پورے نظام زندگی کی بنیاد ناخداشناس طریق نظر اور انسان کی آزادی کا غلط تصور ہے، یہ کج خشت اول زندگی کی پوری دیوار کو ثریا تک کج رکھتی ہے، اسکی کجی فلک پیمائیوں، اور سائنس کی بلند پروازیوں میں بھی نہیں جاتی،

اس نظریہ اور اس کے اثر سے خیالات، اخلاق واعمال، تمدن وسیاست کا جو نظام مرتب ہوتا ہے اس کا نام پیغمبر کی اصطلاح میں "جاہلیت" ہے، جو پیغمبروں کی دعوت سے پہلے دنیا میں قائم ہوتا ہے، انکی دعوت وتحریک کے زمانہ میں دنیا کا نظام زندگی ہوتا ہے، اسی سے انکو جہاد کرنا پڑتا ہے اور پھر جب انکے بعد انکی دعوت وتحریک کمزور پڑجاتی ہے تو یہ نظام جو فنا نہیں ہوا کرتا بلکہ دب جاتا ہے پھر ابھر آتا ہے، عہد قدیم میں اپنے اپنے زمانہ میں عاد وثمود، فرعون وہامان وقارون، اہل بابل و نینوی، مصر کے باشندے اور دوسری قومیں اور اشخاص دنیا میں اس نظام کے نمائندے تھے، اب عہد سے اسکی امامت یورپ کے ہاتھ میں ہے،

یاد ایام

از جناب مولانا ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی ایم اے انسپکٹر مدارس عربیہ الہ آباد

حضرت الاستاد علامہ شبلی نعمانی

چراغاں بزم تھی ساری پڑی یہ روشنی کیسی
گئے شرما چراغ ایسے کہ گل بندھ بندھ گئے انیس

علی گڈھ میں تھا، بی۔ اے کا امتحان دے چکا تھا کہ شب کو خواب میں دیکھا کہ ایک بہت بڑی محفل منعقد ہے، عیدگاہ میں، حضرت علامہؒ وہاں کھڑے بیان فرما رہے ہیں۔ دوسرے روز خبر وفات مل

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس خواب کی مناسبت سُنئے علی گڈھ سے چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ ند
میں اسٹرائک ہو چکی ہے، مولویوں نے قبضہ کر لیا ہے، علامہ کنارہ کش ایک حد تک ہو چکے ہیں۔ ایک آنکھ میں نز
شروع ہو گیا ہے، میں حاضر ہوتا ہوں، اسٹرائک کا قضیہ سنتا ہوں، قلق ہوتا ہے، انکی معذوری پیش نظر ہو جا
ب وقت اس قسم کے ہیجان برداشت کرنیکا نہیں ہے، عقیدتمند شاگرد مشورہ یکسوئی کا دیتا ہے اور یہ عر
کرتا ہے کہ اسوقت تک آپنے جو کچھ کیا اگرچہ وہ دینی خدمت ایک حد تک تھی مگر اب مخلصین لہ الدین کا و
الامر بالجوانیم استاذ علامہ چیں بجبیں ہو جاتے ہیں، استاد شاگرد آبدیدہ ہوتے ہیں، استاد فرط محبت سے
لپٹا لیتا ہے، اور پھر وہ باتیں پیش نظر ہو جاتی ہیں۔ علوم القرآن اور سیرۃ نبوی صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ
شاگرد عرض کرتا ہے کہ پہلے میں اشکال زیادہ ہے، یہ کام ساری عمر کا ہونا چاہئے تھا۔ پھر ہندوستان میں
مخاطب کون، اردو میں اسکو چھپ بنانا ایک اور محنت چاہتا ہے جو آپکے سن و سال و قویٰ کے
حال نہیں جو آخر میں سیرۃ ہی پر رائے مختتم ہو جاتی ہے۔ دوسری مرتبہ حاضر ہوا تو مسودہ املا

تیار تھا، مجھے دکھایا، پھر طباعت کو بھیجا، کچھ خدمت مواد کے متعلق سپرد ہو جاتی جس کی تعمیل بمشورہ ڈاکٹر ہمدرد وغیرہ کرکے بھیج دی گئی۔ مگر یہ عرض کیا کہ کتاب ہر قسم کے مباحثوں سے الگ محض صحیح واقعات اور عمدہ ترتیب پر مبنی ہونا چاہئے۔ مولوی کچھ سمجھیں الاعمال بالنیات، یہ میرا ایمان ہے کہ خارجی کی کوئی کمی یعنی علم و فہم میں کیا کسر تھی، قبولیت کیوں نہ حاصل ہوتی۔ عشق رسولؐ سے ہر رگ بھری ہوئی تھی۔ یہ خواب اسکی بشارت تھا۔ ہمارے دوست کی خدمت دنیا کو معلوم ہو اور وہ انکے والدات ذہنیتوں کے مستحق تھے اور میں گو "الدال علی الخیر کفاعلہٖ" کے ثواب میں شریک مجھ ہیچ کارہ کو بھی سمجھیں۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ سنا دوں۔ ایک مرتبہ بعض علماء میں اس سے پہلے بھی علامہ کے خلاف ہیجان پیدا ہوا اسکی تحقیق اور تفتیش کے لئے ایک جماعت اراکین ندوہ کی آگئی۔ صبح کو حضرت الاستاذ کی قیام گاہ پر چند علماء بیٹھے ہیں الکلام شائع ہو چکی ہے، پہلی جلد تو نواب محسن الملک مرحوم آئے وہ زمانے کسی طرح اپنے ساتھ لیگئے، وہی جلد میں نے بھی پڑھی تھی، مگر اسکے بعد والی جلد لکھی تھی، جناب ابراہیم خاں صاحب نے اسکو اٹھالیا، اتفاق دیکھئے صفحہ وہ کھلا ہے جہاں علامہ نے ملاحدہ کے اعتراض نقل کئے ہیں اُسوقت علامہ نے بعجلت بے چین ہوکر فوراً ان سے کہا کہ حضرت یہ میں نے ملاحدہ کے اعتراض نقل کئے ہیں خوف ہوا کہ یہ عصبیت کی رو میں کہیں ان اقوال کو انہیں کے اقوال نہ سمجھیں تو سونے میں سہاگہ ہو، اگرچہ نقل کفر کفر نباشد۔

نہ جانے علامہ کب تشریف لائیں گے، حکم خداوندی تو خداوندی کارخانہ ہے، کب وقت پیدا ہو، بے چین ہوکر خط لکھتا ہوں، جواب تسکین بخش ملتا ہے، آخر خدا خدا کرکے وہ وقت آگیا اور علامہ مع اپنے ساز سامان کے یعنی ایک عدد ٹرنک کپڑوں کا بستر، ایک ٹفن بکس اور باقی کتابیں ہاں ایک کیش بکس جو اکثر کھلا ہوا چارپائی کے نیچے رکھا رہتا تھا، تشریف لے آئے سب سے اوپر کی منزل میں قیام ہوا، علی گڈھ سے حیدرآباد دیکھئے، علامہ شبلی ایک سادگی پسند مولوی تھے، استاد شاگرد میں علمیت حافظہ کے علاوہ ایک اور

جو چند شعر کہی تھی یعنی بیانی کیفیت اور شعریت، وہ ذکی الشعور تھے اگر کوئی باقاعدہ بچپن ہو کر شعر کہتے، جب شعر کہنے لگا کر کہے اور وہ بھی آفتاب نکلنے سے پہلے۔ ذہنی خصوصیات میں دو باتیں انکی تھیں حافظہ خداداد تھا، مگر انھیں دو نے ان کو ممتاز اور کامیاب کیا تھا۔ قوت آخذہ اور ترتیب مواد وسعت معلومات میں اپنے زمانہ میں اپنے معاصرین میں فرد تھے۔ ڈاکٹر نذیر احمد بڑے مصنف اور نثار تھے مگر مواد کے لئے اپنی تصنیفات میں ان سے مستفید ہوتے۔ علامہ کی علالت کے زمانہ میں میں نے اس قسم کے استفسارات کے جواب لکھے ہیں۔ تفصیل ماضی تو ان کے سوانح نگار کا کام ہے، مجھکو تو وہ جیسے نظر آئے اور جن باتوں میں وہ دوسروں سے ممتاز تھے بیان کر دیں۔ ہمارے مولانا سے تعلیم پانے کا جو اثر ہم پر تھا، وہی اُن پر بھی تھا، اُنکی طبیعت میں اُٹھان وہی تھی، انھوں نے علاوہ ہمارے مولانا کے لاہور رہکر کچھ حصہ قرآن پاک اور حماسہ حضرت مولانا فیض الحسن صاحبؒ شارح حماسہ سے پڑھا تھا۔ حدیث کی تکمیل مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری اور مولانا ارشاد حسین صاحب رامپوری سے کی تھی۔ فرماتے تھے کہ جب میں بڑا ہو گیا تو والد یعنی مولوی حبیب اللہ صاحب وکیل جو مرفہ الحال تھے اور جوار میں بڑے سخی داتا تھے اور میرے اور بھائیوں کو علی گڈھ رکھکر پڑھوایا۔ ایک بھائی کو ولایت بھیجا، مجھکو صرف پانچ روپیہ ماہانہ دیتے، مگر میری بسر اچھی طرح ہو جاتی۔ سستا سما تھا کوئی حیرت کی بات نہ تھی، عربی کے طالب العلم کی زندگی سادہ ہوتی ہی ہے۔

ڈاکٹر آرنلڈ اور سر سید کی صحبت نے انکی مولویت کی جڑ اکھاڑ پھینکی تھی، ماسوا اسکے ڈاکٹر سید علی بلگرامی کی صحبت نے دکن میں جنکو وہ ہمیشہ اپنا مربی کہتے تھے انکو بہت کچھ مستشرقیت سے روشناس کر دیا تھا اور مطبوعات یورپ انھیں کی وساطت سے علامہ کو دستیاب ہوتی تھیں۔ انگریزی کے حرف شناس تھے کبھی کبھی الفاظ دیکھکر صحیح جملے ادا کر لیتے۔ فرانسیسی ڈاکٹر آرنلڈ سے سیکھی تھی اور اسکا اپنے مضمون اور موضوع کے مطابق کچھ مطلب حل کر لیتے تھے۔ انکی فارسیت انکی عربیت سے بلند تھی مگر عربیت بھی بہت اچھی تھی جب شعر العجم زیر تصنیف تھی تو میں نے عرض کیا کہ آپ اپنے مشن نامے سے باہر کیوں جا رہے ہیں، ابھی تو دو کام

بانی ہو۔ فرمایا! بہاں تو گِک کر دینا، مگر یہ تو میرا بچپن کا شوق ہو، اسکو تو پورا ہی ہو جانے دو، ورنہ دب جائیگا۔ جلد اُن کی ادبیاتِ ایران شائع ہوئی، اُدھر شعر العجم کا بھی اشتہار ہو چکا، لوگ سمجھے کہ علامہ نے یہ خیال اس سے لیا، مگر اس سے پہلے شعر العجم بہت کچھ ہو چکی تھی۔ تاہم بچپن مصنف نے براؤن کی کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھوا کر اُس کا ترجمہ سُن لیا، پھر کہا تو یہ کہا کہ الحمد للہ اسنے میرا کام نہیں کیا۔ حالانکہ براؤن نے بعد کی جلدوں میں خود علامہ سے بڑی تشکر و امتنان کے ساتھ بہت کچھ نقل کیا۔ یہ جواب تھا ان لوگوں کا جنھوں نے بدظنی کو دخل دیا۔ ان بعض الظن اثم۔ اسکے بعد شعر العجم کی تنقید میں میرے نزدیک وہی مرتبہ رکھتی ہیں جو الفرق اور الفاروق میں ہو۔ الفاروقؓ پر یاد آیا۔ میں نے ایک مرتبہ حضرت الاستاذ سے سوال کیا کہ آپکو اپنی تصانیف میں سب سے پیاری کون تصنیف ہو۔ فرمایا۔ الفاروقؓ۔ یہ حق بھی ہے۔ وہ اولاد بہت پیاری ہو جاتی ہو جسکی پرورش میں زیادہ زحمت اُٹھانا پڑتی ہو۔ اسی ایک تصنیف کے لئے لمبے لمبے سفر کئے، طویل علالت جس کے جراثیم عمر بھر ستایا کئے۔ اسی ایک کی بدولت اٹھاون برس کی عمر میں مولانا ایک پیر فرتوت معلوم ہوتے تھے۔ حالانکہ وہ اکھاڑے میں اُترنے والے کسرتی جوان تھے۔ مولانا حالی سے سچے نقادِ سیرت نے انکی شان میں خوب کہا ہے؎

ادب اور شرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن
تو شبلی سا وحیدِ عصر کیا اے زمن دیکھیں

حالات ندوہ

سالانہ امتحان قریب ہے شعبان میں امتحان شروع ہوگا لیکن تیاری ابھی سے شروع ہوگئی ہے طلبہ بڑے انہماک سے اپنی کتابیں دیکھ رہے ہیں سارا دن اور رات کا بڑا حصہ اسی مشغولیت میں گزرتا ہے،

شروع اگست میں مولانا محمد عمران صاحب انچارج مہتمم دارالعلوم کی دعوت پر جناب چودھری خلیق الزماں صاحب دارالعلوم تشریف لائے اس تقریب میں نواب شمس الحسن صاحب، مولوی صباح الدین صاحب رفیق دارالمصنفین اور دارالعلوم کے کچھ اساتذہ بھی شریک تھے تقریباً تین گھنٹے بڑی دلچسپ اور پرلطف مجلس رہی مختلف سیاسی اور علمی مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوا مسلم لیگ کے نصب العین مقاصد کار اور طریقۂ عمل کے متعلق کافی گفتگو رہی اس سلسلہ میں پاکستان کے نظریہ اور اسکے عملی خاکہ پر بھی خاصی بحث رہی چودھری صاحب نے اس بارہ میں تفصیل سے اپنے خیالات ظاہر کئے اور فرمایا کہ واقعات وحقائق کی روشنی میں ہندوستان کی فرقہ وارانہ کشاکش کا اس کے سوا اور کوئی حل نہیں ہے۔

اس مہینے الاصلاح میں بھی خاصی دلچسپیاں رہیں شعبۂ خطابت کے تحت کئی اہم مباحثے (ڈبیٹ) ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں مشرق ومغرب کی کشمکش" موضوع بحث تھا اس سلسلہ میں متعدد اصلاحی تعلیمی اور تعمیری تحریکوں پر گفتگو ہوئی خصوصیت کے ساتھ علی گڑھ کی جدید تعلیمی تحریک اور دیوبند کی مذہبی دعوت پر تفصیل سے بحث ہوئی آخر میں دین ودنیا کی "باہم آمیزی" کے تصور نے ندوۃ العلماء کا خیال دلایا اور اس تحریک کی پنجاہ سالہ اصلاحی جدوجہد پر مقررین نے تفصیل سے بحث کی۔

عربی زبان کی اشاعت وترقی کی غرض سے دارالعلوم میں "النادی العربی" کے نام سے ایک انجمن عرصہ سے

سے قائم ہو، پچھلے سال اس انجمن کے تحت ایک کل ہند مباحثہ (آل انڈیا ڈیبیٹ) ہوا تھا جس میں ہندوستان کے مختلف اسلامی مدارس نے حصہ لیا تھا، سال گزشتہ یہ اجتماع ستمبر میں ہوا تھا لیکن اب کی رمضان کی وجہ سے اس ماہ میں جلسہ نہ ہو سکے گا بلکہ اس کے بجائے انشاء اللہ ذیقعدہ (نومبر) کی کسی تاریخ میں ہوگا، صحیح تاریخ اور جلسہ کے پروگرام کی اطلاع شوال میں دی جاسکے گی، اس بارہ میں اگر کسی صاحب کو مزید معلومات حاصل کرنی ہوں تو وہ مدیر النادی العربی سے خط وکتابت کرسکتے ہیں،

اس درمیان مجلس الالعاب الریاضیہ (گیمس کمیٹی) کے حلقہ میں بھی بڑی دلچسپیاں رہیں فٹ بال کے متعدد مقابلوں (میچوں) کے علاوہ سب سے دلچسپ چیز اناڑیوں کا میچ تھا جن لوگوں نے شاید کبھی فیلڈ میں قدم بھی نہیں رکھا تھا اس مقابلہ میں شریک تھے اس مجمع ناواقفاں میں اصول و قواعد کی پابندی کا کیا ذکر ہو ریفری کی سیٹیاں انھیں متوحش ضرور کر دیتی تھیں لیکن اس سے ان کی جد وجہد پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تھا بہرحال تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ اناڑیوں کی یہ کشاکش جاری رہی بالآخر فتح و شکست کے فیصلہ کے بغیر گیمس ختم ہوگیا اور شربت کے گھونٹوں سے کام و دہن کی تشنگی دور کی گئی۔

الندوہ کی کسی گزشتہ اشاعت میں مولوی ابو الحسن علی صاحب کی کتاب "مختارات" کا ذکر آچکا ہے، یہ عربی ادب و انشاء کا ایسا مرقع ہے جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار برس کے انشاء پردازوں کے کلام کے ایسے نمونے جمع کئے گئے ہیں جنھیں پڑھ کر اس عہد کی ادبی اور ذہنی تصویر نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے، کتاب پریس میں جاچکی ہے انشاء اللہ ستمبر کے آخر تک شائع ہو سکے گی۔

اردو زبان

کی

کتابوں کا سب سے بڑا مرکز

صدیق بک ڈپو لکھنؤ

ہے

جہاں سے سال میں بار دو کتابوں کی وہ خاص فہرستیں شائع ہوتی ہیں جنہیں اردو زبان کے قریباً دو ہزار مصنفین و مؤلفین کی کتابیں مع تعریف و قیمت درج ہیں

فہرست کلاں باتصویر مجلد حجم ۲۵۰ صفحات قیمت آٹھ آنے محصول ڈاک [illegible] آنے

فہرست خورد سادہ مجلد حجم ۲۶۰ صفحات قیمت چار آنے محصول ڈاک [illegible] آنے

[illegible] کا

صدیق بک ڈپو لکھنؤ

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

الندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتبہ

سید ابو الحسن علی ندوی

استاذ تفسیر و ادب

عبد السلام قدوائی ندوی

استاذ تاریخ و اقتصادیات

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہٗ

جلد ۲　شعبان المعظم ۱۳۶۰ھ مطابق ستمبر ۱۹۴۱ء　نمبر ۹

قیمت فی پرچہ تین آنے　　سالانہ دو روپیہ

تمام خط وکتابت اور ترسیل زر منیجر رسالہ الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہیے

شذرات

علمی اور دینی حلقوں میں مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی کی خبر وفات سخت رنج و افسوس کیساتھ سُنی جائیگی. مرحوم زہد و ورع میں سلف کی یادگار تھے. مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے نسبت ارادت ہی نہیں بلکہ والہانہ تعلق تھا جو تذکرۃ الرشید کے ورق ورق میں نمایاں ہے. علمی کاموں میں تذکرۃ الرشید اور مکاتیب رشیدیہ کے علاوہ قرآن مجید کا ترجمہ اور جمع الفوائد کی اشاعت خاص طور پر قابل ذکر ہے. ندوہ سے بھی مرحوم کا تعلق رہا ہے، ابتدائی زمانہ میں یہاں کچھ عرصہ تک درس و تدریس کی خدمت انجام دی ہے. خدا سے دُعا ہے کہ وہ اپنی رحمتوں سے سرفراز فرمائے.

یہ سطور ابھی ختم نہ ہونے پائی تھیں کہ یکایک مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نگرامی کے سانحۂ وفات کی درد انگیز اطلاع ملی، استاذ مرحوم مولانا عبد الرحمٰن نگرامی کے تعلق سے ہم اہل ندوہ کو مرحوم کی ذات سے ایک خاص وابستگی تھی، اسلئے انکی یہ وفات ہمارے لئے ایک ذاتی حادثہ کی حیثیت رکھتی ہے. مرحوم ایک سادہ مزاج صاف دل، پاکباطن اور نیک نفس بزرگ تھے، انکی سادگی، دینداری اور نیک نفسی سارے جوار میں ضرب المثل تھی. اسلام کی تبلیغ و اشاعت زندگی کا خاص مقصد تھا. اس سلسلہ میں اردو کے علاوہ ہندی میں بھی متعدد کتابیں لکھیں. عربی نبیؐ کا جیون چرتر اس سلسلہ کی ایک مشہو رکتاب ہے. قرآن مجید کا ایک ہندی ترجمہ بھی کر رہے تھے، لیکن افسوس کہ اسکی تکمیل سے پہلے ہی مصنف کا صحیفۂ حیات تمام ہوگیا. اس حادثہ پر ہمیں مرحوم کے اعزہ خصوصاً ان کے لائق فرزند مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب ندوی سے دلی ہمدردی ہے اور خدا سے دُعا ہے کہ وہ مرحوم کی یہ خدمتیں قبول فرمائے اور انھیں اپنی بخششوں اور نوازشوں سے سرفراز فرمائے.

اگست کے آخری ہفتہ میں مولانا محمد عمران صاحب انچارج مہتمم دار العلوم دہلی تشریف لے گئے مولانا سعد الدین صاحب ندوی کے یہاں جامعہ ملیہ میں قیام رہا۔ اس تقریب سے جامعہ کے مختلف تعلیمی اور تربیتی شعبوں کو دیکھنے کا موقع ملا، اساتذہ اور کارکنان جامعہ بڑے لطف و محبت سے پیش آئے مولوی سعید انصاری پرنسپل ٹریننگ کالج، مولوی عبد الجلیل صاحب ندوی اور مولوی عبد اللطیف صاحب ندوی کی عنایتیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں، شیخ الجامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی کرم فرمائیاں شکریہ سے بالاتر ہیں۔ مولانا سعد الدین صاحب ندوی کی لذیذ دعوتوں اور پُر لطف صحبتوں کی یاد مدتوں تازہ رہیگی۔ ایک دن مولوی محمد جعفری مدیر ملت کے یہاں بھی بڑے لطف سے بسر ہوا۔

دہلی کے اس سفر کا تذکرہ نامکمل رہے گا اگر جناب مولانا محمد الیاس صاحب کی عارفانہ صحبتوں اور بزرگانہ نوازشوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ کئی بار حاضری کا موقع ملا اور ہر بار دل نے ایک خاص لذت و اثر محسوس کیا۔ بستی نظام الدینؒ کی حاضری کے سلسلہ میں ایک دن جناب خواجہ حسن نظامی کے یہاں بھی جانا ہوا۔ خواجہ صاحب سے پہلی ملاقات تھی لیکن وہ اس محبت و اخلاق سے ملے کہ برسوں کے تعلقات کا دھوکہ ہونے لگا۔

دہلی سے واپسی میں علی گڑھ اور آگرہ میں قیام رہا۔ علی گڑھ میں مولانا اکرام اللہ خاں صاحب ندوی کی عنایتوں نے اس سفر کو حضر سے بدل دیا اور مسافرت میں گھر کا مزہ آنے لگا۔ آگرہ میں تاریخی آثار کی زیارت کے علاوہ دیال باغ کے صنعتی مرکز کے مشاہدہ کا بھی موقع ملا۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے یہ سفر بہت مفید رہا۔

میری محسن کتابیں

از جناب مولانا اعزاز علی صاحب شیخ الفقہ والادب دارالعلوم دیوبند۔

موقر و علمی رسالے "الندوہ" لکھنؤ میں ایک عرصہ سے عنوان بالا پر مضامین لکھے جا رہے ہیں، ملک کے ذی علم اور قابل فخر اہل قلم دلکش انداز اور موثر پیرائے میں اس پر طبع آزمائی فرما کر اردو ادب میں ایک نئے اور اچھوتے باب کا اضافہ کر رہے ہیں، سلاست بیان کے ساتھ ساتھ طبائع کی رنگینی نے بھی اس عنوان کو کچھ ایسا دلچسپ بنا دیا ہے کہ جدید مضامین تو بجائے خود قدیم مضامین کا اعادہ بھی قند مکرر سے کم نہیں ہوتا ہے حتیٰ کہ میں نے اپنے بعض سفروں میں بعض اہل علم کو والہانہ انداز میں اس کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے۔

میرے لئے ارشاد ہوا کہ میں بھی مذکورۂ بالا عنوان پر کچھ لکھوں، میں نے اس کی تعمیل بھی کرنی چاہی اور کئی بار کچھ لکھا بھی، لیکن جب کبھی تمہید کو ختم کر کے اصل موضوع پر عرض حال کا موقع ہوا تو اس خیال نے قلم کو آگے بڑھنے سے روک دیا کہ اس عنوان پر لکھنا انہیں اصحاب قلم کو زیب دیتا ہے جن پر کتاب نے احسان کیا ہو اور انہوں نے اہلیت کے ساتھ اس کے احسانات کو قبول کیا ہو، یا مشاہیر کے درجہ میں ہوں تاکہ ان کی آپ بیتی سامعین کو اپنا مشتاق بنائے، یہاں یہ حال ہے کہ تحریر مضمون کے شرائط ہی مفقود ہیں تو میری گذارش بے وضو کی نماز نہ ہوگی تو کیا ہوگا، مگر ارشاد ہوا اور مکرر ارشاد ہے کہ اس مضمون پر مجھ کو کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری ہے، پس اگر تعمیل نہ کروں تو کیا کروں۔

میرے سب سے بڑے بھائی حافظ تھے اور والدۂ مرحومہ سے سنا ہے کہ بہت اچھا قرآن پڑھا کرتے تھے، ان کی نو عمری کا آغاز ہی تھا کہ دوست احباب کی رائے سے والدین کی بلا اجازت الہ آباد پہونچ گئے اور پولیس کانسٹبل بن گئے، طبیعت صالح تھی، چند ہی سال کے بعد سب انسپکٹر پولیس ہو گئے، غالباً جس روز سے بغرض تلاش ملازمت نکلے قرآن شریف کی سورتیں کبھی نماز میں پڑھی ہوں تو پڑھی ہوں، تلاوت

کی غرض سے کبھی قرآن شریف ہاتھ میں نہ لیا۔

حفاظ سے سنا ہے کہ قرآن شریف کو یاد کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے، اسکو سینہ میں محفوظ رکھنا بہت زیادہ مشکل ہے۔ نتیجہ یہ ہوا اور یہی ہو سکتا تھا کہ سب انسپکٹری تو مل گئی مگر قرآن شریف یاد نہ رکھ سکے۔ مرحومہ والدہ کو اس کا بہت سخت صدمہ تھا، ان کے والد (میرے نانا) اگرچہ علما میں سے نہ تھے۔ مگر پرانے لوگوں کی طرح بہت زیادہ دیندار تھے۔ مجھ سے دو اور بڑے بھائی تھے انہیں سے ایک نے اردو مڈل پاس کیا اور ریاست گوالیار وغیرہ میں بتلاش روزگار تشریف لیگئے۔ میرے دوسرے بڑے بھائی نے عربی شروع کی اور وہ میزان الصرف سے آگے نہ بڑھنے پائے تھے کہ والد مرحوم کے ایک دوست سید محمد علی صاحب سررشتہ دار کے اصرار سے عربی چھوڑنے پر مجبور ہونے اور انگریزی میں انٹرنس پاس کیا۔

مرحومہ والدہ نے حفظ قرآن کے لئے مجھکو ایک سن رسیدہ اور معمر حافظ صاحب کے پاس بھجوا دیا اور میں حفظ قرآن میں مصروف ہو گیا۔

مجھکو یاد ہے کہ میں ایک روز اسی مکتب میں پڑھ رہا تھا جسمیں مجھکو حفظ قرآن کے لئے بٹھا دیا گیا تھا کہ اتفاقاً سید محمد علی صاحب مرحوم تشریف لائے۔ میں حافظ صاحب کے قریب ہی بیٹھا تھا مجھکو دیکھکر فرمایا کہ یہ بچہ کس کا ہے؟ حافظ صاحب نے فرمایا کہ منشی سراج علی (میرے والد کا نام ہی تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ صاحب میرے والد کے دوست ہیں، اس گفتگو کو سنکر اس امید پر ان کو دیکھنے لگا کہ یہ خوش ہوں گے اور میری حوصلہ افزائی فرمائیں گے، مگر خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم، سید صاحب مرحوم کا چہرہ غصہ سے تمتما گیا اور بگڑ کر بولے کہ سراج علی نے یہ کیا حماقت کی کہ اس معصوم بچے کو حفظ قرآن میں لگا دیا، کیا انکا یہ مقصد ہے کہ اسکو حافظ ہونے کے بعد قبروں پر تلاوت قرآن کی ملازمت کرنے اور فاتحہ کے حلوے کھانے پر مجبور کریں۔

میں اسوقت بہت ہی چھوٹی عمر کا تھا، بعض الفاظ میں توتلاپن بھی تھا، اکثر ان کو نقل کر کرکے میرے دوست مذاق کرتے تھے۔ اس کم سنی کے باوجود مجھکو یاد ہے کہ سید صاحب مرحوم کے یہ الفاظ مجھکو بہت زیادہ ناگوار گذرے، اور میں نے ان کے اس کلام کو توہین قرآن کے مرادف سمجھا۔

سید صاحب مرحوم خود انگریزی تعلیم یافتہ نہ تھے بلکہ شاید انگریزی کا ایک حرف بھی نہ جانتے تھے۔ پنج وقتہ نماز پڑھتے تھے، بعض مرتبہ انگریز حاکم کے سامنے پیش شدہ کاغذ کھلا چھوڑ کر نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں چلے آتے تھے۔ کچہری جاتے تھے تو عالمانہ وضع کا سیاہ جبہ پہن کر جاتے تھے اور غایت دینداری یہ تھی کہ اس علو مرتبت کے باوجود ایام محرم میں مہندی اپنے ننگے سر پر رکھکر اور ننگے پاؤں چلکر چڑھانے جایا کرتے تھے۔ آگے آگے باجہ بجتا تھا اور پیچھے وہ خود بہیئت کذائی مع اپنے مسلمان عملہ کے ہوتے تھے۔ اس نہایت ہی مقدس رسم میں میں نے بھی کئی سال شرکت کی ہے۔

غرض سید صاحب مرحوم کی اس نامحمود سعی نے کامیابی حاصل نہ کی اور میں حافظ قرآن کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اسکے بعد ہی میری آنکھوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ سید صاحب مرحوم کی پنشن ہوئی اور اس ضعیفی میں ان کو (خدا جانے کیوں) خیال آیا کہ ان کا چھوٹا بیٹا حافظ قرآن ہو۔

سید صاحب مرحوم صاحب ثروت تھے۔ اچھے اچھے استاد اس غرض کی انجام دہی کے لئے ملازم رکھے اور برسوں رکھے مگر انکی آرزو پوری ہی نہوئی، میرا تو ابتک یہی خیال ہے کہ شاید خالق عز اسمہ کو سید صاحب مرحوم کی وہ جاہلانہ توہین پسند نہوئی جو کلام قدیم کی ہو گئی۔

حفظ قرآن سے فراغت کے وقت میری عمر کیا تھی مجھکو صحیح یاد نہیں ہے، اسقدر ضرور یاد ہے کہ بعض بعض لوگ میری موجودگی میں میری طرف اشارہ کرکے فرمایا کرتے تھے کہ منشی جی (والد مرحوم) نے ازراہ تفاخر اسکو حافظ مشہور کر دیا ہے ورنہ ایسے صغیر السن بچے کا حافظ ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

ان صاحبوں کا یہ کہنا کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھا، کیونکہ میرے حفظ قرآن کی حقیقت اس سے

معلوم ہو سکتی ہے کہ پہلی دفعہ قرآن شریف تراویح میں سنانے کی تکلیف آج بھی مجھکو یاد ہے کہ رمضان المبارک میں سحور سے فارغ ہو کر قرآن شریف لیکر بیٹھ جاتا تھا، ضروریات انسانیہ کے لئے تو ضرور اپنی اس جگہ سے اُٹھتا تھا مگر نماز بھی اسی جگہ پر پڑھتا تھا جس قدر قرآن شریف یاد کرتا تھا، رات کے آخر حصہ سے یاد کرنا شروع کرتا تھا اور اسی چوکی سے تراویح کے وقت اُٹھکر مسجد چلا جاتا تھا، دو چار پارے پڑھے نہ ہوتے تھے صرف سوا پارہ سنانا ہوتا تھا اور وہ بھی اس شکل سے، اس صورت میں اگر لوگوں کو میرے حافظ ہونیکا انکار تھا تو بیجا نہ تھا۔

رمضان کی چھبیسویں تاریخ اور ستائیسویں شب میں قرآن شریف ختم ہوا، والدین کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا، میرے بڑے بھائی بھی خوش تھے ختم قرآن شریف کی اس رات کو اس طرح آرام کر سویا کہ سحر کے لئے مشکل سے اٹھایا جا سکا اور پھر سو گیا، مجکو یاد نہیں کہ میں نے اس روز صبح کی نماز پڑھی ہو والدہ مرحومہ خود بھی نماز کی پابند تھیں خصوصیت کیساتھ میری نماز کی نگرانی زیادہ کرتی تھیں، مگر میری تقریباً ایک ماہ کی محنت کا خیال یا کم عمری کا لحاظ جگانے سے مانع آیا، سو کر اُٹھا تو مکتب میں آیا اور اس اُمید پر آیا کہ آج مکتب کے بچے اور خود حافظ صاحب بھی میری تعریف کریں گے۔ مجکو یاد نہیں کہ حافظ صاحب نے میری موجودگی میں میری تعریف کبھی بھی کی ہو، مکتب میں حاضر ہوا تو ایک ساتھی نے آہستہ سے فقرہ چست کیا کہ چھبیس دن کے بعد گھر کے جیل خانہ سے انکی رہائی ہوئی۔ حافظ صاحب نے اپنی معمولی سادگی کے ساتھ فرمایا کہ اس حفظ قرآن کا کوئی فائدہ اسکے بغیر نہیں کہ حافظ اس کے معنی سے بھی واقف ہو اور معانی قرآن کا سمجھنا عربی پڑھنے ہی پر موقوف ہے۔

حافظ صاحب کی کرامت کہئے یا خدائی قدرت کا کرشمہ کہ میں نے اُسی وقت یہ عزم صمیم کر لیا کہ مجکو عربی پڑھنا ہے، اس سے واضح ہو گیا ہوگا کہ میرے عربی پڑھنے کا محرک قرآن شریف ہی ہے۔

یہ ہے میری ابتدا۔

حافظ صاحب جی نے فارسی کے سلسلہ میں مجکو آمدنامہ شروع کرایا، وہ فارسی کے ماہر نہ تھے مجکو یاد ہو کہ مجکو گلستاں پڑھاتے وقت مترجم گلستاں سامنے رکھکر ترجمہ کرایا کرتے تھے، اسی اثنا میں والد صاحب مرحوم کی تبدیلی قصبہ تمر کی ہوئی، میں وہاں پہونچکر مدرسہ گلشن فیض میں داخل ہوا، اس مدرسہ میں پچاس سے کچھ اوپر طلبہ پڑھتے تھے۔ ہر طالبعلم فیس ادا کرتا تھا اور جنگی سے بھی غالباً آٹھ روپے ماہانہ بطور امداد ملا کرتے تھے، اس مدرسہ میں ایک ہی مدرس جناب مولوی مقصود علی خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، انکی صرف و نحو بہت اچھی تھی، طرز تعلیم اسی طرز کا تھا جس طرز کا اب سے ساٹھ ستر برس قبل پنجاب یا صوبۂ سرحد میں سنا گیا ہو، میزان الصرف تو اول سے آخر تک بالفاظ یاد تھی، منشعب کے ابواب اور صرف صغیر محفوظ تھے۔ زبدہ بھی بالفاظہا یاد تھا، نحو میں، نحو میر، اور کافیہ کے آخر کے چند اوراق کے علاوہ پورا کافیہ یاد تھا۔ اور اسمیں اسقدر شغف تھا کہ اکثر اوقات سونے کی حالت میں بجائے قرآن شریف کے میزان الصرف یا نحو میر کے الفاظ زبان سے نکلا کرتے تھے میں نے گلستاں بھی از سر نو شروع کی تھی، اس مدرسہ میں گلستاں کی جماعت بہت سے فارسی قواعد کے بعد گلستاں پڑھ سکتی تھی، مگر خدا کا شکر ہو کہ مجکو قواعد سمجھ لینے کے بعد گلستاں میں زیادہ دشواری نہ ہوئی، اسی اثنا میں والد مرحوم کی پنشن ہوئی اور میں پھر شاہجہاں پور آگیا، اسوقت میری تعلیم کے نگراں ایک ایسے بزرگ تھے جو عربی تعلیم سے قطعاً ناواقف تھے، ان کی نگرانی کے نقصان ہی نے میرے کئی سال ضائع کردیے، اپنی عمر کو ضائع بھی کرتا تھا، مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ میں اپنی عمر ضائع کر رہا ہوں آخر ایک تدبیر سمجھ میں آئی اور نگرانی کرنیوالے بزرگ سے میں نے کہا کہ میری فارسی کی کتابیں باقی ہیں۔ جن صاحب کے پاس آجکل پڑھ رہا ہوں ان کے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہو اور شاید وہ فارسی نہ بھی پڑھائیں، اسلئے سکندر نامہ پڑھنے کی اجازت مجکو دیجائے کہ مدرسہ عین العلم واقع شاہجہانپور میں داخل ہو کر پڑھ لوں، حسن اتفاق سے یہ اجازت مل گئی، مدرسہ میں پہونچا تو وہاں کسی استاد کے پاس

زیادہ وقت بھی نہیں رہتا۔ میری جد وجہد سے میری حالت پر رحم فرماکر حضرت مولانا الحاج المفتی محمد کفایت اللہ صاحب مہتمم مدرسہ امینیہ دہلی نے آدھا گھنٹہ سکندر نامہ پڑھانے کے لئے عطا فرمایا میں نے اسی کو غنیمت سمجھا، چند ہی مہینوں کے بعد اساتذہ کی شفقت نے دو مدرسوں کے چھ گھنٹے ایک جماعت میں داخل کرکے مجھے دیدئے۔ اب میری عربی کتابیں بھی اس مدرسہ میں ہونے لگیں، اساتذہ کی اس عنایت نے ہماری جماعت کو یہ محسوس ہی نہ ہونے دیا کہ تحصیل علم میں طلبہ کو کیا کیا دشواریاں پیش آتی ہیں ہم آزاد تھے پڑھنے وقت جو چاہتے تھے دریافت کرتے تھے۔ پڑھنے کے بعد مدرسہ میں رفع شکوک تو معمولی بات تھی جب چاہتے تھے گھروں پر پہونچ جاتے تھے، اور حضرت مولانا سید لشیر احمد صاحب مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کو نوبت مرتبہ سوتے سے اٹھاکر کتابوں کی عبارتوں کا مطلب دریافت کرنیکی نوبت آئی ہو۔ قاد مطلق تلکی قبر کو انوار رحمت سے بھرے، انکو ہمارا ہر اس طرز سے کبھی کوئی دل تنگی نہوتی تھی، خارج از اوقات مدرسہ شمس وقایہ مکمل حضرت مفتی صاحب دہلوی مدظلہ نے دوپہر کا سونا چھوڑ کر پڑھائی ہو۔

اس اثنا میں میرے لئے ایک اور عجیب واقعہ یہ پیش آیا کہ گھر کے قریب ہی بازار تھا، اسمیں آریہ عطار کی دوکان تھی، اسکی عمر غالباً ساٹھ برس سے کم نہوگی، میں جب کبھی اسکی دوکان پر جاتا تھا تو تھوڑے سے وقت میں بہت سے اعتراض اسلام پر اور سیرت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر کرتا تھا، ان اعتراضوں کو بیچین ہوکر میں اپنے استادوں سے جواب حاصل کرنیکی کوشش کرتا تھا، قرآن شریف کی فصاحت و بلاغت کا مسئلہ میرے لئے لاینحل مسئلہ ہوگیا تھا، صرفی نحوی شذوذ قرآن میں موجود تھے ہی، مختصر المعانی اسوقت تک اگرچہ نہ پڑھی تھی، مگر فارسی قواعد تو معلوم ہی تھے، اسی حالت میں میں دارالعلوم دیوبند پہونچا، کچھ عرصہ کے بعد ضروری کتابوں سے فارغ ہوکر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے بیضاوی شریف شروع کی، سورۂ بقرہ کے اول ہی میں حروف مقطعات کی بحث ہو، گو حضرت قدس سرہٗ کی تقریر تو یاد نہیں اور میرا خیال یہ ہے کہ اسکو سمجھنے کی مجھ میں اہلیت بھی نہ تھی، مگر اسقدر یقینی ہو کہ وہ پہلا دن تھا جسمیں قرآن شریف کی طرف سے

یہ تھا ایک شک جو میرے دل سے دُور ہوئی۔

یہ ہے میری انتہا!

اب غالباً میری گذارش سے واضح ہو گیا ہو گا کہ میرے علم ظاہری کا سبب بھی قرآن شریف ہے اور عقیدہ کی طہارت ونظافت کا سبب بھی قرآن شریف ہی ہے۔

قیام دار العلوم دیوبند میں ایسی حالت میں کہ میں نور الانوار پڑھتا تھا اور ایک اور صاحب شریک درس تھے، مجکو مقامات حریری پڑھانے کے لئے تیار ہوئے، انکی تعلیم نے علوم عربیہ سے محبت پیدا کر دی اور تو کچھ آیا نہیں مگر ادب کی عظمت دل پر اسقدر ہو گئی کہ حسن ظن رکھنے والے مجکو ادیب کہتے ہیں اور میں اپنے دل ہی دل میں کہا کرتا ہوں ؎

وہ صاحب آفتاب کہاں اور ہم کہاں احمق نہیں ہم اسکو نہ سمجھیں اگر غلط

میں نے عرض کیا تھا کہ میری نحو وصرف کی تعلیم ایک ایسے استاذ سے ہوئی ہے جو اس طرز کے معلم نحو جس طرز کے معلم قدیم زمانہ میں صوبہ سرحد یا پنجاب میں ہوتے تھے یعنی مشکل صیغوں کی باقاعدہ تعلیلیں پیچیدہ عبارتوں کی باضابطہ ترکیبیں پوری پابندی کے ساتھ ہوا کرتی تھیں، اسلئے میں شرح جامی کو ختم کر لینے تک بجز درس نظامی کی نحوی کتابوں کے اور کسی کتاب کا مطالعہ نہ کر سکا۔

دار العلوم دیوبند سے فارغ ہونیکے بعد حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ نے مدرسہ نعمانیہ واقع پورینہ ضلع بھاگلپور کے مدرس ادبی کے لئے مامور فرمایا تو وہاں کچھ موقع ملگیا کہ قومی مدارس کی غیر درسی کتابوں کا مطالعہ کروں، اس زمانہ میں میں نے مفصل کو بھی دیکھا، اور اوضح المسالک کا مطالعہ بھی کیا۔ اور اسی زمانہ میں الفیہ کی شرح ابن عقیل کو بھی دیکھا۔ زمخشری کی علمی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ میں مفصل کے مقابلہ میں کسی کتاب کا نام نہ لوں، مگر اسوقت جو عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مجکو دلچسپی کس سے ہوئی۔

سچ یہ ہے کہ میں نے افادی حیثیت سے اوضح المسالک کو مفصل پر ترجیح دی اور اسکے بعد

جب ابن عقیل کا مطالعہ کیا تو مجکو اس سے محبت ہوگئی، اس کتاب کو میں نے متعدد بار دیکھا اور چاہا کہ طلبہ اس کتاب کو پڑھیں، مگر مدرسۂ نعمانیہ مذکورہ ایک انجمن کے ماتحت تھا. اراکین انجمن سے حصول اجازت کے بغیر اس ارادے پر عمل کرنا خلاف ضابطہ تھا، اور وہاں کے قدامت پسند ممبر اسکی اجازت نہ دیتے تھے، اسلئے میں کامیاب نہوا۔ دار العلوم دیوبند میں حاضر ہوا تو اپنے بڑے لڑکے کو پڑھانے کا موقع ملا، اس سلسلہ میں میں نے ایک جماعت کو ابن عقیل کی شرح پڑھائی، اور میرا خیال یہ ہے کہ پڑھنے والونکو بہت زیادہ نفع پہونچا، اور اسیطرح میں نے اسکو خارج از اوقات مدرسہ کئی دفعہ پڑھایا۔ ابن عقیل کے اخلاص کی برکت کہ جس نے اسکو پڑھا وہ اس کا شیدا ہوگیا، آجکل بھی ہمارے یہاں ایک صاحب اطراف بمبئی کے ساکن جو انگریزی میں ایم اے ہیں، دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور مولوی فاضل پنجاب، کو معقول تنخواہ دیکر میزان الصرف پڑھتے پڑھتے ابن عقیل تک پہونچے ہیں، اُن کی تعلیم میں میرے مشورہ کو بھی دخل ہے، وہ ایک دفعہ فرماتے تھے کہ مجکو تو ابن عقیل کا ایک ایک لفظ پیارا معلوم ہوتا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ میرے نزدیک ایک زمانۂ دراز تک سلاست بیان مقاصد نحویہ کی تکمیل اور حسن تفہیم میں ابن عقیل کی نظیر نہ تھی، دار العلوم دیوبند کی حاضری کے بعد حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب [illegible] کی ہدایت سے میں نے کتاب سیبویہ کا مطالعہ کیا، اور آج تک چار دفعہ اُس کا مطالعہ کر چکا ہوں۔

اب میرا عقیدہ یہ ہے کہ کتاب سیبویہ ہی ایک ایسی کتاب ہے جو طالب العلم کے سامنے نحو کے تمام علمی ذخائر رکھدیتی ہے اور متعلم اپنی قابلیت کے موافق اس سے بہت کچھ حاصل کرسکتا ہے۔

طلبہ کے درس میں اسکو داخل کردینا تو شاید غیر مفید بلکہ مضر ہو، لیکن شاید یہ نامناسب نہو کہ جسوقت طالب العلم میں کافیہ و امثالہا کے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو جاوے طالب العلم کے مطالعہ میں یہ کتاب رہے اور کافیہ کے بجائے شرح ابن عقیل کو رکھا جاوے۔

نصاب کے متعلق میری ایک مستقل گذارش ہے، اگر موفق حقیقی نے توفیق عطا فرمائی تو کسی فرصت

فرصت میں الندوہ کے اہل علم ناظرین کی خدمت میں پیش کروں گا تاکہ اگر ان پریشان خیالات میں کوئی چیز عمدہ ہو تو عمل فرمائیں ورنہ کالائے بد بریش خاوند۔

ادب کے سلسلہ میں مجکو معذور سمجھا جاوے اگر میں یہ عرض کروں کہ "معشوق من ست آنکہ بنزدیک تو زشت است۔" عصر حاضر کے علما مقامات حریری سے ناراض ہیں، صوبہ آسام کے سرکاری عربی مدارس کے ممتحن ہونیکی حیثیت سے مجکو علم ہو کہ ..ان میں ظلوم کتاب صرف پانچ مقاموں تک داخل ہو، انتخاب سوالات کے وقت میں اکثر متعجب ہوتا تھا کہ مقامات حریری کے ان چند اوراق کو داخل کرنیکی بھی کیا ضرورت تھی؟ اگر تبرک ہی حاصل کرنا تھا تو طلبہ کو انکی فقط زیارت کرادی جاتی۔ اب سنا ہو کہ پنجاب یونیورسٹی نے بھی اس خیر الاتجر کو اپنے نصاب میں جگہ دیدی ہے۔

اسی پر بس نہیں بلکہ بعض حضرات تو حد و ادب سے متجاوز ہو کر کتاب و مصنف کتاب کی نسبت سقیم الفاظ استعمال کرنے سے بھی دریغ نہیں فرماتے ہیں، لیکن میں مقامات حریری کا مداح ہوں اور سمجھتا ہوں کہ خزانۂ معانی لغات، اور لغات کے مختلف استعمالات، علم بدیع کے تفننات وغیرہ کی حقیقت جسطرح یہ کتاب وا شگاف کرتی ہے، دوسری کوئی کتاب اسکے مساوی میرے علم میں نہیں ہے، اسلئے کم از کم بچیس مقالے داخل درس ضرور رہیں، اسی کے ساتھ تاریخ یمینی کا کوئی معتد بہ حصہ بھی داخل درس رہنا ضروری ہے۔

متاخرین کے دواوین میں دیوان بحتری کو بارہا ذوق و شوق سے دیکھا، لیکن بالعموم شعرائے جاہلیت کے کلام* میں ان اوصاف کو محسوس نہ کرسکا، شعرائے جاہلیت میں امرأالقیس کا کلام مجکو زیادہ پسند ہو، متاخرین شعراء میں ابو العلا معری کی سقط الزند مع اسکی شرح تنویر کے نیز ابن فارض کے قصائد آج بھی میرے سرہانے رکھے ہوئے ہیں، بہت سے علما سوتے وقت ادعیۂ ماثورہ پڑھکر سوتے ہوں گے اور (افسوس) میں ان کے اشعار کا مطالعہ کرتے ہوئے سوتا ہوں۔

* [illegible]

ادب کے لئے میرے خیال میں جس طرح صرف و نحو ضروری ہیں اسی طرح معانی و بیان بھی ضروری ہیں

معانی کے مصطلحات اور مختصر سی حقیقت سامنے آجانے کے لئے مختصر معانی (جو ہمارے قومی مدارس میں متداول ہے) پڑھ لینا طالبعلم کے لئے ضروری ہے، اسکے بعد دلائل الاعجاز یا مطول کا مطالعہ کافی ہے۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ طلبا کو اولاً سہولت اور اختصار کے ساتھ فن اور مصطلحات فن سے روشناس کرا دیا جائے اور اسی اثنا میں اساتذہ اپنے اثرات سے کام لیکر متعلمین میں وہ اہلیت پیدا کر دیں کہ جسکی وجہ سے طلبہ شوق و رغبت مدرسہ میں آیا کریں اور ان کے تخیل میں مدرسہ اور جیلخانہ دو جدا جدا چیزوں کا نام ہو، اسباق کے اوقات ان کے لئے قیدی کی مشقت کے اوقات کا نام نہ ہو، بنا بریں طلبہ جس وقت طلبہ میں مفردات لغت کو سمجھنے کی اہلیت پیدا ہو جائے ان کو اہل لغت کا مختصر طرز سمجھا کر مختار الصحاح یا اس جیسی کسی دوسری کتاب کا مطالعہ کرایا جاوے اور جب انہیں عربی دانی کی وسعت ہو جاوے تو منتہی الارب اسکے بعد لسان العرب سے کام لینا سکھایا جاوے۔

اقرب الموارد پر زیادت تسہیل کے باوجود مجھکو بہت سے شبہات ہیں، اور منجد (جو آجکل قومی مدارس کے اکثر طلبہ کے پاس موجود ہے) بھی میرے نزدیک لغات جدیدہ کے لئے تو ایک حد تک مفید ہے مگر عربیت قدیمہ خصوصاً تفسیر و حدیث میں اس سے استمداد زہر لے ہوئے شہد سے کم نہیں ہے۔

حضرت الاستاذ مولانا الحاج الحافظ محمد احمد صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند قدس سرہ جب عدالت عالیہ حیدرآباد دکن کے منصب افتا پر فائز ہوئے تو اعزاز علی بھی ہمرکاب تھا، فتاوی نویسی کا تعلق پہلا ہی تھا، اُس زمانہ میں مجکو مجلہ عدلیہ اور المعجم الواضح فی البینات الراجحہ سے بہت مدد ملی جسکی وجہ سے میں آج بھی ان کے مصنفین کو دعائیں دیتا ہوں۔ اول الذکر کتاب تو آج بھی میرے پاس ہے اور کوئی نایاب کتاب نہیں ہے، سنا ہے کہ کسی عیسائی نے اسکی شرح بھی کی ہے۔ اس شرح کے ذریعہ سے حوالے بکثرت مل جاتے ہیں، مگر مؤخر الذکر کتاب جس کو فقہ کی انسائیکلوپیڈیا کہنا ناموزوں نہیں کمیاب ہے، ان دونوں کتابوں کا تعلق معاملات سے ہے

وسعت نظر کے لئے شاید یہ دونوں کتابیں معین نہ ہوں، مگر قضا کے مسائل بہت آسانی سے مل جاتے ہیں، وسعت نظر کے لئے میرے خیال میں بدائع سے عمدہ کتاب کوئی نہیں ہے۔

شرح وقایہ کا اگر میں بالکل ذکر ہی نہ کروں، کیونکہ پڑھنے کے بعد بار بار پڑھانے کی نوبت آئی لیکن اپنی عدم اہلیت کی بنا پر میں اُس سے زیادہ مستفید نہ ہو سکا تو کوئی حرج نہ ہوگا۔

شرح نقایہ دو ہیں۔ ایک مُلا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی، دوسری شمنی کی، مؤخر الذکر نسخہ قلمی دار العلوم دیوبند کے کتبخانہ میں ہے، اول الذکر قازان میں طبع ہوا۔ ہندوستان میں میں نے کئی جگہ نقلیں بھی دیکھیں مگر غالباً سب مطبوعہ قازان ہی سے منقول ہیں، کیونکہ اغلاط فاحشہ میں منقول اور منقول عنہ برابر ہیں۔ ایک نسخہ میرے پاس بھی ہے جسکو میں مدینہ منورہ سے خرید کر لایا تھا۔ وہ بھی مطبوعہ قازان ہی ہے ہندوستان میں اُسکی صرف ایک جلد تا آخر کتاب الحج طبع ہوئی ہے، دوسری تا آخر کتاب الوقف زیر طبع ہے۔

شرح نقایہ کے اس نسخہ کے متعلق میری تحسین اگرچہ ناشناس کی تحسین کیوں نہو مگر میں تو اس کو ملا علی قاری رحمہ اللہ کے علوم کا طغرائے امتیاز سمجھتا ہوں، تقلید جس غلط معنی میں ہندوستان میں شائع ہو گئی ہے اسکا ازالہ اسی کتاب سے ہو سکتا ہے، میری رائے ہے کہ ابتدائے طفولیت ہی سے بچوں کو اخلاق و تصوف کی طرف مائل کیا جاوے، یہ امر آخر ہے کہ عملی ہو کتابی نہ ہو اور ان کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ اس تعلیم کا بھی نشو و نما ہو۔

مجکو اپنی کسی قریبی گذارش میں بسلسلۂ اصلاح نصاب اسکے متعلق اپنے خیالات کو تفصیل کیساتھ پیش کرنا ہے، اسلئے اسوقت صرف اسپر ختم کرتا ہوں کہ اگر ریاض الصالحین جسکے مؤلف علامہ نووی ہیں داخل نصاب نہ کیجا سکے تو کم از کم درجہ وسطانی کے طلبہ پر اسکا مطالعہ لازمی کر دیا جاوے۔ امام غزالی رحمہ اللہ کی تصنیفات کا مطالعہ میں اُن طلبہ کے لئے مفید سمجھتا ہوں جو فنون درسیہ سے واقف ہو چکے ہوں۔

یادِ ایام

(۹)

از مولانا ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی ایم۔ اے۔ انسپکٹر مدارس عربیہ الٰہ آباد

کبھی کی باتیں کرکے یاد اب جو دل بہلتا ہے
تاثر لذت و غم کا اُبھر کر دل کو مَلتا ہے

اگرچہ لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا ہی اجلاس زیرِ صدارت جناب مرحوم و مغفور منشی امتیاز علی صاحب قبلہ ہو چکا تھا مگر اب داعیان بالخیر کی دعوت پر پھر سلسلہ میں اسکا اجلاس لکھنؤ میں ہوتا ہو. لکھنؤ تعلقداریوں سے بگڑا رہا ہے. جناب مرحوم مغفور کی بدولت پرانے تعلقدار کچھ متوجہ ہو کر رہ گئے اور وہ بھویال تشریف لیگئے ورنہ علی گڈھ کی کانی تبلیغ اس گروہ میں ہو جاتی یہ گروہ گورنمنٹ کے چندوں کا عادی تھا اور اس کا سارا روکا رکھا رسرکار رہتا. اس ہی باہر کی پبلک زندگی سے وہ محض نا آشنا تھا بعد انکے راجہ نوشاد علی خاں صاحب تعلقدار میلارائے گنج بڑے دریادل، کھونٹ، زمانہ شناس اور تعلقداروں میں جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے، خود تعلیم یافتہ تھے اگرچہ سند یافتہ نہ تھے وہ اُردو کے اچھے شاعر تھے اور انگریزی لٹریچر پر نظر رکھتے تھے مشرقی ادبیات سے بھی انکو خاصی دلچسپی تھی انگریزی سوسائٹی اور اسکے لوازمات کے شوقین ماہر تھے اور انگریزوں کے انگریز تھے مگر رعونت سے پاک تھے، وہ علی گڑھ کے ٹرسٹی بھی تھے نواب محسن الملک جب لکھنؤ آتے تو انھیں کے یہاں ٹھہرتے. ویسے تو جناب منشی احتشام علی صاحب قبلہ کا گھر اسوقت ہر قومی تحریک کا مرکز تھا مگر اسمرتبہ سکریٹری ایجوکیشنل کانفرنس کی آسانی کی غرض سے نوشاد مرحوم کا گھر کانفرنس کا مرکز قرار پایا. یہ زمانہ وہ ہو کہ جارہے مہاراجہ صاحب محمود آباد نئے نئے گدی نشین ہوئے ہیں قیصر باغ ان کے وجود سے باغ و بہار ہو رہا ہو انکی صحبت جدید تعلیم یافتہ

لوگوں سے بھری ہوئی جس کا دل قومی خدمت کی طرف آرہا ہے۔

پٹنہ کانفرنس بڑے آب و تاب سے شروع ہوگئی۔ گلی گلی، گھر گھر اسکا چرچا ہو۔ جناب منشی امتیاز علی صاحب قبلہ کے زیر اہتمام دیگیں کھنکنے لگیں۔ لکھنؤ کے رکابدار کانفرنسی مہمانوں کی ضیافت کو مستعد ہوگئے۔ اگرچہ بہتر ہے کانفرنسیوں کو کچھ نا گوار ہو۔ منشی امتیاز علی صاحب مرحوم نے کھلایا تھا اسکو یہیں سے ہو شوق کو یکی دو وجہیں تھیں۔ اول تو وہ ایک دریا دل کی نفسی فیاضی تھی دوسرے اب وہ لکھنؤ کا بدار لکھنؤ میں کم ان میسر تھے۔ دیگ پندرہ کی محدود رقم کا کفیل تھا، تاہم مہمانوں کو انگلیاں چاٹتے ہی دیکھا۔ والنٹیروں کی دوڑ دھوپ شروع ہوگئی، مہمان قیصر باغ کے چاروں طرف کی عمارتوں میں آآکر اترنے لگے۔

جلسے کا رہیں رکاوٹ کچھ نہ تھی اسکا زور بڑھتا دیتی ہو۔ نہ جانے یاد نہیں آتا کس بات پر علماء فرنگی محل بھڑک گئے۔ لکھنؤ کے عمائدین نے لاکھ کوشش کی اور منانے میں نواب محسن الملک کیا کم تھے مگر وہ روٹھے تو ایسے روٹھے کہ کسی کے منائے نہ منے اور خفا ہوکر آخر اپنا آلۂ حرب یعنی فتویٰ کانفرنس کے خلاف سر ہی کردیا۔ اب کیا تھا، ایک ہنگامہ برپا ہوگیا گھر گھر کی رونق۔ اور اس بزدلی کے زمانہ میں ہنگامہ نام ہے صرف زبانی جمع خرچ کا ورنہ اگر شاہی ہوتی تو تلواریں ضرور کھنچ جاتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ کی پبلک دو دل ہوکر رہ گئی ورنہ لکھنؤ والوں سے بڑھکر ایسے جلسوں کا قدر افزا اور دوسرا کون ہوسکتا تھا۔ جدید تعلیم یافتہ گروہ کی نظر میں فرنگی محل کی بھد ہوگئی۔ ادھر کانفرنسی پہلوان بھی کچھ کم نہ تھے، ابھی ابھی رنگون سے اسی قسم کی بازی جیت کر آئے تھے، انھوں نے اپنے چشم و ابرو پر بل نہ آنے دیا۔ نواب محسن الملک مرحوم نے تو گفتہ آید در حدیث دیگراں کے اصول پر ایک تقریر میں اپنی تشفی کرلی مگر شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد جنکو اودھ پنچ نے قومی بھانڈ کا خطاب دیا تھا کس کی مان کے تھے خود بڑے جنگی مولوی تھے آواز وہ گھن گرج اور پاٹدار کہ سفید بارہ دری میں تقریر کرتے

نور روشن الدولہ کی مسجد میں تھا تو آزاد کیا عجب جو کہ علماء نے وہیں سے تعصب کرکے بھی لی ہو، انھوں نے اپنی بساط بھر اور بساط تو ان کے لئے کم ہو بلکہ اپنے حوصلہ بھر علماء کو خوب ہی لتاڑا۔ اس سال کانفرنس کے صدر علی گڑھ کے پُرانے رفیق اور پرنسپل مسٹر مارسن اپنی خدمات کے اعتراف میں الوداعی طور پر قرار پائے تھے۔ کانفرنس کی استقبالیہ کے صدر مہاراجہ صاحب محمود آباد تھے۔ اور یہ خطبۂ صدارت انکی پہلی پبلک تقریر تھی، اودھ پنچ نے تو اپنے انداز میں لکھا تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بیگم کے جنازے کے سامنے تحت اللفظ پڑھ رہے ہیں۔ مگر اسکو کیا معلوم تھا کہ یہ قومی شیر آگے بڑھکر تمام ہندوستان بھر کو ہلا دے گا اور ہندو مسلمان دونوں اسکے سامنے سر جھکائیں گے۔ یہ کانفرنس بیرولے تو گھر کا کھیل تھی، ہر جگہ پہونچ جاتا ایک ایک سے ملتا، نواب محسن الملک تو پہلے سے واقف تھا اس زمانہ میں علی گڑھ میں سائنس کے شعبہ کو ترقی دینا منظور تھا ایسے لوگ کم تھے جو بغیر مذہبی فتوے ہی حاصل کئے اسکی طرف ہاتھ بڑھاتے، سائنس کے لفظ سے لوگ بھڑکتے تھے اور اسکو غارتگر دین و ایمان سمجھتے تھے، اس لئے کانفرنس میں چند تقریریں مذہب اور سائنس کے اوپر بھی ہوئیں اسی ضمن میں نواب محسن الملک مرحوم نے ندوہ کا ایک طالبعلم کہکر مجھکو بھی پیش کیا اور میں نے اس موضوع پر تقریر کی، میرے ہاتھ میں کچھ نوٹ تھے، کانفرنس والوں نے وہ مجھ سے لے لئے مجھے تمیز نہ ہوئی کہ یہ چھپیں گے ورنہ تقریر لکھکر پڑھتا، اگرچہ یہ گناہ میں نے تمام عمر کبھی نہیں کیا چنانچہ انکی بدمذاقی دیکھئے کہ وہی نوٹ انھوں نے کانفرنس کی روداد میں چھاپ دیے۔ خود نواب محسن الملک مرحوم نے اسی موضوع پر ایک پُرلطف تقریر شب کو کی۔ اس تقریر کی لذت آجتک یاد ہو، انکی تقریریں فرید وجدی کا مواد، بہت کچھ تھا۔ نواب محسن الملک مرحوم شیعوں میں تو آیات بینات کے مصنف ہونیکی حیثیت سے مولوی ماننے جانیکے قابل ہیں اور نیچریوں میں تو علمی حیثیت سے یہی سرسید کا داہنا ہاتھ تھے۔ ساری عمر باوجود معروفیت کے اور حیدرآباد کی معروفیت ان کا مطالعہ ہمیشہ جاری رہا۔

جس زمانہ میں حیدرآباد نہیں گئے تھے اور سرسید کا سایہ ان پر نہیں پڑا تھا وہ مین پوری میں تحصیلدار تھے

ان کے شوقِ مطالعہ کا حال اپنے بزرگوں سے سنا ہے جناب محسن کاکوروی وہاں وکالت کرتے تھے. ان کا آبائی کتب خانہ وسیع تھا. نواب صاحب دن کو تو کام کرتے اور شب کو مولوی محمد محسن صاحب کے گھر آکر کوٹھے پہ جہاں ان کا کتب خانہ تھا، ایک لالٹین لیکر چلے جاتے اور فجر کے وقت اُترتے، اس کو کہتے ہیں شوق اور محنت! انگریزی برائے نام جانتے تھے مگر یورپ سے پورے یورپین بنکر ہو آئے تھے حیدرآباد میں اپنے زمانۂ قیام میں علی گڑھ کا کوئی قابل گریجوٹ اپنا ادبی سکریٹری بنا کر رکھتے یہ خدمت مرحوم خواجہ غلام الثقلین نے بھی انجام دی تھی، وہ انگریزی سے علماء و حکماء مغرب کی کتابیں ان کے ذاتی مطالعہ کے لئے ترجمہ کرتے خواجہ صاحب نے ایک مرتبہ بسبیلِ ذکر بیان کیا تھا کہ گازو کے فلسفۂ تاریخ کا ترجمہ انگریزی سے انھوں نے نواب صاحب کے لئے کیا تھا. نواب صاحب کا مضمون تہذیب الاخلاق میں ابن خلدون پر خوب ہے جو ان کے اس قسم کے مطالعہ کا پتہ دیتا ہے، باوجود اپنی سیاسی اور قومی مصروفیتوں کے وہ اہل علم اور صاحب ذوق آخر عمر تک بنے رہے.

شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد سے کون لڑکا یا لڑکی ہے جو ناواقف ہوگا، انکی تصانیف کے علاوہ ان کے لکچروں کا مجموعہ بھی پڑھا تھا. اگرچہ دلی نژاد نہ تھے. رہنے والے تو یوپی کے تھے مگر دلی کچھ ایسی بھاگئی کہ وہیں کے ہو رہے. انسے گفتگو کرکے یہ بات کھلتی کہ کہتے تو ہیں دلی کی زبان مگر باتوں میں وہ شہری لوچ اور کشش نہیں بلکہ مولوی پن زیادہ نمایاں تھا. علامہ فرماتے تھے کہ مولانا اعظم گڈھ میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے میں جب لاہور سے مولانا فیض الحسن صاحب سے ادب پڑھکر واپس ہوا تو فرمانے لگے "ابھی تم تو بڑے گرگے نکلے میرے اُستاد سے بھی پڑھ آئے." اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فیض الحسن صاحب کے شاگرد تھے! ادبیت کا نمونہ الندوہ کی منقبت میں دیکھ لیا جسمیں ذرا لینت نہیں ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ کھرے مولوی تھے اور وسعت نظر سے جو پرداخت ذہنی ہوتی ہے اس سے محروم تھے، جو کچھ پڑھا تھا وہ سب یاد تھا. بڑے قد آور آدمی تھے، داڑھی گھنی نہ تھی اور قدرتی فرنچ کٹ ہو کر رہ گئی تھی

رنگ سانولا تھا، جسم دُہرا تھا، ہڈیاں بڑی چکلی چوڑی، انگریزی سے خوب واقف تھے، بولنے میں بھی مکالمے کی سوجھ کو شرمندہ کرتے تھے۔ انکی جوش بھری گفتگو مولویوں کے متعلق جب انکو فتوی پر التہاب ہوا سننے کے قابل تھی۔ تقریر ہی میں کون دقیقہ اُٹھا رکھا تھا اور ریج کی گفتگو میں اس سے زیادہ بھرے۔ ان سے کانفرنس بھر ملتا رہا۔ علامہ کے ندوہ آجانے سے وہ بہت خوش تھے۔ علامہ کی ایک خاص منزلت ان کے دل میں تھی اسوقت علامہ کے نہونے کا ان کو قلق تھا مگر وہ کچھ علیل تھے اور طبی مشورہ کی بنا پر جوبالی کی آب و ہوا کا لطف اُٹھا رہے تھے۔

اس کانفرنس میں سب سے پہلے لاہور کے جتھے میں میر نیرنگ قبلہ سر محمدؐ اقبال شیخ محمدؐ اکرام سے مُلاقات ہوئی۔ ہاں سر عبدالقادر بھی تھے مگر میں ان کو پہلے سے جانتا تھا۔ ان لوگوں کو لکھنؤ کے دیکھنے کا بہت شوق تھا مگر بات بات پر یہ ضرور کہتے تھے کہ دیکھئے اُردو ہماری زبان نہیں ہو مگر ہم کو اُردو پر کتنی قدرت ہے۔ وہ وقت ان لوگوں کے جوانی سے بھرے ہوئے جوش کا تھا معلوم ہوتا تھا کہ ادبی دُنیا کو ہلا ڈالیں گے اور ایک حد تک سچ بھی کر دکھایا، مخزن کی برابر کس رسالے نے استقلال کے ساتھ اُردو کی خدمت کی، مگر سر عبدالقادر جوانی میں بھی نہایت سمٹے ہوئے آدمی تھے اور ایسے جوش کے اظہار سے بری تھے۔ لکھنؤ کی سیر میں ان لوگوں کی ایک ملاقات منشی سجاد حسین مرحوم اڈیٹر اودھ پنچ سے بھی ہوئی۔ اب اگرچہ لقوہ اور فالج کے دوروں کی وجہ سے انکی زبان وہ طرارے نہیں بھرتی تھی اور نہ قلم ہی میں وہ تیزی باقی رہگئی تھی، بمشکل کچھ کہہ دیتے تھے مگر ذہن کی رَوانی میں کوئی کمی نہ تھی، ان لوگوں کی تھوڑی تعلّی کا اظہار وہاں بھی ہوگیا، بھلا ان کا ذہنی بانکپن یہ کب برداشت کرسکتا تھا۔ آخر ایک صاحب سے مخاطب ہو کر بولے "واللہ آپکی نظم ٹوپی پر بہت خوب تھی اب کی لنگوٹی پر طبع آزمائی فرمائیے گا۔" وہاں سے جب یہ لوگ باہر نکلے تو کہنے لگے۔ واللہ ظالم بڑے زور کی کہگیا۔ سر محمدؐ اقبال کی شاعری کا اسوقت عنوان تھا، تمثیل اچھی تھی مگر زبان میں خامیاں تھیں، وہ فارسی کے اُردو سے بہتر شاعر بلحاظ زبان کے ہوئے ہیں۔

انکی قومی اور جوشیلی نظموں کو تو جانے دیجیے اُن کا کیا کہنا، مگر تغزل کا رنگ ان کے کلام میں جرمن ادبیات کے مطالعے کے بعد پیدا ہوا۔ مجھ سے ایک مرتبہ ایک بزرگ نے اقبال کی شاعری کے متعلق سوال کیا میں نے ان سے عرض کیا کہ وہ شاعر تو ضرور تھے مگر ان کی استعداد اور مبلغ علم کا شخص اس سے کم کیا شاعر ہوتا خواجہ حافظ بھی مگر مولانا قبائی تو تھے ہی۔

اس کانفرنس میں راجہ صاحب جہانگیرآباد اور محمودآباد نے بڑی بڑی رقمیں اور لکھنؤ کی پبلک نے بھی کثیر رقم چندہ وغیرہ میں دی۔ اتنا بڑا چندہ کانفرنس کی زندگی میں کبھی اور اس سے پہلے نہ ہوا تھا۔ کانفرنس والے ہر طرح رطب اللسان لوٹے۔

جب کانفرنس کا یہ روپیہ ختم ہونے کو آیا، شام کو حسام الملک نواب علی حسن خاں صاحب کی طرف سے قیصر باغ میں بارہ دری کے ایوان میں پارٹی (بقول حیدرآبادیوں کے عصرانہ) تھی، لوگ رخصتی ملاقاتیں کر رہے تھے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر شمس العلماء نذیر احمد صاحب سے کھڑے ایک صاحبزادے گورے گورے سیاہ ڈرنگ کوٹ اور ایرانی ٹوپی پہنے چہرہ بڑا سا مگر قد پر موزوں بظاہر برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن قطعہ الذہور ہاتھ میں لئے نہایت طراری سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں اپنے سن کی مناسبت کا دوسرا شخص پاکر رجحان طبعی ان سے ملنے کو ہوا، پاس قاری سرفراز ندوہ والے کھڑے تھے وہ بڑے جہاں گشت اور جہاں دیدہ تھے انہیں سے پوچھا یہ کون صاحب ہیں: انہوں نے اُن کی پوری تاریخ بتادی ابتو اور شوق ملاقات بڑھ گیا، ان کے مضامین رسائل میں دیکھے تھے چند ہی منٹ میں وہ کھنچ کر میری جانب آنکلے۔ قاری صاحب نے تعارف کرایا، انہوں نے کہا کہ میں علامہ سے ملنے بمبئی سے آ رہا ہوں، بیٹے وہ دل ملے۔ ان کے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے جو ان سے کچھ بڑے معلوم ہوتے تھے تعلیم تو دونوں کی ملتی تھی مگر ان کا رنگ مدھم تھا دونوں کی ناکوں میں کشمیریت تھی یہ دونوں بھائی تھے ان کے بھی مضامین رسالوں میں دیکھے تھے مگر وہ خاموش اور متین زیادہ تھے۔ کانفرنس کے خیال سے

بمبئی سے چلے تھے راہ میں نہ جانے کہاں اٹک گئے، سیلانی تو تھے ہی کانفرنس کی حالتِ نزع میں لکھنؤ پہنچے، خیر صورت دکھا لی، تھوڑی دیر تک ہم لوگ ٹھیکر ایک خیمہ میں باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں ہمارے ایک اور عزیز آگئے، غرض وہ اٹھکر جناب منشی احتشام علی صاحب قبلہ کی کوٹھی پر آگئے، اب اطمینان سے ہم تینوں میں باتیں ہونے لگیں وہ مجھپر اپنا علمی رعب جمانے لگے بھلا میں کہاں پیچھے پر ہاتھ رکھنے دینے والا تھا، اسمیں تو وہ کچھ ٹھہر نہیں لیکن ہاں فن قومیات اور عام معلومات اور سرسید اور انکے حواریوں کے لٹریچر کے وہ حافظ ضرور تھے مگر بلا کے ذہین تھے اشہب زبان اور اشہب قلم دونوں فرلانگے مجزا تھا، بڑے بھائی کا نام ابو النصر غلام یٰسین آہ دہلوی تھا، اور چھوٹے کا ابو الکلام محی الدین آزاد تھا، ناظرین اس طوالت اسمی کو طوالت ریش پر قیاس نہ کریں نہیں وہ بڑے فہمیدہ او ہوشمند تھے۔ ہمارے دوست مولانا ابو الکلام تو اسوقت ہندوستان کے سرتاج ہیں ان کی مزے مزے کی حکایتیں تو آگے چلکر بہت کچھ سننے لگا مگر ابو النصر مرحوم کس کو یاد ہوں گے۔ ان کی یاد رکھنے کو ان کا ایک قطعہ لکھتا ہوں وہ سن لیجئے اور انکی روح پر فاتحہ پڑھئے۔ وہو ہذا ؎

حسد کے ساتھ وہ تصویر اپنی کھنچوائیں نئے طریق سے اظہار رسم وراہ کریں
ہمارے پاس کبھی بھیجیں اسے شرارت سے کہ حال رشک سے ہم رو رو کے ہم تباہ کریں
غضب ہو اُسپہ زبانی پیام بھی آئے ہمارے سر کی قسم ہو انھیں جو آہ کریں

ابو النصر مرحوم سے چند روز وہ پہلی اور آخری ملاقات رہی، اب انشاء اللہ آخرت میں پھر ہوگی مگر ان کا اثر دلپر جو اس زمانہ میں ہمارے دوست ابو الکلام ایک روٹھنے والے معشوق کی طرح ایک سال لسان الصدق بھی نکالتے تھے جس کو تو ذوم النفسی کا مرض تھا۔

کانفرنس بڑی کامیابی کے ساتھ ختم ہوئی، ہم پھر اپنے تعلیمی مشاغل میں مصروف ہوگئے۔ علامہ فراہی تعطیل کلاں میں ہمارے علامہ کے پاس آجاتے اور ہم لوگوں کو کچھ نہ کچھ پڑھاتے۔ انھوں نے امین جنگیس کی

مابعد الطبیعات عربی میں پڑھائی تھی، اگرچہ کتاب سمجھتا تھا مگر کچھ شوق سے نہ پڑھتا تھا کیونکہ مجھکو پوری مغربی تعلیم حاصل کرنیکا شوق تھا لہذا سمجھتا تھا کہ آگے چلکر دیکھا جائیگا میں ان سے قرآن پاک اور ادب کے نکات اخذ کرتا تھا کسی کسی آیت کو لیکر مجھکو ایسی تفسیر دیتا تھا وہ خاموش آدمی تھے مگر طلبہ کے لئے ایسے نہ تھے دل میں یہ کھٹکا کہ انکی غیر مختتم تصانیف کے اجمال اور تفسیر کا لب لباب ذہن نشین کر لوں علاوہ تھوڑی سی بہت تفصیلی معلومات کے ان کی تفسیر کا پورا مرقع ذہن میں آگیا تھا چنانچہ جب بعد کو بعض ٹکڑے انکی تفسیر کے شائع ہوئے تو معلوم ہوا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا۔ انکی کتابوں کا سمجھنا خصوصاً جب وہ ٹکڑوں میں شائع ہوئی ہیں کچھ آسان نہیں ہے۔

ناظرین اسے تعلّی بینا اور عین عمل نہ کریں مگر میں صدق دل سے کہتا ہوں کہ ادب قرآن اور قرآن فہمی میں وہ اپنی آپ ہی مثال تھے۔ مگر اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ اگر انکی تعلیم اور مطالعہ مغربی ہمیں شامل نہ ہوتا تو یہ ذہن کی رسائی ان کو نصیب ہوتی انکی کمی علامہ کی تصانیف میں محسوس ہوتی ہے اگرچہ انکی قوت آخذہ نے مغربی پرداز مغربی صحبتوں میں رہکر کچھ نہ کچھ اخذ کر لیا تھا اور وہ کمی پوری کرنیکی کوشش کرتے تھے لیکن اگر وہ جدید فلسفہ سے واقف ہوتے اور فرید وجدی کے خوشہ چین نہ بنتے تو انکی علم الکلام پر ایک طالب العلم اتنا سخت حملہ نہ کرسکتا۔ کسی ایک مشرب سے تو واقف ہوجاتے اور اسکے ہو رہتے۔ یہی چیز ہے جس نے شرر صاحب کو اپنے ہم چشموں میں نمایاں کر دیا وہ انگریزی جانتے تھے اور فرانسیسی سمجھ لیتے تھے۔ گو ان کی خدمات ادب لطیف ہی تک محدود رہے۔ شرر صاحب کا ذکر خیر کئی جگہ آچکا ہے میرے دل کو جو لگاؤ ان کے ساتھ ہے وہ کچھ اور وسعت بیان پر مجبور کرتا ہے لہذا سنئے، مولانا شرر بڑے زندہ دل یار باش اور قوی الحافظہ تھے۔ تھے تو کرسی کے قریب میونہ کے شاید رہنے والے مگر اس اگلے نام کی کچھ کشش ایسی ہے کہ گلزار نسیم کے مکالمے کے زمانہ میں یہ وطن ان کے اوپر لادا گیا اور بات بھی لگتی ہوئی چٹپٹی جو اور پھیلا گئی، ان کے والد کا اسم بسلسلۂ طبابت واجد علی شاہ کے درباریوں میں تھا اور مولانا کی پرداخت مٹیا برج میں ہوئی۔ بچپن کی تعلیم اور اسکی تفصیل تو ان کے سوانح نگار جانیں مگر یہ بتانا ضروری ہے کہ عربی کے درسیات انھوں نے مولانا عبدالحی صاحبؒ فرنگی محلی سے ختم کی تھیں اور ادب

معلوم ہوتا ہو دل لگا کر منشی میر عباس مرحوم سے پڑھی تھی۔ عربیت انکی بہت اچھی تھی۔ میں نے جب ان کو دیکھا ہو تو وہ انگریزی خوب جانتے تھے اور فرنچ بھی سمجھ لیتے تھے، ان کے قلم میں زور اور روانی دونوں باتیں تھیں نظم سے نثر انکی بہت بلند تھی۔ علامہ کے جدید میدان تصنیف میں آنے سے پہلے وہ مصنف مؤلف اور مضمون نگار بن چکے تھے۔ چنانچہ جب علامہ نے المامون لکھی تو پہلے اسکا مسودہ انھیں کو بھیجا تھا کہ اگر شائع کرنیکے قابل ہو تو شائع کیا جائے۔ شرر صاحب نے اسکو بیحد پسند کیا اور بہت زور اشاعت پر دیا۔ میرے بھائی منشی واحد علی صاحب مرحوم کے پاس وہ اکثر آتے تھے اور انسے وہیں کی ملاقات تھی مٹیا برج کے بعد ان کے دو وطن ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک لکھنؤ دوسرا دکن۔ لکھنؤ آجاتے تو دکن جانے کا نام نہ لیتے۔ مثل ہو دکن کی کمائی کاندو کے نالے میں بہائی۔ اور جب دکن پہونچ جاتے تو وہیں کے ہو رہتے۔ اگر مصر کے جرجی زیدان کو کہو کہ وہ اغانی کی دائرۃ الادب کا حافظ تھا تو شرر صاحب اس کا مثنی ہندوستان میں تھے۔ عربوں کی تاریخ اور جغرافیہ پر انکی نظر بہت وسیع تھی۔ یہی وجہ ہو کہ جرجی زیدان اور شرر کے ناولوں میں توارد ہو گیا ہو۔ ان کا ایک کمال دیکھا جو کسی اور میں نہ دیکھا یعنی جب وہ کوئی مضمون لکھتے تو ایک ایچی ٹکڑے کاغذ کے ان کے سامنے رکھے رہتے۔ ایک ٹکڑا پر لکھکر کاتب کو دیدیتے اور مجھ سے آپسے باتیں کرتے رہتے جب کاتب "لفظ" اور" لکھتا تو سوانی مانگ کر پھر تیزی سے وہ دوسرا ٹکڑا بھر دیتے اور کام میں مصروف ہو جاتے کیسا انضباط ذہنی تھا۔

نوٹ:۔ ماہ ستمبر میں گنجائش نہونیکی وجہ سے حالات ندوہ نہیں دیے جاسکے، انشاء اللہ آئندہ مہینہ میں ماہ ستمبر کے حالات بھی شامل کر دیے جائیں گے۔

"مینیجر"

تاریخ تدوین اصول فقہ

از مولوی علی احمد گیلانی متعلم دارالعلوم ندوۃ العلماء

مصر کے مشہور اسلامی مؤرخ خضری بک کا نام محتاج تعارف نہیں۔ ان کی تاریخ الامم الاسلامیہ (تاریخ الخلافت) اور تاریخ التشریع الاسلامی (تاریخ فقہ اسلامی) کے ترجمے عرصہ ہوا ہو چکے ہیں اور کافی مقبول ہیں۔ فقہ اسلامی کی تاریخ کے علاوہ فن اصول فقہ پر بھی ان کی ایک بہت اچھی تصنیف مطبوعہ شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں اصول فقہ کی مختصر تاریخ اور اس فن کی اہم کتابوں پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ ذیل کی سطور میں اسی مقدمہ کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ امید کہ اہل علم خصوصاً عربی مدارس کے حلقوں میں اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

(۱)

شریعت اسلامیہ جو ہم تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے پہونچی اس کی بنیاد کتاب اللہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے اس کی تشریح کی کتاب و سنت میں سے ہر ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کرتی ہیں بس گویا کتاب و سنت دونوں دین کے اصول ہوئے جن سے احکام شرعیہ ثابت ہوتے ہیں اور احکام کے استنباط میں مجتہدین کو انہی دونوں اصلوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اور چونکہ شریعت کے احکام کسی نہ کسی علت پر مبنی ہوتے ہیں اس لئے کتاب و سنت سے ایک تیسری اصل قیاس ثابت ہوئی۔

پس جہاں کہیں شارع نے کسی حکم کی علت بیان کر دی ہو یا اجتہاد سے وہ علت معلوم ہو جائے وہاں وہی حکم لگا دیا جائے گا کیونکہ علت ہی حکم کی بنا ہے۔

امہ کا متفقہ فیصلہ ہو کہ جب امت کے مجتہدین کی رائے کسی ایسے حکم پر متفق ہو جائے جو قرآن و حدیث یا قیاس سے ماخوذ ہو تو ان سے خطا نہیں ہو سکتی کیونکہ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے "لن تجتمع امتی

علی الصلاۃ نہ۔ یہ اصول ایک چوتھی اصل بھی ثابت ہوئی جس کو اجماع کہتے ہیں۔ حاصل یہ کہ فقہ کے چار اصول ہوئے۔ کتابؐ، سنتؐ، قیاس، اجماع، اگرچہ ان سب اصول کا مرجع دو ہی اصلیں ہیں، کتاب اللہ اور سنت رسولؐ۔

(۲)

قرآن عربی زبان میں نازل ہوا سنت رسولؐ نے اسکی تشریح عربی زبان میں کی صحابہ کرامؓ جو فتوی دیا کرتے تھے عربی زبان سے اچھی طرح واقف تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نے ان کو شریعت کے رموز سے آگاہ کرادیا تھا انھیں شریعت کی روح سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوتی تھی سلامت فہم اور ذکاوت طبع میں ممتاز تھے۔ جسطرح انھیں اعراب اشتقاق کے قواعد جاننے کی ضرورت نہ تھی، اسیطرح احکام کے استنباط میں بھی کسی دوسری چیز سے مدد لینے کی ضرورت نہ تھی جب کوئی مسئلہ پیش آجاتا جس کے حکم کی ان کو تلاش ہوتی تو وہ کتاب اللہ کی طرف دوڑتے اگر اسمیں کوئی واضح اور صریح حکم نہ ملتا تو سنت کی طرف رجوع کرتے اگر اس سے بھی اسکی تشفی نہ ہوتی تو اجتہاد سے کام لیتے اور اشباہ کو اشباہ پر قیاس کرتے لیکن اس اجتہاد و قیاس میں وہ ان مصالح کا ضرور خیال رکھتے جنکی شریعت نے رعایت کی تھی، جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قضا کا منصب دیکر یمن بھیجا تو انسے پوچھا۔" بما تقضی؟ تم کس طرح فیصلہ کروگے؟ انھوں نے جوابدیا۔ کتاب اللہ سے۔ آپنے فرمایا۔ اگر اسمیں نہ پاؤ۔ جواب دیا۔ سنت رسولؐ سے۔ آپنے پھر فرمایا۔ اگر اسمیں بھی کوئی حکم نہ پاؤ۔ کہا میں اجتہاد کرونگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جوابات سے مطمئن ہوئے۔ ان کی ترتیب کی تصدیق کی اور اسی ترتیب کو قائم رکھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب ابو موسی اشعریؓ کو قاضی بنایا تو انھیں حسب ذیل تحریری ہدایتیں لکھیں" القضاء فریضۃ محکمۃ وسنۃ متبعۃ الفہم الفہم فیما تلجلج فی صدرک مالیس فی کتاب ولا سنۃ

فاعرف الاشباہ والامثال وقس الامور عند ذالک واعمد الی اقربها الی اللہ واشبهها بالحق .

یعنی ایک حکم فریضہ اور واجب الاتباع سنت ہے جن مسائل کا حکم کتاب و سنت میں نہ پاؤ انہیں اجتہاد سے کام لو اور جو صورت اقرب الی اللہ اور اشبہ بالحق ہو اسے اختیار کرو .

صحابہؓ کے بعد تابعین نے بھی انھیں اصول اور اسی ترتیب کو ملحوظ رکھا .

(۳)

یہ مبارک و مسعود زمانہ بہت جلد ختم ہو گیا . اسلامی حدود میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا تھا . عجمیوں سے اختلاط بڑھ رہا تھا . کثرت سے لوگ مسلمان ہو رہے تھے . ان نو مسلموں کے لئے عربی زبان بھی دوسرے فنون کی طرح ایک فن تھی جو بغیر سیکھے نہ آسکتی تھی . اہل لغت کو زبان کی حفاظت کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مبادا عجمی زبان غالب آجائے یا اسکی شکل بگاڑ دے انھوں نے قوانین وضع کئے اور کتابیں تصنیف کیں . یہ ان کے بس کی بات نہ تھی کہ بول چال میں بھی لوگوں سے انھی قوانین کی پابندی کرائیں . البتہ کتابت اور درس و تدریس کی زبان کو انھوں نے محفوظ کر دیا .

سب سے بڑا امر کہ جس نے انھیں اسطرف متوجہ کیا کتاب و سنت کی حفاظت کا خیال تھا .

(۴)

مجتہدین نے ایک دوسرا کام اپنے ذمہ لیا جس نے اہل لغت کے کام کو مکمل کر دیا . انھوں نے یہ ضروری سمجھا کہ استنباط کے لئے کچھ اصول مقرر کر لئے جائیں اسمیں انھوں نے اہل لغت کے وضع کردہ اصول و قوانین سے مدد لی جو عربی زبان کے نکات و دقائق پر اچھی طرح نظر رکھتے تھے .

(۵)

سب سے پہلے جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۲۰۴ھ نے اسطرف توجہ کی اور اصول فقہ میں ایک رسالہ لکھا جسے انکی کتاب الام کا مقدمہ سمجھنا چاہئے . اس مختصر سے رسالہ میں امام موصوف

نے بیان کی تعریف کی اسکے اقسام بتائے، پھر عام خاص ناسخ منسوخ، خبر واحد، اجماع، قیاس، استحسان، اختلاف علماء وغیرہ بہت سے دوسرے مسائل پر روشنی ڈالی۔

یہ سب سے پہلی کتاب تھی جو اس فن میں لکھی گئی ظاہر ہے کہ سب سے پہلے جو کتاب کسی فن میں لکھی جاتی ہو وہ غیر مکمل اور ناکافی ہوتی ہے نحو کا ابتدائی تحریری سرمایہ وہ چند مختصر جملے تھے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ابوالاسود دؤلی کو لکھوا دیے تھے پھر اہل فن نے اسمیں اضافے کئے اور بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں اسی طرح یہ رسالہ بھی اصول فقہ میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا تھا جس نے فقہا کی توجہ اسطرف مبذول کرائی۔

(۶)

اس فن کا مقصد یہ تھا کہ دلائل سے احکام کا استنباط کیا جائے اسلئے یہاں پر کئی چیزیں ہوگئیں۔ (۱) حکم (۲) دلیل (۳) استنباط (۴) مستنبط

اسی لئے علماء اصول نے اپنے مباحث کو چار ابواب میں محدود کر دیا ہے

(۱) احکام یعنی وجوب، نہی، استحباب، کراہیۃ، اباحۃ، حسن و قبح، ادا و قضا، صحت و فساد وغیرہ وغیرہ (۲) دلائل یعنی کتاب، سنت، اجماع، قیاس۔ (۳) طرق استنباط۔ (۴) مستنبط یعنی مجتہد۔

(۷)

لیکن یہ سب علماء ان اصطلاحات پر متفق نہ ہو سکے جن سے معانی نفسیہ کی تعبیر کیجاتی ہے۔ انمیں سے ہر ایک کا راستہ الگ تھا ہر ایک کی سمت مختلف تھی، ہر فریق نے تصنیف و تالیف میں اپنے طریق اس کی پیروی کی۔ سب سے زیادہ رائج دو طریقے ہوئے۔

(۱) متکلمین کا طریقہ (۲) احناف کا طریقہ۔

متکلمین کے طریقہ میں علم کلام کو بہت زیادہ دخل ہو وہ عقل اور اصول پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ فروعی مذاہب کی موافقت یا مخالفت ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی ان کا طریقہ یہ تھا کہ جن چیزوں کی تائید عقل اور ان کے وضع کردہ اصولوں سے ہو جاتی ان کا اثبات کرتے اور جو چیزیں ان کے خلاف ہوتیں ان کا انکار کرتے۔ ان کے بھی مختلف گروہ تھے معتزلہ، مالکیہ، شافعیہ، احناف کے طریقہ میں فروع مذہبیہ کی تطبیق پر بہت زور دیا جاتا ہو یہاں تک کہ وہ اپنے اصولوں کو ان فروع سے مطابق کرنیکی کوشش کرتے ہیں جو انکے ائمہ سے منقول ہیں جب کبھی کوئی اصول انکی نقلی فرع سے مخالف ہوجاتا ہو تو وہ اس اصول کو فرع کے مطابق بنانیکی کوشش کرتے ہیں لیکن فرع کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے ایسا معلوم ہوتا ہو کہ انھوں نے وہی اصول مدون کئے جنکی تفریع مسائل میں ان کے ائمہ نے اتباع کی تھی، یہی وجہ ہو کہ بعض اوقات احناف کے اصول بہت غریب ہوجاتے ہیں اور ان کے اصول بہت زیادہ فروع سے مملو ہوتے ہیں، کیونکہ یہی ان کی اصل ہوتے ہیں۔

(۸)

متکلمین کے طریقہ پر ائمہ متقدمین نے بہت سی کتابیں لکھیں جن بڑی بڑی کتابوں کا ہمیں علم ہو وہ تین ہیں:۔

(۱) "المعتمد" یہ ابو الحسین محمد ابن علی بصری معتزلی شافعی المتوفی ۴۳۶ھ کی تصنیف ہو (۲) "البرہان" یہ ابو المعالی عبد الملک بن عبد اللہ نیشاپوری المتوفی ۴۷۸ھ کی تصنیف ہے جو امام الحرمین کے لقب سے مشہور ہیں۔ (۳) "المستصفی" یہ ابو حامد محمد بن محمد غزالی شافعی المتوفی ۵۰۵ھ کی تصنیف ہو۔ ان تینوں کتابوں میں سے میں نے بالاستیعاب صرف المستصفی کا مطالعہ کیا ہے۔ البرہان کے بھی بعض اقتباسات دیکھے ہیں جنھیں اسنوی نے منہاج کی شرح میں نقل کیا ہو اسلوب کے اعتبار سے مستصفی کی عبارت بہت ترقی یافتہ ہے ان بزرگوں کے زمانے میں تلخیص و اختصار کا

زمانہ نہیں شروع ہوا تھا، ان کا واحد مقصد یہ ہوتا تھا کہ معنی سامع کے ذہن نشین کرا دیں، عبارت طویل ہو یا مختصر اسکے بعد دو جلیل القدر عالموں نے ان کتابوں کا خلاصہ لکھا، ایک خلاصہ امام فخر الدین رازیؒ المتوفی سنہ ۶۰۶ھ نے "محصول" کے نام سے لکھا، دوسرا خلاصہ علامہ سیف الدین آمدی المتوفی سنہ ۶۳۱ھ نے احکام کے نام سے لکھا، دونوں کتابوں کی عبارت صاف اور واضح ہو جسکے لئے کسی شرح کی ضرورت نہیں۔

اسکے بعد ان کتابوں کے اختصار کئے گئے، امام رازی کی کتاب محصول کا اختصار دو بڑے عالموں نے کیا (۱) تاج الدین محمد ابن حسن ارموی المتوفی سنہ ۶۵۶ھ نے "حاصل" کے نام سے اور (۲) محمد ابن ابی بکر ارموی المتوفی سنہ ۶۸۲ھ نے "تحصیل" کے نام سے مصنف نے اس کتاب کی ابتدا میں بیان کیا ہو کہ "محصول" کو باوجود اسکی گوناگوں خوبیوں کے لوگ بہت بڑی کتاب سمجھتے ہیں بعض لوگوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اس کا اختصار اپنی طرف سے کچھ اضافہ کے ساتھ لکھوں قاضی عبداللہ بن عمر بیضاوی المتوفی سنہ ۶۸۵ھ کی کتاب منہاج الوصول الی علم الاصول بھی الحاصل سے ماخوذ ہو اس کتاب میں اختصار ضرورت سے زیادہ برتا گیا ہے اسکی عبارت پیچیدہ اور مطالب کو ادا کرنے کے لئے بالکل ناکافی ہو شاید یہ کتاب اسلئے لکھی ہی نہیں گئی کہ لوگ اسے سمجھ سکیں ان حضرات کی کتابوں سے شرح کے بغیر طالب علم فائدہ نہیں اٹھا سکتا منہاج کی سب سے اچھی شرح عبدالرحیم ابن حسن اسنوی شافعی المتوفی سنہ ۷۷۲ھ نے کی ہو اگرچہ یہ بھی نہایت پیچیدہ اور مغلق ہے۔

باایں ہمہ اسنوی نے دعویٰ کیا ہو کہ (ان اکثر المشتغلین باصول الفقہ فی ہذا الزمان قد اقتصروا من کتبہ علی المنہاج لکونہ صغیر الحجم کثیر العلم مستعذب اللفظ)

میں نہیں سمجھ سکتا کہ الفاظ کی کرختگی کے باوجود یہ حلاوت کیسے پیدا ہو گئی۔ العجب ثم العجب

ابھی تک محصول کے مختصرات کا بیان کیا گیا احکام کا اختصار ابو عمرو عثمان بن عمرو ابن حاجب المتوفی ۶۴۶ھ نے منتہی السوال والامل فی علمی الاصول والجدل کے نام سے کیا پھر اسکی کتاب کا اختصار مختصر المنتہی کے نام سے کیا۔

اس کتاب کی عبارت منہاج سے بہت مشابہ ہے میں نے اسکی جن شروح کا مطالعہ کیا ہے انمیں سب سے بہتر شرح عضد الدین عبد الرحمن بن احمد المتوفی ۷۵۶ھ کی ہے۔ یہ شرح بہت اچھی ہے لیکن اسنوی نے منہاج کی جو شرح لکھی ہے اس سے کم درجہ کی ہے یہ سب مختصرات متکلمین کے طریقہ پر لکھی گئی ہیں انمیں مؤلفین نے صرف نقل پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اپنی رائے کا بھی اظہار کیا ہے اور بعض مقامات میں انکی رائے اصل کتاب سے مختلف ہوگئی ہے۔

(۹)

احناف کے طرز پر بھی متقدمین و متاخرین نے کافی کتابیں لکھیں متقدمین کے اسماء گرامی یہ ہیں:-

(۱) ابو بکر احمد بن علی المتوفی ۳۷۰ھ جو جصاص کے نام سے مشہور ہیں۔

(۲) ابو زید عبید اللہ بن عمر قاضی دبوسی المتوفی ۴۳۰ھ

(۳) شمس الائمہ محمد ابن احمد سرخسی المتوفی ۴۸۳ھ

میں نے اس طرز کی جتنی کتابوں کا مطالعہ کیا انمیں سب سے بہتر کتاب فخر الاسلام علی بن محمد بزدوی المتوفی ۴۸۲ھ کی ہے۔ علاء الدین بن عبد العزیز بن احمد بخاری المتوفی ۷۳۰ھ نے اسکی بہت اچھی شرح کی ہے۔ متاخرین میں سے عبد اللہ بن احمد نسفی المتوفی ۷۱۰ھ نے ایک کتاب المنار کے نام سے لکھی جو مختصر ہے۔

(۱۰)

متاخرین احناف کی ایک جماعت نے کوشش کی کہ ان دونوں طریقوں کو جمع کر دیا

جائے اور ان میں مطابقت وہم آہنگی پیدا کیجائے اگرچہ بعض دوسرے علما نے بھی اس کوشش میں حصہ لیا، لیکن چونکہ یہ کوشش احناف کی طرف سے شروع ہوئی اور اسمیں نمایاں حصہ بھی انھوں نے ہی لیا اسلئے اس کام کا سہرا انھیں کے سر باندھا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل علما اور انکی تصنیفات قابل ذکر ہیں۔

(۱) مظفر الدین احمد بن علی ساعاتی بغدادی حنفی المتوفی ۶۹۴ھ۔ آپنے ایک کتاب بدیع النظام الجامع بین کتاب البزدوی والاحکام لکھی۔

(۲) صدر الشریعۃ عبید اللہ بن مسعود بخاری حنفی المتوفی ۷۴۷ھ آپنے تنقیح الاصول کے نام سے ایک کتاب لکھی پھر خود ہی اسکی شرح کی جسکا نام توضیح رکھا۔ آپنے اپنی کتاب میں بزدوی محصول اور مختصر ابن حاجب کا خلاصہ کیا ہے۔ نیز توضیح پر سعد الدین مسعود ابن عمر تفتازانی المتوفی ۷۹۲ھ نے حاشیہ بھی لکھا۔

(۳) کمال الدین محمد بن عبد الواحد متوفی ۸۶۱ھ جو ابن ہمام حنفی کے نام سے مشہور ہیں آپنے تحریر کے نام سے ایک کتاب لکھی آپکے شاگرد محمد بن محمد ابن امیر حلبی متوفی ۸۷۹ھ نے اس کی شرح لکھی۔

(۴) تاج الدین عبد الوہاب بن علی السبکی الشافعی متوفی ۷۷۱ھ۔ آپنے جمع الجوامع کے نام سے ایک کتاب لکھی جسکی ابتدا میں آپنے فرمایا ہو کہ میں نے اس کتاب کو تقریباً ایک سو مصنفین کی کتابوں سے جمع کیا ہے مذکورہ بالا تمام کتابوں میں حد سے زیادہ اختصار ہو جو بعض اوقات اغلاق اور پیچیدگی کا موجب بنجاتا ہو اس صفت میں ابن ہمام کی التحریر سب سے بڑھی ہوئی ہو اگر کوئی شخص اسکو شروح سے الگ کرکے پڑھنا چاہے تو اسے محسوس ہوگا کہ وہ کوئی معمہ کی کتاب پڑھ رہا ہو اسکی عبارت پڑھکر بڑی الجھن اور اضطراب پیدا ہوتا ہو لیکن جمع الجوامع تو وہ مختلف اقاویل کا مجموعہ

جس سے نہ نساری کو فائدہ پہونچ سکتا ہو نہ سائح کو علاوہ ازیں یہ کتاب استدلال سے بھی یکسر خالی ہے۔

(۱۱)

اس تہاوت کے بعد بحث و اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا تفکیر کی قوت ختم ہو گئی بعد کے علماء نے صرف شرحیں و حواشی لکھکر ان کتابوں کو آسان اور عام فہم بنانیکی کوشش کی اپنی طرف سے کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا اور اب یہ فن آثار قدیمہ میں سے شمار ہونے لگا۔ متاخرین کی سب سے ادق کتاب مسلم الثبوت ہو جس کے مؤلف ملا محب اللہ بن عبد الشکور المتوفی سنہ ۱۱۱۹ھ ہیں۔ افسوس ہو کہ اصول فقہ پر کثرت سے کتابیں لکھی گئیں لیکن اب تک ان اصول پر کسی نے کوئی کتاب نہ لکھی جنکا شریعت میں شارع نے اعتبار کیا ہے۔ یہ اصول دلیل و قیاس کی بنیاد ہیں اسلیئے کہ اس دلیل کی روح وہ علتیں ہیں جن کا شرع میں اعتبار کیا گیا ہو انمیں سے بعض بعبارۃ النص ثابت ہیں اور بعض بدلالۃ النص۔

حالانکہ معمولی معمولی مسائل [illegible] ان پر بحث و تکرار میں اپنا وقت ضائع کرنیکے بجائے اسطرف توجہ کرنیکی زیادہ ضرورت تھی تاکہ مجتہدین کے لئے یہ اصول و قواعد مشعل راہ بن سکیں غالباً علماء اصول نے یہ کام فقہا کے لئے چھوڑ دیا حالانکہ اس کا تعلق اصول فقہ سے زیادہ تھا۔

اس موضوع پر سب سے اچھی کتاب جو میں نے دیکھی ابو اسحٰق ابراہیم بن موسیٰ شاطبی المتوفی سنہ ۷۹۰ھ کی الموافقات ہے۔ یہ کتاب بہت مفید ہو اسکی عبارت بہت سہل ہو یہ پڑھنے والوں کو تمام دوسری کتابوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

Regd. No. A-596.

پھولوں کی ڈالی

اخلاقی اور اسلامی نظموں، رباعیات، قطعات، ترانوں اور منتخب اور دلچسپ گیتوں کا دلگداز اور ولولہ انگیز گلدستہ

جسے

خان بہادر خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری انسپکٹر آف اسکولس یو پی نے شعراء قدیم و شعراء حال کے کلام سے سجایا ہے۔ انتخاب میں ایسے اشعار لئے ہیں کہ جن کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر ہے۔ حمد، مناجات، نعت، اخلاق، درس عبرت، نصائح، درس عمل، حب وطن اور محبت وغیرہ، عنوانات کے تحت میں مؤثر اور مقبول کلام جمع کیا ہے، چھوٹے بڑے عام طور پر پسند کرتے ہیں۔

بچے اس بابرکت مجموعہ کو اپنے بزرگوں کی خدمت میں ہدیتاً پیش کرتے ہیں، اور [illegible] اپنے بچوں کو ان کے اخلاق سنوارنے کے لئے تحفتاً دیتے ہیں۔ آپ بھی اپنے بچوں کو، اپنے دوستوں کو تحفتاً دیجئے! محکمۂ توسیع تعلیم یوپی نے کئی ہزار جلدیں اپنی لائبریریوں کیلئے خرید کی ہیں صرف تھوڑی جلدیں بچ رہی ہیں جو ہاتھوں ہاتھ نکل رہی ہیں۔ آپ دیر نہ لگائیں۔

کاغذ، لکھائی، چھپائی عمدہ، ٹائٹل سہ رنگا، حجم ۲۵۰ صفحات، قیمت صرف عہ

ملنے کا پتہ: صدیق بک ڈپو لکھنؤ

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

الندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتبہ

سید ابو الحسن علی ندوی
استاذ تفسیر و ادب

عبد السلام قدوائی ندوی
استاذ تاریخ و اقتصادیات

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہٗ

جلد ۲ نمبر ۱۰

رمضان المبارک ۱۳۶۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۴۱ء

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے

تمام خط و کتابت اور ترسیل زر مینجر الندوہ، بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہیئے

شذرات

مقام مسرت ہے کہ مسلمانوں میں دین سے براہِ راست واقفیت کا شوق پیدا ہو رہا ہے، اس سلسلہ میں جابجا قرآن مجید کے ترجمے کے حلقے قائم ہو رہے ہیں۔ پنجاب میں عرصہ سے اس قسم کا کام ہو رہا تھا اب ان اطراف میں بھی یہ چرچا ہونے لگا ہے، عموماً مسجدوں میں ہفتہ وار یا روزانہ ضروری تشریح کے ساتھ ترجمہ سنایا جاتا ہے جس کی حیثیت زیادہ تر وعظ و پند کی ہوتی ہے کہیں کہیں درس کی نوعیت بھی ہو گئی ہے لیکن اصل عربی زبان سے واقفیت اور اصول و قواعد کی مدد سے ترجمہ کا کام شاید کہیں بھی نہیں ہوتا۔ غالباً اسکی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان کو بہت مشکل سمجھا جاتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ برسوں کی محنت کے بعد مشکل سے اتنی استعداد پیدا ہو سکتی ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ شروع کیا جا سکے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے ایک اوسط درجہ کا اردو داں زیادہ سے زیادہ دس دن میں اتنی صلاحیت پیدا کر سکتا ہے کہ باقاعدہ قرآن مجید کا ترجمہ شروع کر دے اس طرح ڈیڑھ مہینہ میں سورہ بقرہ ختم ہو جاتی ہے جس کے بعد آسانی سے پانچ چھ مہینے میں پورے قرآن مجید کا ترجمہ ضروری تشریحات کے ساتھ ختم ہو سکتا ہے ذہین اور تعلیم یافتہ اصحاب اس سے بھی کم مدت میں اس منزل تک پہونچ سکتے ہیں۔ ہمارے اس بیان کو مبالغہ پر محمول نہ کیا جائے۔ دس برس کے تجربہ کے بعد ہم یہ رائے ظاہر کر رہے ہیں اگر کوئی صاحب اس طرز پر کام کرنا چاہیں تو خط و کتابت سے تفصیلات معلوم کر سکتے ہیں۔

ہندوستان کی تعلیمی پسماندگی محتاج بیان نہیں، اعلیٰ تعلیم یافتوں کا کیا ذکر ہے محض حرف شناسوں کا شمار کیا جائے تو ان کا تناسب بھی چند فی صد سے آگے نہیں بڑھتا، اس صورت حال کی تبدیلی کے لئے عرصہ سے کوشش ہو رہی ہے اور چھوٹے بڑے ہزاروں ادارے اس کام میں مصروف ہیں

لیکن یہ ساری جد و جہد بچوں اور نابالغوں کی تعلیم کے لئے ہو رہی ہے حالانکہ بڑوں کی جانب اس سے زیادہ توجہ کی ضرورت تھی کیونکہ یہی ہماری تمام اصلاحوں کی بنیاد ہیں۔ بچے کل جن نقشوں میں رنگ بھریں گے ان کے خاکے آج انھیں بڑوں کے ہاتھوں بنیں گے اور مستقبل میں قومی اصلاح و ترقی کی جو عالیشان عمارتیں تعمیر ہوں گی ان کی داغ بیل حال ہی میں پڑیگی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب کچھ عرصہ سے اس جانب توجہ ہونے لگی ہے۔ جامعہ ملیہ دہلی کے ماتحت کئی برس سے تعلیم بالغان کا ایک شعبہ ادارۂ تعلیم و ترقی کے نام سے قائم ہے جو اپنے پرجوش ناظم مولوی شفیق الرحمٰن صاحب بی۔اے کی سربراہی میں خاصہ کام کر رہا ہے۔ اس ادارہ نے اپنے کام کو کم خواندہ و ناخواندہ دو حلقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ کم خواندوں کے لئے آسان زبان اور واضح خط میں متعدد مفید و دلچسپ کتابیں اور نقشے شائع ہو چکے ہیں۔ ناخواندوں کے لئے شبینہ مدارس کا انتظام ہے، اس سلسلہ میں ادارہ کی جانب سے وقتاً فوقتاً مختلف مفید تجویزیں اور کارکنوں کے تجربے شائع ہوتے رہتے ہیں جن صاحبان کو ان مسائل سے دلچسپی ہو وہ ناظم صاحب ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ دہلی سے خط و کتابت کریں۔

———•———

دارالعلوم میں چھوٹے بچوں کے لئے دارالاقامہ کی ضرورت اور اس کی تعمیر کے خیال کا ذکر ان صفحات میں ہو چکا ہے نقشہ بن چکا ہے اب عنقریب تعمیر کا کام شروع ہونیوالا ہے۔ مولانا سید سلیمان صاحب مدظلہ کی تصنیف رحمت عالم کی فروخت سے یہ مختصر دارالاقامہ تعمیر ہو رہا ہے۔ ابھی ضرورت کے مطابق رقم پوری نہیں ہے، لیکن اللہ کا نام لیکر کام کا آغاز ہو رہا ہے امید کہ اہل خیر اس کار خیر میں سبقت کریں گے۔

میری محسن کتابیں

از مولانا شاہ حلیم عطا صاحب استاذ تفسیر و حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء

میرے خاندان میں خدا کے فضل و کرم سے علم اور دین کئی صدی سے چلا آ رہا ہے، شیخت و سجادگی کے باوجود مشائخ کو علوم سے برابر اشتغال رہا اور بعض حضرات صاحب تصانیف بھی ہوئے۔ حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ نے ابو الحسن ظہیر الدین عرف شاہ نیاز عطا صاحب کے نام جو خطوط بھیجے ہیں اور حضرت شاہ رفیع الدین علیہ الرحمۃ نے اپنے بعض علمی تحفوں پر جو الفاظ لکھے ہیں ان سے اس خانقاہ کے بزرگوں کے علم و فضل کا اظہار ہوتا ہے۔

باایں ہمہ ماحول خانقاہی اثرات اور صوفیانہ خصوصیات سے خالی نہ تھا، خاندان کا عام ذوق اور رجحان تصوف اور اس کے متعلقات کی طرف تھا، اس ماحول میں میرے عم محترم شاہ حسام عطا صاحب مرحوم خاص خصوصیات کے مالک تھے، شب بیداری اور مداومت ذکر کے علاوہ وہ ایک سلیم الفہم حق شناس اور وسیع القلب بزرگ تھے معاصرین کے فضل کا کشادہ دلی سے اعتراف کرتے تھے سلسلہ اور خاندان کی عصبیت سے پاک تھے اور بعض متبع سنت اور متورع معاصر بزرگوں کا بڑی عظمت اور عقیدت سے ذکر کرتے تھے اور اکثر سلف صالحین اور صوفیہ کے تذکرے سنایا کرتے تھے، جس سے صلحاء کی محبت کی تخم ریزی ہوئی تھی۔

میری عمر دس گیارہ برس کی تھی کہ چچا مرحوم ہر جمعہ کو تفسیر فتح العزیز اور بخاری کی احادیث کا ترجمہ سنایا کرتے۔ ان سے سنی ہوئی حدیثیں آج تک دل پر نقش ہیں۔

میری عمر کا بارھواں یا تیرھواں سال تھا کہ عم محترم نے سورۂ جن کی آیت "وَاَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰہِ یَدْعُوْہُ کَادُوْا یَکُوْنُوْنَ عَلَیْہِ لِبَدًا" کی تفسیر فتح العزیز سے پڑھ کر سنائی، اس سے سب سے پہلے شرک کی حقیقت سمجھ میں آئی اور توحید کا پہلا نقش دل پر قائم ہوا۔

مولوی معین الدین صاحب ٹونکی نے والد رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ مہدی عطا صاحب سجادہ نشین خانقاہ کریمیہ سلون کو نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی "الدین الخالص" ہدیۃً بھیجی تھی طالب علمی کے زمانہ میں اسکا مطالعہ کیا اور اس سے اثر لیا۔

حدیث میں نے اپنے برادر اکبر مولانا شاہ نعیم عطا صاحب سے شروع کی جو حدیث میں استاذالہند حضرت شیخ حسین بن محسن انصاری یمانی کے شاگرد ہیں، بھائی صاحب کو حدیث کا ذوق تھا اسکے اثر سے مجھے بھی حدیث کا شوق پیدا ہوا، اسی زمانہ میں صحیح مسلم کو اسکی شرح کی مدد سے اور بخاری کو فتح الباری کی مدد سے دیکھتا، حدیث کے علاوہ ذاتی شوق سے سیوطی کی مزہر ثعالبی کی فقہ اللغۃ، نووی کی اذکار التبیان فی آداب حملۃ القرآن اور ریاض الصالحین کا مطالعہ کرتا تھا خصوصاً نووی کے کلام میں بالعموم بڑی حلاوت اور نورانیت معلوم ہوتی تھی۔

سنہ ۱۳۲۹ھ میں میری خوش قسمتی سے خانقاہ میں مولانا سید ابوالحسن علی صاحب دہلوی کا ورود ہوا، آپ حدیث میں میاں سید نذیر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فقہ میں مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کے والد ماجد مولانا عبدالحلیم صاحب فرنگی محلیؒ کے اور ادب میں مولوی حامد حسین صاحب اور ان کے بھائی مولوی احمد حسین صاحب کے شاگرد تھے۔ لیکن آپ پر میاں صاحب کے تلمذ کے اثرات زیادہ غالب تھے، سلفیت کا رنگ بہت گہرا اور حدیث اور سلف کی کتابوں کا بڑا شغف تھا۔ نہایت عابد اور متورع بزرگ تھے۔ آپکی تحریک اور تشویق سے امام ابن جوزی کی تلبیس ابلیس اور صفۃ الصفوہ امام ابن تیمیہ کی الواسطہ بین الخلق والحق، امام ابن قیم کی زادالمعاد امام بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات اور محمد بن نصر مروزی کی کتاب قیام اللیل بار بار پڑھی اور دل میں اُتار لی جہال صوفیہ کی بدعات کی ظلمت سے نکلنے میں کتاب الواسطہ اور تلبیس ابلیس سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوئی۔ اسی زمانہ میں صحیحین اور مؤطا بالخصوص صحیح مسلم سے زیادہ اشتغال ہوا چونکہ نووی

کی شرح موجود تھی جو طلبہ کے لئے بڑی مفید سہل اور ایک حد تک دلچسپ بھی ہو اور چونکہ مجھے خود ہی سے عقیدت تھی اسلئے صحیح مسلم کو زیادہ ذوق و شوق اور انہماک کے ساتھ دیکھا۔

مولانا نابینا ہو جانے کے بعد مجھ سے تلبیس ابلیس، شفاء العلیل فی مسائل القضاء والقدر والحکمۃ والتعلیل (ابن قیم) اور غایۃ الامانی فی الرد علی النبہانی (الوسی زادہ) پڑھوا کر سنا کرتے تھے جس سے ان سلفی عقائد و خیالات کے نقش گہرے اور مستحکم ہوتے چلے گئے۔

سنہ ۱۳۴۲ھ میں مولانا محمد سورتی صاحب لکھنؤ میں مقیم تھے، انکی وجہ سے بڑی نادر علمی مجلسیں اور پرلطف صحبتیں رہتی تھیں جنمیں کثرت سے سلف کی کتابوں کا تذکرہ رہتا تھا۔ میں اور محب گرامی مولانا سید طلحہ اور صدیق محترم مولانا خلیل بن محمد عرب اور دوسرے ہم مذاق اور ہم خیال احباب ان مجالس میں شریک ہوتے اور علمی مذاکرہ اور گفتگو کرتے۔ انھیں مجلسوں میں علامہ ابن حزمؒ سے میرا خاص تعارف ہوا۔ مولانا سورتی انکی جامعیت اور تبحر کے بڑے معترف اور مداح تھے، انکی گفتگو سے مجھے ابن حزم کی تصنیفات کی طرف توجہ ہوئی۔ انکی کتاب الفصل فی الملل والنحل تو پہلے دیکھ چکا تھا اب انکی اور تصنیفات بھی دیکھیں۔

ابن حزم کی تحقیقات میں مسئلہ عصمت انبیاء اور قرآن مجید کے طرق نقل کی بحث کو میں نے بہت پسند کیا اور ان مسائل پر امام ابن تیمیہ اور بعض دوسرے علماء نے جو کچھ لکھا ہے اس پر علامہ ابن حزم کی تحقیق اور بحث کو ترجیح دیتا ہوں۔

مولانا خلیل عرب صاحب کی گفتگو اور علمی مذاکرہ سے جرجانی کی تصانیف بلاغت اور امیر المومنین یحییٰ یمنی کی جلیل القدر تصنیف طراز سے اشتغال ہوا اور درس نظامی کی کتابوں سے طبیعت ہٹی اور انکی رہنمائی اور رفاقت میں ندوہ کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا۔

اسکے بعد مجھے سلف کی کتابوں کو خریدنے اور ان کے مطالعہ کا ولولہ پیدا ہوا خصوصیت

کے ساتھ جن علماء سلف کی اکثر تصنیفات کا میں نے مطالعہ کیا وہ حسب ذیل حضرات ہیں۔

ابن جوزی ، ابن تیمیہ ، ابن قیم ، ابن کثیر ، ابن رجب ، ابن عبدالہادی، ذہبی ابن حجر عسقلانی ، محمد بن ابراہیم وزیر یمانی ، محمد بن اسمٰعیل امیر یمانی، محمد بن علی شوکانی، نواب صدیق حسن خاں۔

امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی جن تصنیفی خصوصیات نے مجھے متأثر کیا، وہ انکی توحید وسنت کی دعوت، دلچسپ اور آسان مگر پرزور اور مدلل طرز بیان، اور قرآن وحدیث کا بے نظیر استحضار واستدلال ہے۔

لیکن اس تاثر کے باوجود شیخین کی تصانیف میں چند مسائل شاذہ سے طبیعت کو اختلاف رہا۔ ایک اثبات صفات میں ان کا مبالغہ جسکے متعلق محمد بن ابراہیم وزیر نے الروض الباسم میں لکھا ہے وبعض کلامہما یکاد یفضی الی التجسیم، اس بارہ میں امام بیہقی اور ابن جوزی کی روش زیادہ مرغوب رہی۔

اسی طرح بعض مسائل فقہیہ مثل مسئلہ طلاق ویمین وغیرہ اور دقائق معقولات، نیز ذات وصفات کے مسائل میں انکی دقیقہ سنجیوں سے جو زیادہ تر منہاج السنۃ، کتاب العقل والنقل اور بعض دوسری کتابوں میں پھیلی ہوئی ہیں کبھی دلچسپی نہیں ہوئی۔

علیٰ ہذا القیاس شد رحال کے مسئلہ میں حافظ ابن حجر کا یہ قول کہ وہی من ابشع المسائل المنقولۃ عن ابن تیمیہ کو صحیح سمجھتا رہا۔

منہاج السنۃ میں فضائل اہلبیتؓ کی احادیث پر جو تشددانہ کلام منہاج السنۃ میں امام نے کیاہے اس سے ہمیشہ تکلیف محسوس کرتا رہا اور اسکو محو تمنا بدی۔

مجھے امام ابن تیمیہ کے مختصر رسائل جنمیں توحید وسنت کی دعوت ہو وہ زیادہ پسند آئے

الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح، منہاج السنہ کے بعض مباحث اور فصول اور الصارم المسلول علی شاتم الرسولؐ میرے نزدیک امام کی منتخب کتابوں اور مباحث میں سے ہیں۔

امام ابن قیم کی تصنیفات میں سے میرے مذاق کی مدارج السالکین، الجواب الکافی، عدۃ الصابرین، زاد المعاد ہیں۔ ان کی کتابوں اور کلام کے متعلق مجھے شوکانی کی اس رائے سے لفظ بلفظ اتفاق ہے "طویل النفس فی کتبہ اذا تکلم اسہب واطول ذیولہ، وکلامہ فی کتبہ مما تعشقہ الافہام وتکاد تکلہ العیون وتشرب بہ القلوب۔"

ابن قیم کی کتابیں میرے نزدیک امام ابن تیمیہ کے متن کی شرح ان کے اجمال کی تفصیل اور ان کا نقش ثانی ہیں۔

اگر کسی کو امام ابن تیمیہ کی سب کتابیں دیکھنے کی فرصت نہ ہو تو وہ فتاویٰ اور مجموعۃ الرسائل کا مطالعہ کرے، انکی سب خصوصیات سامنے آجائینگی، اسی طرح سے امام ابن قیم کی زاد المعاد کا حال ہے۔ تفاسیر متعددہ میں اگر کسی کے پاس صرف تفسیر ابن کثیر اور کتب تاریخ میں صرف البدایہ والنہایہ ہو تو ان فنون میں وہ بہت حد تک مستغنی ہو سکتا ہے، ابن کثیر کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ معرکۃ الآرا مسائل میں صرف صحیح روایات سے فیصلہ کرتے ہیں۔

نوٹ

باوجود کوشش کے بروقت کاغذ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے رسالہ شائع ہونے میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی انشاء اللہ آئندہ ماہ سے رسالہ وقت پر شائع ہوگا اور خریداران صاحبان کو انتظار کی زحمت نہ اٹھانا پڑیگی۔

منیجر

میرا طریق مطالعہ و تحریر

از مولانا سید طفیل احمد صاحب علیگ

آنکھوں کی مسلسل تکلیف کی وجہ سے بغیر بی اے کئے کالج چھوڑنا پڑا۔ سالہا سال تک علاج کے بعد جب آرام ہوا تو آنکھوں میں مطالعہ کی قوت نہ تھی بالخصوص انگریزی کتاب اور اخبار تو بالکل نہ پڑھ سکتا تھا۔ تاہم علی گڑھ تحریک سے وابستگی کی وجہ سے کالج اور اولڈ بوائز کا لٹریچر پڑھتا رہا، اور باوجود آنکھوں کی تکلیف سے درد سر رہنے کے اولڈ بوائز ڈائرکٹری کے دو ایڈیشن مرتب کئے۔ اسی حالت میں عمر کے بارہ سال گذر گئے حتیٰ کہ سنہ ۱۹۲۶ء میں جا کر اس قابل ہوا کہ انگریزی کتب اور اخبارات پڑھ سکوں، تاہم ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں بغیر آنکھوں اور سر کی تکلیف کے مسلسل ایک ہفتہ بھی کام کرسکوں۔ ان حالات میں میں نے تعداد کے اعتبار سے کتابیں اسقدر کم پڑھی ہیں کہ وہ قابل تذکرہ نہیں البتہ میرے پڑھنے کا جو طریقہ ہے وہ میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

وہ یہ ہے کہ میں جو کتاب پڑھتا ہوں اُس کا خلاصہ ایک کاپی میں لکھ لیتا ہوں اور یہ عادت اسقدر راسخ ہوگئی ہے کہ کوئی کتاب بغیر خلاصہ کئے میں پڑھ نہیں سکتا۔ اس عادت کی وجہ سے لمبے لمبے قصوں کی کتابیں اور ناول مجھ سے پڑھے ہی نہیں جاتے اور صرف ٹھوس مضامین کی کتابیں پڑھ سکتا ہوں جن کا خلاصہ کرنا کارآمد ہو۔ ہر کاپی کے شروع میں اسکی فہرست مضامین ہوتی ہے اور سب کاپیوں کی فہرستیں ایک اور کاپی میں مع نمبر کاپی و صفحہ مضمون درج ہوتی ہیں۔ اسکا فائدہ یہ ہے کہ جب مجھے کچھ لکھنا ہوتا ہے تو اس ایک کاپی کے دیکھنے سے اپنی پڑھی ہوئی تمام کتابوں کے مضامین سامنے آجاتے ہیں۔ مجھے یہ طریقہ اختیار کرنیکی ضرورت زیادہ تر اسلئے محسوس ہوئی کہ میرا حافظہ کمزور ہوگیا ہے مجھے دنیا کے برفانی دور کے حالات معلوم کرنیکی ضرورت ہوئی خیال

آیا کرتا یہ میں نے اس مضمون پر کوئی کتاب پڑھی ہے۔ اپنی کاپی اٹھا کر فہرست مضامین پڑھنی شروع کی۔ اسیں کتاب کے خلاصہ کا پتہ چند منٹ میں چل گیا۔ اسے پڑھنا شروع کیا تو معلوم ہوتا تھا کہ گویا پوری کتاب سامنے آکر کھڑی ہوگئی ہے۔ اور اس طرح چند منٹ میں اس کی تمام معلومات دماغ میں آگئیں۔

جن اصحاب کا حافظہ قوی ہو وہ تو اپنی پڑھی کتابوں کے مضامین یاد رکھتے ہوں گے مگر میرا تجربہ یہ ہے کہ کتاب کا مضمون اسی وقت ذہن نشین ہوتا ہے جبکہ پڑھنے کا کوئی مقصد ہو۔ طالب علمی کے زمانہ میں تو مقصد امتحان ہوتا ہے مگر طالب علمی کے بعد پڑھنے کا بہترین مقصد تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری ہے۔ اگر یہ مقصد نہ ہو تو دماغ کے اندر تمام معلومات مثل ایندھن کے بے ترتیب پڑی رہتی ہیں۔ مگر کچھ لکھتے وقت اسی ایندھن میں سے کارآمد چیزیں نکل نکل کر خود بخود مرتب اور آراستہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ بس اگر کسی شخص کو اپنا علم محفوظ رکھنا ہے تو تحریر اور تقریر کے ذریعہ سے دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتا رہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو کچھ پڑھے یا لکھے وہ ایک خاص جذبہ کے ساتھ ہو۔ اس سے پڑھنے والے پر اثر ہوتا ہے۔ لکھنے کے بارے میں مجھ میں احساس کمتری بہت زیادہ ہے اور میں آج تک سمجھتا ہوں کہ مجھ میں لکھنے کی قابلیت بالکل نہیں ہے۔ جو کچھ لکھتا ہوں وہ ہجوم خیالات سے مجبور ہو کر لکھتا ہوں۔ جس زمانہ میں رسالہ سود مند نکالتا تھا تو ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ اچھا لکھنے کی ترکیب بتاؤ۔ اس سے مجھے حیرت ہوئی کہ میں تو اس فکر میں رہتا ہوں کہ مجھے اچھا لکھنا آجائے مگر ایک واقعہ سے مجھے معلوم ہوا کہ خاص جذبات سے متاثر ہو کر کچھ لکھا جائے تو بلالحاظ زبان اور لٹریچر کی عمدگی کے پڑھنے والے پر اثر پڑتا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک بار میں زرورہ کی چھاؤنی پر جو ضلع بلند شہر میں واقع ہے گیا تھا۔ اُس زمانہ میں مجھ پر مسلمانوں کے افلاس کے خیالات کا ہجوم تھا

جہاں اُس زمانہ میں خشک پڑی تھی اور بڑے بڑے پرند سیکڑوں کی تعداد میں ہزاروں مچھلیوں پر ٹوٹ پڑے تھے اور چونچوں اور پنجوں سے پکڑ پکڑ مچھلیوں کا شکار کر رہے تھے۔ مجھ پر یہ اثر ہوا کہ ملک کی سرمایہ دار قومیں غریب مسلمانوں کا اسی طرح شکار کر رہی ہیں۔ علی گڑھ واپس آکر "زورہ کی جھال سے ایک سبق" کے عنوان سے رسالہ سود مند میں ایک مضمون لکھا۔ چند روز بعد معلوم ہوا کہ اُس مضمون کو پڑھ کر کئی صاحب علیحدہ علیحدہ زورہ کی جھال دیکھنے گئے۔ اُس وقت نہر میں پانی جاری ہو گیا تھا اور اُس منظر کا پتہ نہ تھا جو مضمون میں لکھا گیا تھا۔ اُس مضمون میں زبان اور لٹریچر کی خوبی کیسے ہوتی جبکہ میں اس سے نابلد ہوں۔ البتہ مولوی اکرام اللہ خاں صاحب ندوی سے معلوم ہوا کہ تحریر کی یہ بڑی خوبی تھی کہ کچھ لوگ اُسے پڑھ کر اس قدر متأثر ہوئے کہ اُس مقام کو دیکھنے بے اختیار چلے گئے۔

ایک اور میرا معمول ہے جو میرے نزدیک مفید ہے۔ ۱۸۸۹ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم کی پیروی میں میں نے اور خان بہادر مولوی محمد حبیب اللہ خاں صاحب نے روزنامچہ لکھنا شروع کیا تھا۔ اور وہ اب تک جاری ہے جس کو اب باون سال ہو گئے۔ محض روزنامچہ لکھے چلے جانے سے زیادہ فائدہ نہیں جب تک کہ اُسے دیکھا نہ جائے۔ میں ہر سال کے شروع میں پچھلے سال کا روزنامچہ پڑھ کر اُس پر تنقید لکھتا ہوں جو کچھ پچھلے سال میں کیا ہے اُس کا خلاصہ لکھ کر آئندہ سال کیلئے ارادے لکھتا ہوں اور اُن ارادوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ دماغ میں بہت سے کام آتے تھے، ارادے کئے جاتے تھے اور وہ ارادے پورے نہ ہونے سے انتشارِ خیال رہتا تھا جس کا اندازہ پچھلے روزنامچوں کے پڑھنے سے ہوتا ہے، مگر اپنے پچھلے کاموں پر نظر ڈالتے رہنے اور ضابطے کی پابندی کر کے اُس پر عمل کرتے رہنے سے اب دماغ اس قسم کے افکار سے پاک رہتا ہے اور طبیعت میں ایک قسم کا سکون محسوس ہوتا ہے اور زبان سے بے اختیار نکلتا ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۔

ایمان کا زور

از مولوی محمد حنیف صاحب ندوی متعلم دارالعلوم ندوہ

آج دنیا کی نظروں میں ہونے کی وجہ سے مسلمان ہر جگہ ضعف و اضمحلال محسوس کر رہے ہیں لیکن کبھی وہ زمانہ بھی تھا کہ چند سو صحابہ کے وجود دنیا کو زیر و زبر کر دینے کی ہمت تھی۔ ذیل کی سطروں میں اسی قسم کے چند عبرت آموز واقعات درج کئے جاتے ہیں۔ ان سے اگر کسی ایک دل کا یاس و قنوط بھی دور ہو گیا تو محنت سوارت ہو۔

مسلمان ہجرت کر کے مدینہ کو گئے ہیں۔ مکہ سے تین سو میل دور ہیں۔ لیکن قریش کو اب بھی چین نہیں آتا، کبھی یہود کو ابھارتے ہیں، کبھی منافقین کو اکساتے ہیں۔ اور پھر اس پر بھی بس نہیں بلکہ ارادہ ہے کہ مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے بالکل نیست و نابود کر دیا جائے۔ چند دن میں انکی فوجیں مدینہ کی طرف بڑھتی نظر آتی ہیں۔ آنحضرت صلعم صحابہؓ کو جمع کر کے مشورہ کرتے ہیں۔ صحابہؓ کھڑے ہو کر کہتے ہیں کہ "ہم حضرت موسیٰ کی قوم نہیں ہیں کہ کہیں گے" فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ "جا تو اور تیرا خدا لڑے ہم تو یہیں بیٹھے ہیں" ہم آپ کے دائیں سے لڑیں گے اور بائیں سے، آگے سے اور پیچھے سے یہاں تک کہ اگر آپ سمندر میں کودنے کا حکم دیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں۔

اب قریش کا لشکر قریب آگیا ہے مجبوراً مسلمان مقابلہ کے لئے نکلتے ہیں لیکن اب بھی بے سروسامانی کا یہ حال ہے کہ قریش کی ایک ہزار آہن پوش فوج کے مقابلہ میں کل تین سو تیرہ نفوس ہیں اور وہ بھی اس حال میں کہ صرف تین گھوڑے اور ستر اونٹ ہیں، زرہ بکتر کا کیا ذکر، کسی کے پاس پورے ہتھیار بھی مشکل سے ہیں۔ اگر کوئی سہارا ہے تو اللہ کا، اور کوئی طاقت ہے تو ایمان کی۔ دل

خدا کی طرف متوجہ ہیں اور زبانیں اُسکی یاد میں مشغول۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں سر جھکائے کہہ رہے ہیں کہ "خداوندا اگر یہ آج تیرے مٹھی بھر پرستار مٹ گئے تو پھر زمین پر تیری پرستش نہ ہوگی۔"

لڑائی شروع ہو جاتی ہے اور چند گھنٹوں میں میدان دشمنوں سے خالی ہو جاتا ہے۔

ذرا آگے بڑھئے، بدر کے کچھ عرصہ بعد مدینہ میں مردم شماری ہوتی ہے اور مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار نکلتی ہے۔ ایمان کے جوش میں یہ الفاظ زبانوں پر آجاتے ہیں کہ "جب ہم کم تھے تو کوئی ہمارے ارادوں میں تزلزل نہ پیدا کر سکا، اب جبکہ ہم خدا کے فضل سے ڈیڑھ ہزار ہیں تو اب دُنیا کی کون طاقت ہمارا بال بیکا کر سکتی ہے۔

اس واقعہ کو کئی برس گذر گئے ہیں، قریش متعدد معرکوں میں مسلمانوں کے مقابلہ میں ناکامیاب ہو چکے ہیں اسلئے تنہا نبرد آزمائی کی ہمت نہیں پڑتی، سارے جوار میں گھوم گھوم کر قبائل کو اُکساتے ہیں، خود مدینہ کے یہودیوں اور منافقوں کو سازش پر آمادہ کرتے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں فوجیں آکر مدینہ کو گھیر لیتی ہیں، مسلمان خندق کھود کر مدافعت کا بندوبست کرتے ہیں پریشانی کا یہ عالم ہے کہ نگاہیں کج ہیں، کلیجے منہ کو آگئے ہیں[1]۔

لیکن اس حال میں بھی ایمان کے جوش کا یہ حال ہے کہ زبانوں پر یہ الفاظ ہیں "ہم ہیں جنھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اسپر بیعت کی ہو کہ جبتک جان میں جان ہو ہم خدا کی راہ میں لڑتے رہیں گے۔" انکی قوت ایمانی کا یہ حال ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنی غطفان سے مدینہ کی کچھ سالانہ پیداوار دیکر معاملہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ قریش کا ساتھ چھوڑ دیں، صحابہؓ سے مشورہ فرماتے ہیں، انصار عرض کرتے ہیں کہ "اگر حکم ہو تو مجال انکار نہیں، لیکن اگر ہماری خاطر یہ انتظام ہے تو اسکی ضرورت نہیں، خدا کی قسم جب جاہلیت میں ہم سے لوگ دباکر نہ کچھ لے سکے تو اب

---

[1] زاغت الابصار و بلغت القلوب الحناجر ۱۲

جبکہ اللہ نے ہمیں اسلام کی عزت بخشی ہو یہ ذلت کیونکر گوارا کر سکتے ہیں۔

یا تو ہم دشمنوں کی صفوں میں انتشار پھیل جاتا ہے اور وہ بیس بائیس دن کی لاحاصل مشقت کے بعد بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور اس ہزیمت کے ساتھ کہ ابو سفیان اونٹ پر سوار ہوا اونٹ بندھا ہوا ہے۔ لیکن ہوش نہیں آتا اور جا کے بے تحاشا ایڑ لگائے جاتا ہے۔

ایک سال کا زمانہ اور گذر جاتا ہے مسلمان حج کے ارادہ سے مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں، قربانی کے جانور ساتھ ہیں۔ احرام بندھے ہوئے ہیں تلواریں میانوں میں ہیں۔ لیکن قریش کو اس پرامن قافلہ کا داخلہ بھی کہیں منظور نہیں۔ آگے بڑھنے سے روکتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صلح کی کوشش کرتے ہیں قریش کا سفیر خدمت مبارک میں حاضر ہوتا ہے تاکہ معاملہ کو طے کرے، یہاں ایک عجیب روحانی انقلاب کا نظارہ آتا ہے۔ واپس جا کر قریش سے کہتا ہے کہ میں نے قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے دربار دیکھے ہیں، عقیدت اور محبت کی یہ تصویر کہیں نظر آتی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بات کرتے ہیں تو ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے۔ ادب کی وجہ سے کوئی ان کو نظر بھر کے نہیں دیکھتا جو وضو کرتے ہیں جو تھوکتے ہیں لوگ انھیں لیکر ہاتھ و چہرے پر مل لیتے ہیں۔ لیکن قریش اسکے باوجود لڑائی کی ٹھان لیتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمانؓ کو سفیر بنا کر بھیجتے ہیں تھوڑی دیر میں خبر ہو جاتی ہے کہ قریش نے انھیں قتل کر دیا ہے۔ اب مسلمانوں کے دل جوش سے لبریز ہو جاتے ہیں۔ ایک درخت کے نیچے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ جاتے ہیں، اور صحابہؓ سے جان نثاری کی بیعت لیتے ہیں۔ اس بیعت میں جس قوت ایمانی کا اظہار ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو بیحد پسند آتا ہے اور ان الفاظ میں خوشنودی کا اظہار ہوتا ہے۔

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ

اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے راضی ہوا جبکہ وہ آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔

اور اس بیعت کو خدا کی بیعت قرار دیتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ۔ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْہِمْ ۔ جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں تو وہ اللہ تعالٰی سے بیعت کرتے ہیں۔ خدا کا ہاتھ انکے ہاتھوں پر ہے

اس صادقانہ جوش و خروش اور اس مجاہدانہ عزم و ہمت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ قریش ہمت ہار جاتے ہیں، اور مسلمانوں سے دس برس کے لئے صلح کر لیتے ہیں۔ یہ صلح مسلمانوں کے لئے "فتح مبین" ثابت ہوتی ہے اور دو برس بھی نہیں گذرنے پاتے ہیں کہ مسلمان مکہ میں فاتحانہ داخل ہو جاتے ہیں۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا۔

صلح حدیبیہ کے بعد اسلام کی تبلیغ کے دروازے کھل جاتے ہیں اور ہر جگہ اسلام کے سفیر پیام حق لیکر روانہ ہو رہے ہیں۔ ایک قاصد بصریٰ کے باجگزار رئیس کے پاس بھی جاتا ہے اور قتل ہو جاتا ہے اس خون ناحق کا انتقام ناگزیر تھا۔ تین ہزار فوج مدینہ سے روانہ ہوتی ہے۔ دشمن کی ایک لاکھ فوج مقابل ہے، وقت بہت نازک ہے لیکن مسلمانوں کا ذوق شہادت توقف کا متحمل نہیں حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ بڑے جوش سے فرماتے ہیں "ہم تعداد کی کمی و بیشی پر نہیں لڑتے ہم تو مذہب کی طاقت سے لڑتے ہیں" ان الفاظ سے سارے لشکر میں جوش کی لہر پیدا ہو جاتی ہے اور تین ہزار کا مختصر گروہ ایک لاکھ فوج پر حملہ آور ہوتا ہے، حضرت زیدؓ برچھیاں کھا کر شہید ہوتے ہیں، اب حضرت جعفرؓ آگے بڑھکر علم کو سنبھالتے ہیں اور اس شجاعت سے لڑتے ہیں کہ ایک ہاتھ کٹ جاتا ہے تو دوسرا ہاتھ علم کی طرف بڑھتا ہے، آخر وہ بھی اس راہ میں قربان ہو جاتا ہے تو علم کو سینہ سے چمٹا لیتے ہیں بالآخر برچھیوں کے نوے زخم کھا کر گرتے ہیں۔ ان کے بعد عبد اللہ بن رواحہؓ ہاتھ بڑھا کر علم سنبھالتے ہیں آخر کار وہ بھی جام شہادت نوش کرتے ہیں! اب حضرت خالدؓ فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں اور فتح حاصل کرتے ہیں[1]

---

[1] عام طور سے مشہور ہے کہ اس معرکہ میں مسلمانوں کو فتح نہیں ہوئی حضرت خالدؓ کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو دشمنوں کی زد سے نکال لائے لیکن ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں اس سے اختلاف کیا ہے اور صحیح روایتوں سے ثابت کیا ہے کہ اس لڑائی میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تفصیل کے لئے کتاب مذکور میں غزوہ موتہ کی بحث دیکھنا چاہئے۔ ۱۲

تاریخ کے کچھ اور ورق اُلٹیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی ہے، عرب میں ارتداد کی وبا شدت سے پھیل رہی ہے، متعدد جھوٹے نبی نبوت کے دعوے کر رہے ہیں، جو مرتد نہیں ہوئے ہیں انہیں بھی ایک بڑی جماعت زکوٰۃ کی ادائیگی سے منکر ہو گئی ہے... رومی حکومتیں عرب پر حملے کے ارادے کر رہی ہیں ان حالات میں لوگوں کی ہمتیں پست ہو رہی ہیں لیکن خلیفۂ رسولؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ابرو پر شکن بھی نہیں ہے وہ ایمان کی قوت سے معمور ہو کر قدم راہِ حق پر آگے بڑھا رہے ہیں۔ ایک طرف حضرت اسامہؓ کی سرکردگی میں شام کی طرف فوجیں بڑھ رہی ہیں، دوسری طرف مرتدین اور مانعین زکوٰۃ کی طرف تادیبی مہم جا رہی ہے اس عزم و ہمت کو دیکھ کر دشمنوں کی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں اور گنتی کے چند دنوں میں ہر طرف اسلام کا بول بالا ہو جاتا ہے۔

شام میں یرموک کا عظیم الشان معرکہ درپیش ہے، رومی فوجیں لاکھوں کی تعداد میں مقابل ہیں ایک بڑی تعداد مرنے پر تیار ہو کر پیروں میں زنجیریں ڈال رکھی ہیں تاکہ بھاگنے کا کوئی سوال ہی ذہن میں نہ آئے مسلمانوں کی کل تعداد تیس چالیس ہزار تعداد ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ایک سپاہی کے منہ سے نکل جاتا ہے، اف رومی کس قدر زیادہ ہیں، حضرت خالدؓ فرماتے ہیں کہ "فوجوں کی قوت تعداد کی کثرت پر نہیں ہے بلکہ دلوں کے استحکام اور ہمتوں کی بلندی پر فتح و شکست کا مدار ہے۔ فوجیں ملتی ہیں، گھمسان کا رن پڑتا ہے اور دنیا تعجب سے دیکھتی ہے کہ دشمنوں کی صفیں الٹ جاتی ہیں اور قلیل التعداد عرب رومیوں کی ٹڈی دل فوج پر غالب آ جاتے ہیں

قادسیہ کے میدان میں ایران کی پوری قوت امنڈ کر آ گئی ہے، فارس کا سپہ سالارِ اعظم رستم خود مقابلہ کے لئے نکلا ہے اور لاکھوں کی تعداد میں فوجیں حکم کی منتظر ہیں، جنگی ہاتھیوں کے غول کے غول ہمراہ ہیں، حوصلے یہ ہیں کہ کوئی دم میں عربوں کا قلع قمع کر دیا جائے گا، مسلمان چالیس ہزار بھی نہیں ہیں، سامان جنگ کا یہ حال ہے کہ سپاہیوں کو بھی میسر نہیں، تلواریں چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی ہیں، تیروں کی

یہ کیفیت ہو کر ایرانی سپہ سالار تمسخر کرتا ہو کہ "یہ تیلے کیا کام دیں گے"۔

مسلمان سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاصؓ ایسے بیمار ہیں کہ گھوڑے پر بیٹھنا ناممکن ہے، لیکن ہر سپاہی ایمان کے جوش سے معمور اور اسلام کی محبت میں سرشار ہو جنگ شروع ہوتی ہو، حالت اتنی نازک ہو کہ حضرت عمرؓ مدینہ میں بے چین ہیں، راتوں کو شعلوں کی روشنی میں جنگ جاری ہو۔ آخر ایمان کی طاقت غالب آتی ہو اور کئی دن کے خونریز معرکے کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہو کہ دشمنوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں، انکی فوجوں میں ابتری پھیل جاتی ہو، اور عرب کے بے سروسامان مجاہد ایران کی شوکت و عظمت کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔

پایۂ تخت مدائن فتح ہو چکا ہو، ایرانی منتشر فوجوں کو جمع کر کے پھر ایک کوشش کرنا چاہتے ہیں نہاوند میں زبردست معرکہ کارزار گرم ہے۔ نعمان ابن مقرنؓ اسلامی فوجوں کے قائد ہیں، جنگ بہت ہی سخت ہو، مسلمانوں کے دل خدا کی طرف متوجہ ہیں، سپہ سالار کامیابی کی دعا مانگتے ہیں، اور ساتھ ہی اپنی شہادت کے متمنی ہیں۔ دن ڈھلے فتح کے آثار نظر آتے ہیں، حضرت نعمانؓ کے دل میں شہادت کی اور تڑپ پیدا ہوتی ہے، تمنا پھر دعا کی شکل اختیار کرتی ہے، دعا قبول ہوتی ہو، کاری زخم کھا کر گرنے لگتے ہیں، ایک سپاہی سنبھالنا چاہتا ہے، مگر آپ منع فرماتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ "میدان کی طرف نظر رکھو۔" سپہ سالار کی موت سے عموماً فوج میں ہراس اور بزدلی پیدا ہو جاتی ہے اور فوجوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں، لیکن یہاں مسلمانوں کے یہاں رنگ ہی دوسرا ہو، اس حادثہ سے جوش میں مزید اضافہ ہوتا ہے بالآخر شام کے قریب دشمن منتشر ہو جاتا ہے۔ فتح کے بعد حضرت نعمانؓ لاشوں اور زخمیوں کے درمیان پڑے ہوئے ملتے ہیں، ابھی کچھ سانسیں باقی ہیں، ایک سپاہی سر زانو پر رکھ لیتا ہے، آنکھیں کھولتے ہیں اور جنگ کا حال دریافت فرماتے ہیں، فتح کا مژدہ سنکر مسکراہٹ آپکے لبوں پر کھیلتی ہوئی نظر آتی ہو اور فرماتے ہیں کہ اسکی اطلاع امیر المومنین کو دیجائے اور ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

حضرت معاویہؓ کا زمانہ ہے، حضرت عقبہ ابن نافعؓ شمالی افریقہ کی مہم پر مامور ہیں۔ ملک کے ملک اور علاقے کے علاقے فتح کرتے چلے جاتے ہیں، اب اسلامی فوجیں بحر ظلمات کے کنارے پہونچ گئی ہیں لیکن انکے جوش کا یہ عالم ہے کہ آپ بے تکلف سمندر میں گھوڑے ڈالدیتے ہیں، جب آگے بڑھنا ممکن نہیں نظر آتا تو کہتے ہیں کہ خدایا اگر یہ سمندر روک نہ ہوتا تو اس سرزمین کی آخری سرحد تک تیرے نام کی منادی کر آتے۔ اقبال نے اسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے —

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے   بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

انھیں عقبہ ابن نافعؓ کا ایک اور واقعہ سنئے۔ قیروان کی فوجی چھاؤنی بنانے کا ارادہ ہے یہ جگہ درندوں اور موذی جانوروں کا ایسا مسکن ہے کہ لوگ اس خیال کو دشوار سمجھتے ہیں لیکن مجاہد حق کی ہمت بلند کے آگے کوئی چیز ناممکن نہیں۔ کھڑے ہوکر پکار دیتے ہیں کہ "ہم لوگ یہاں چھاؤنی قائم کرنا چاہتے ہیں، تین دن کے اندر اندر تمام جانور یہاں سے چلے جائیں ورنہ ہمارے ہاتھ سے کسی کو بھی امان نہیں ملیگی"۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سارا کا سارا جنگل صاف ہوجاتا ہے اور کسی جانور کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔[1]

ولید بن عبدالملک کا زمانہ ہے۔ قتیبہ ابن مسلم ترکستان فتح کرچکے ہیں، اب چین فتح کرنے کا ارادہ ہے سفیر خاقان کے دربار میں روانہ ہوتا ہے۔ بادشاہ سے گفتگو ہوتی ہے، مسلمان سفیر گو اپنے مرکز سے ہزاروں میل دور ہے، لیکن ہمت کا یہ حال ہے کہ بغیر کسی خوف و ہراس کے شہنشاہ سے گفتگو کرتا ہے، شاہ چین کو تعجب ہوتا ہے بڑے رعب طریقہ سے کہتا ہے کہ "اگر ہم ایک ایک مٹھی خاک بھی ڈالدیں تو تم سب اسمیں دب کر رہ جاؤ گے"۔ لیکن سفیر نہایت ہی بیباکی سے جواب دیتا ہے کہ "موت کا ایک دن معین ہے تم اس قوم کو ہرگز فنا نہیں کرسکتے جو دمشق سے لیکر چین تک پھیلی ہوئی ہے"۔ بالآخر صلح کی گفت و شنید شروع ہوتی ہے۔ اسلامی سفیر شرائط پیش کرتا ہے، بادشاہ پوچھتا ہے کہ آخر شاہ سپہ سالار کیا چاہتے ہیں، سفیر جواب دیتا ہے کہ "انھوں نے

---

[1] مشہور مؤرخ ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں بانئ قیروان کے موقع پر اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے۔ ۱۲

قسم کھائی ہے کہ جب تک چین کی زمین کو پامال نہ کر ڈالیں گے، شہزادوں پر مہر غلامی نہ ثبت کریں گے اور خراج نہ وصول کر لیں گے واپس نہ ہوں گے۔ بادشاہ شرائط تسلیم کر لیتا ہے، اپنے شہزادوں کو خراج کے ساتھ بھیجتا ہے اور ایک طشت میں چین کی مٹی ساتھ کر دیتا ہے اور سفیر سے کہتا ہے کہ اپنے سپہ سالار کو عرض کیجئے کہ وہ اس مٹی کو اپنے قدموں سے پامال کر کے اپنی قسم پوری کریں۔

اسی عہد کا ایک اور واقعہ ہے۔ طارق ابن زیادؓ نے اسپین پر چڑھائی کی ہے، صرف بارہ ہزار فوج ساتھ ہے۔ شاہ اسپین ایک لاکھ فوج کے ساتھ مقابلہ کے لئے نکلتا ہے، طارق اپنی کشتیوں کو نذر آتش کر دیتا ہے اور سپاہیوں کے سامنے ایک ولولہ انگیز تقریر کرتا ہے۔

ایہا الناس العدو امامکم والبحر من ورائکم فاین المفر۔ "اے لوگو دشمن تمہارے سامنے اور سمندر تمہارے پیچھے ہے، پس کہاں بھاگنے کی راہ ہے۔"

فوج میں جوش و خروش چھا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسپینیوں کو شکست فاش ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اقبال نے ان اشعار میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت ۔۔۔ گفتند کار تو بہ نگاہ خرد خطا است
دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم ۔۔۔ ترک سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت ۔۔۔ ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

اسی زمانہ کا ایک اور واقعہ سنئے۔ سترہ سالہ نوجوان محمدؒ ابن قاسم سندھ کے دور دراز علاقہ پر چڑھائی کرتا ہے، تھوڑی سی فوج ہمراہ ہے، دشمنوں کی صفیں مقابلہ کے لئے آتی ہیں، لیکن ساری کوششیں بیکار ثابت ہوتی ہیں اور مجاہدین حق کی یہ مختصر سی فوج تھوڑے سے عرصہ میں سندھ کے وسیع صوبہ پر قابض ہو جاتی ہے۔

محمدؒ ابن بختیار خلجی ایک مشہور اسلامی سپہ سالار ہے، صوبہ بہار و بنگال پر حملہ آور ہوتا ہے۔

پایۂ تخت ندیا کی طرف دھاوا ہے۔ صرف اٹھارہ سوار ہمراہ ہیں۔ لیکن بے جھجک بازاروں سے گزرتے ہوئے راج محل کے سامنے پہونچ جاتے ہیں اور آناً فاناً اندر داخل ہو کر فتح کا جھنڈا نصب کر دیتے ہیں۔

یہ تاریخ کے چند مشہور واقعات ہیں جو سرسری طور پہ ذکر کر دیئے گئے ہیں۔ مسلمانوں کی ساری تاریخ اسی قسم کے بہت آفریں اور ایمان افروز واقعات سے پر ہے۔ نقل میں مگر

معاشی توازن کے نئے تخیل

از جناب مولانا سید شاہ عزالدین صاحب ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء

شاہ عزالدین صاحب اسلام کے نظام زکوٰۃ پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں، ذیل کا مضمون اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے (مدیر)

دُنیا میں روٹی کا سوال کم و بیش ہر زمانہ میں رہا ہے، لیکن موجودہ دور جو گذشتہ زمانہ کے لحاظ سے غیر معمولی بے چینی، بے آئینی اور غیر تسکین بخش سرمایۂ حیات اپنے جلو میں لایا ہے اپنے پیٹ اور اقتدار کی خواہشوں کے ماتحت نئے نئے بت تراشے ہیں، اشتراکیت، آمریت، فسطائیت اور جمہوریت سرمایہ داری وغیرہ کے نام سے مختلف نظام حیات کے بُت تراشے گئے ہیں اور انکی پرستش کیجا رہی ہے لیکن انمیں بعض تو اقتدار و حکومت کے نشہ نے پیدا کئے ہیں اور بعض روٹی اور سماج کی برابری کے جذبہ کے رہین منت ہیں۔ انمیں اشتراکیت یا سوشلزم کی زائیدہ کی صرف آخری مقصد کے لئے وجود میں آئی ہو۔

میں چاہتا ہوں تمام نوزائیدہ نظام آپکے سامنے آئیں پھر اشتراکیت کے نظام کو نمایاں کرکے اسلام کے اقتصادی اور فطری نظام کو پیش کروں تاکہ دنیا کو یہ معلوم ہوجائے کہ اسلام انسانی ہمدردی اور معاشی نظام کی کتنی اعلیٰ دلکش اور صحیح تصویر پیش کرتا ہے۔

نظام سرمایہ داری

ابتداءً دور جدید نے دولت کے حصول کے لئے مختلف مشینوں کی ایجاد کی جن سے زرخیز زمینوں شاداب پہاڑیوں اور وسیع کاشت کے علاقوں کی دولت کو نئی نئی صنعتی شکلوں کے ذریعہ قابو میں لایا جائے، اسطرح انھوں نے دنیا کی دولت سمیٹنا شروع کردی اور معاشی پیداوار کے بے انتہا

اسباب پر جو اکی بدولت سے کہیں زیادہ تھے قبضہ کر لیا اور یہ چیز سرمایہ داری کے نام سے موسوم ہوئی غرض سرمایہ داری معاشی پیداوار کے ایک ترقی یافتہ نظام کا نام ہوا لیکن پیدا شدہ معاشی سرمایہ کو ملک کے افراد پر کس طرح تقسیم کیا جائے۔ یہ سوال کبھی اس کے پیش نظر نہیں رہا۔ اس نظام کی حکومت ملک و قوم کی معاشی ضروریات سے بہت کم متاثر ہوتی ہے، جماعتی تفریق، شخصی ملکیت اور سرمایہ دار کا تسلط، معاشی منصوبہ بندی کی غیر مساوی صورت اسکا ناگزیر نتیجہ ہے۔

ان تکمیلوں میں سب سے زیادہ خطرناک چیز لیکن بہت عام اور ہوا سود کا کاروبار ہے، ربوا کا اصول یہ ہے کہ مال بغیر کسی محنت کے خود اضافہ حاصل کرے اور صاحب مال کسی نقصان کا ذمہ دار نہ ہو تاجر کتنی ہی ہوشیاری اور محنت سے کام کرے، کاریگر کتنی ہی جفاکشی اور دیدہ ریزی سے چیزیں تیار کرے لیکن نقصان سے بے خطر نہیں۔ لیکن سود خوار کسی قدر رقم سود پر دے اسکا نفع پائدار اور مستقل ہے اور اسکو کسی خطرہ کا اندیشہ نہیں اور نہ اسے کسی محنت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح بیع کی وہ بے شمار نا جائز قسمیں جو صرف کسب زر کے لئے پیدا کی گئی ہیں مثلاً سٹہ، بالنقد مال کے فرضی بیع اور بیع در بیع یہ سب محض سرمایہ جمع کرنے کا ذریعہ ہیں، حالانکہ یہ سب درحقیقت بیع نہیں ہے۔ لائف انشورنس یعنی زندگی کا بیمہ، چیزوں کا بیمہ مکان کا بیمہ وغیرہ یہ سب بظاہر جان و مال کے تحفظ کا ذمہ ہے، لیکن اس ذمہ داری کے بدلے بے شمار دولت جمع کر لیجاتی ہے اور یہ دولت کہاں سے سمٹی جاتی ہے؟ مزدور اپنا پیٹ کاٹ کر، کاریگر اپنا خرچ بچا کر تاجر اپنے نفع و نقصان سے بے پرواہ ہو کر اپنی پونجی ان سرمایہ داروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ سرمایہ داری ایک معاشی نظام ہے پیداوار دولت کا جو اپنی ذاتی اغراض یا مخصوص افراد کے مفاد کا ضامن ہے جس میں عوام کا کوئی حصہ نہیں۔

اشتراکیت یا سوشلزم

اشتراکیت یعنی سرمایہ کی مساوی تقسیم کا تخیل کوئی بالکل نیا تخیل نہیں ہے، دنیا کی قدیم تاریخ

میں بھی اس قسم کی تحریک کا سراغ ملتا ہو. ایک دور یونان پر بھی ایسا گذرا ہو جب وہاں اقتصادی مساوات کا گھمسان کا پیدا ہوا اور پوری طرح اس معاشرتی تفریق کو مٹانے کی کوشش کی گئی، لیکن یونان کا عقل و تدبر اس چیز میں ناکام رہا. دوسری مرتبہ چھٹی صدی عیسوی میں ایران کے مزدکیوں نے یہ اقتصادی مساوات پیدا کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور پورے ایران میں پوری قوت کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ سو برس تک اس کو جاری رکھا، یہی تحریک صنعتی انقلاب کے بعد یورپ میں اُبھری اور سوشلزم کے نام سے تمام یورپ پر چھاگئی اور پھر یہی تحریک کچھ عملی تبدیلیوں کے ساتھ روس کے نظام حکومت کی بنیاد قرار دی گئی، یورپ میں ابتداءً کارل مارکس اور انگلیز وغیرہ نے اسکا علم اپنے ہاتھ میں لیا، کارل مارکس کی کوششوں نے ۱۸۴۷ء میں لندن کے اندر اشتراکیوں کی ایک سوسائٹی قائم کی، پھر ان دونوں نے باہم مشورہ کرکے ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی، اس کانفرنس کے بعد ایک اشتراکی انجمن قائم کی گئی جسکا مقصد بورژوا (متوسط) طبقہ کو بالکل نیست و نابود کرکے اسکے اثر کو زائل کر دینا تھا، اور ایک ایسی سطح پیدا کرنی تھی جسمیں غریب و امیر کی تفریق مٹجائے. اور شخصی ملکیت کا خاتمہ ہو، ۱۸۴۸ء میں اشتراکیوں کا ایک منشور شائع کیا گیا جس کا اولین مقصد متوسط طبقہ کے مقابلہ میں کاشتکار اور مزدور یعنی طبقہ عوام کو لانا تھا.

"اس منشور کی اہم دفعات یہ تھیں"

(۱) جائداد کا بشکل زمین یا جاگیر خاتمہ کرنا.

(۲) آمدنی پر مزید انکم ٹیکس

(۳) وراثت کے تمام حقوق کو ختم کرنا

(۴) لین دین کے تمام معاملات کو پورے اختیارات کے ساتھ حکومت کے ہاتھ میں بذریعہ ایک قومی جنک کے دیدینا.

(۵) حکومت کے علاوہ دوسرے کارخانوں نیز ذرائع دولت میں توسیع

(۶) تمام افراد کو یکساں کام کرنے کے لئے مجبور کرنا۔

(۷) نقل و حمل کے ذرائع و وسائل کا حکومت کے قبضہ میں ہونا۔

(۸) زراعت کا صنعتوں سے مدغم کر دینا۔

(۹) تمام بچوں کو عام مدرسوں میں مفت تعلیم دلانا اور کارخانوں میں بچوں سے کام لینے کے طریقہ کو ختم کرنا۔

اسکے بعد پہلی بین الاقوامی اشتراکی کانگریس لندن میں ہوئی اسکے بعد ۱۸۷۲ء تک مختلف کانگریسیں منعقد ہوتی رہیں جن میں مختلف یورپین ممالک کے نمایندے شریک ہوا کئے اور کانفرنسوں کے نتیجہ میں مزدوروں میں سیاسی بیداری پیدا ہو گئی اور سرمایہ دار و مزدوروں کی باہمی منافرت کا آغاز ہو گیا۔ اشتراکیت تمام یورپ میں بڑی تیزی سے پھیلنے لگی اور چونکہ صنعتی اسباب انقلاب نے بڑی بڑی مشینیں ایجاد کر دی تھیں اسلئے کارخانہ دار سرمایہ دولت و زر کے مالک بن بیٹھے۔ لاکھوں مزدور ان کارخانوں میں کام کرتے تھے اور محض پیٹ بھرنے کی اُجرت پاتے تھے، دوسری طرف سرمایہ دار اور مالکان مل اور کارخانہ دار کروڑوں روپے نفع میں کماتے تھے اور عالی شان محلوں میں رہتے تھے، اسکا قدرتی اثر یہ ہوا کہ سماج دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک سرمایہ دار دوسرا مزدور، یا کارکن طبقہ مزدوروں کی زبوں حالی نے ان اشتراکیوں کے لئے میدان صاف کر دیا اور انھوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر کارخانہ دار اور سرمایہ دار کے خلاف یہ کہکر جذبہ منافرت پھیلانا شروع کر دیا کہ کام تم کرو محنت تمہاری ہو لیکن یہ سرمایہ دار تمہاری محنت سے فائدہ اُٹھا کر داد عیش دیں تم ان سے انتقام لو۔

اشتراکیت کے اُصول

کارل مارکس نے ۱۸۶۷ء میں اپنی کتاب کیپٹل "سرمایہ" لکھی جو اشتراکیت کا اصل کہلاتی ہے

اور جس سے اشتراکی نظریہ کا ہمیں صحیح علم ہوتا ہو، اس کتاب میں اسکا بنیادی بیان یوں شروع کیا گیا ہو قانونی تعلقات حکومت کی قسمیں، رسوم و عادات، مذہب و فلسفہ ہمیشہ اُن مادی حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں جنہیں انسانوں نے اپنے آپ کو گھرا پایا ہے۔ اُسکے نزدیک انسانی ارتقار اور نشو ونما کی تاریخ کوئی خاص چیز نہیں، بلکہ یہ مختلف طبقات انسانی کے جنگ کی ایک داستان ہو، جسمیں برسر اقتدار طبقہ نے ہمیشہ اپنے مفاد کو مد نظر رکھکر معاشرتی اور تمدنی اداروں کو بدل ڈالا ہے۔

الغرض کارل مارکس کے تین بنیادی نظریے یا اصول ہیں۔

(۱) قانونی تعلقات، حکومت کی شکلیں، رسوم و عادات، مذہب و فلسفہ محض ابتدائی مادی حالات کے نتیجے ہیں۔ انسانی ارتقار و نشو ونما مختلف طبقات کے جنگ کی ایک داستان ہو، برسر اقتدار طبقہ نے ہمیشہ اپنے مفاد کو مد نظر رکھکر معاشرتی اور تمدنی اداروں کو بدلا ہے۔

(۲) طبقہ وارانہ جنگ انسانی سوسائٹی اور انسانی ارتقار کے لئے ناگزیر ہی، موجودہ سوسائٹی میں سرمایہ کے ایک جگہ یا چند جگہ جمع کردینے کے سبب دو گروہ پیدا ہوگئے ہیں، ایک بورژوا یا سرمایہ دار دوسرا عامل اکارکن؛ ان دونوں طبقوں کے مفاد کبھی ایک نہیں ہوسکتے، نئی انسانی سوسائٹی اسوقت تک نہیں بن سکتی جبتک ایک ایسا انقلاب نہ بپا ہو کہ بورژوا طبقہ پر کارکن طبقہ پوری طرح غلبہ پالے۔

(۳) محنت ہی دولت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ہو، منافع اور بچت کی رقم پر مزدور طبقہ کا حق ہے نہ کہ سرمایہ دار طبقہ کا۔

"کیپیٹل" میں اشتراکیت کا تیسرا نظریہ، یہ اشتراکیت کی جان ہے اسکا مطلب یہ ہو کہ محنت ہی دولت پیدا کرنیکا واحد ذریعہ ہو، اور دولت جس نے اسکے حاصل کرنے میں محنت کی ہو اسکی ملک ہو اسلئے سرمایہ دار مزدوروں سے محنت لیکر جو تھوڑی سی رقم مزدوری کی صورت میں ان کو دیدیتے ہیں اور بقیہ منافع و بچت خود ہضم کرجاتے ہیں یہ ان کی رقم نہیں کہی جاسکتی کیونکہ انھوں نے اسکے حاصل کرنے میں کوئی

محنت نہیں کی ہے اسلئے کل رقم مزدوروں کی ہے جنھوں نے اپنی محنت سے اُسے پیدا کیا ہے۔

یہ تو [illegible] کے اصول تھے جن سے آپنے مذہب، فلسفہ، حکومت کی ہیئت ترکیبی اور [illegible] کے متعلق [illegible] رائے معلوم کی۔ لیکن اخلاقیات کے متعلق بھی آپ اشتراکیت کے [illegible] کر لیجیے۔ لینن نے اپنے دوست گارگی کے اس سوال کے جواب میں کہ کیا [illegible] نہیں ہے کہا کہ میرے دوست تم سے کس نے کہا کہ میں نے کبھی اخلاق [illegible] اخلاقی اصول اپنے پیش نظر رکھا۔

لینن نے ایک دوسرے دوست کو یہ لکھنے میں کبھی کوئی تامل نہ کیا کہ اخلاق و اعزاز کا [illegible] میں کوئی وجود نہیں۔

لینن کے [illegible] دوستوں اور دوش بدوش کام کرنیوالوں نے جب ناجائز رقم لینے کی [illegible] کہا میں یہ روپیہ ضرور لوں گا، کیا تم بھی نیک چلنی اور دیانتداری [illegible] طبقہ کے [illegible] تم نے اسوقت مجھے کیوں سراہا جبکہ میں نے ٹیلے کے ڈاکخانہ پر [illegible] روبل حاصل کئے تھے۔ تم اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ روپے صرف متوسط [illegible] تھے بلکہ غریب کسانوں اور تباہ حال مزدوروں کے بھی تھے۔ اسکے باوجود تم نے تحسین و آفرین [illegible] دوستو! ان باتوں کو چھوڑو اور جائز و ناجائز صحیح اور غلط کے متعلق سرگرداں اور [illegible] ہو۔

[illegible] آسن ڈاسکی اپنی کتاب موسوم لینن میں لکھتا ہے، لینن نے ولسن سے جعلی روسی نوٹ بنا دینے کی فرمائش کی، ولسن نے ایسا کیا اور دس دس روبل کے پانچ سو جعلی نوٹ بنا دیے۔ لینن نے اسکا دلی شکریہ ادا کیا اور ان جعلی نوٹوں کو نائیڈون میں تبدیل کرکے لندن لیگیا

له یان اسلا زم اینڈ سوشلزم مسٹر شبیر حسین قدوائی ۱۲

اور وہاں رجسٹر کا فرضی جرمن نام اختیار کیا، اتفاقاً ایک موقع پر ٹراٹسکی نے اظہار افسوس کیا کہ ہم اشتراکیوں کی حیثیت ایک باغی گروہ سے زیادہ نہیں تو لینن نے ان الفاظ میں اسے تشفی دی کہ گھبراؤ نہیں ہمارے پاس سرکاری مطبع ہو جو غیر ملکی نوٹوں کی کسی تعداد کو تیار کرسکتا ہے یعنی جعلی نوٹ بنا سکتا ہے۔

غور کیجئے وہ اشتراکیت جو انسانوں میں عدل و انصاف اور مساواتِ رزق کی عملی جلوہ گری کی خواہشمند ہے اخلاقیات کے بارے میں کسقدر تہی مایہ ہے۔

ہندوستان کا تقلیدی سوشلزم جسے بڑے لیے چوڑے دعووں اور دلفریب فسوں کاری کے ذریعہ عوام کے دل و دماغ پر مسلط کرنیکی کوشش کیجا رہی ہے وہ بھی اخلاقیات مذہب اور انسانی جوہر کمال سے بالکل عاری ہو اور ماسکو کا یہ کھلا ہندوستان کے طول وعرض میں بڑی ہوشیاری یوں چابکدستیوں کے ساتھ تمام جذبات انسانیت پر خس و خاشاک ڈالتا ہوا کھیل رہا ہو اور لینن وٹراٹسکی کی ذریت اسے کامیاب ترین مقصود حیات بتا رہی ہو لیکن اسکا پس منظر جو کچھ ہو وہ پیش نظر لایا جاتا ہے اگرچہ ہندوستان کے سوشلسٹ صاف لفظوں میں مذہب کی مخالفت کا اعلان کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن حقیقت کبھی نہ کبھی سورج کی طرح نمایاں ہوکر رہتی ہو، ایک سوشلسٹ نے ناچار اپنے ضمیر کی آواز عریاں کردی اور وہ ایسا کرنے کے لئے مجبور تھا۔

میرٹھ کے مشہور مقدمہ سازش کے ایک ملزم مسٹر ادھیکاری نے عدالت کے سامنے جو بیان دیا تھا وہ حسب ذیل ہے۔

"مارکس کے پیرو اور مادہ پرست ہونیکی حیثیت سے ہم مذہب کے قطعی مخالف اور خدا کے منکر ہیں مگر ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مذہب کے خلاف ایک نظری اور خیالی پروپگنڈا کرنے سے مذہب فنا نہیں ہوسکتا لینن اس بات پر زور دیتا ہو کہ مذہب کے خلاف جد و جہد طبقاتی جنگ کی بنیاد پر

ہونی چاہئے۔"

چنانچہ کارخانہ دار اور مزدور، زمیندار اور کسان کی طبقاتی جنگ ہندوستان میں سوشلسٹوں نے شروع کر دی اور سامراج کے نام سے ہر قسم کے سرمایہ دار کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا کھلے الفاظ میں درس دیا جانے لگا، آگے چل کر مسٹر اودھیکاری اپنے بیان میں کہتے ہیں۔

آج کل مذہب کی تبلیغ کے بارہ میں ہماری جو روش ہو اُسے واضح طور پر اشتراکیوں کی انجمن کے پانچویں اجلاس نے حسب ذیل الفاظ میں صاف اور واضح کر دیا ہے۔

"بورژوا طبقہ کے پھیلائے ہوئے تعصبات و توہمات کے خلاف جد و جہد کے جتنے شعبے ہیں ان میں سب سے زیادہ ضرورت مذہب کے خلاف جنگ کی ہے۔ مگر یہ جنگ نہایت ہوشیاری اور احتیاط سے ہونی چاہئے۔ خصوصاً محنت کش عوام میں جنکی روزمرہ کی زندگی میں مذہب سرایت کئے ہوئے ہے اور ان میں اسکی جڑیں بہت گہری ہیں۔"

اشتراکیوں کے نزدیک، مذہب بورژوا طبقہ کی پیداوار ہے، بورژوا طبقہ سے مراد اوسط درجہ کے خوش حال لوگ ہیں اسی طبقہ نے عوام کو اپنے قابو میں رکھنے کے لئے انکی آنکھوں پر مذہب کی پٹی باندھ دی ہے۔

مسٹر اودھیکاری کے بیان سے حسب ذیل باتیں بالکل صاف ہو گئیں۔

(۱) ہندوستان کے سوشلسٹ مذہب کے دشمن خدا کے منکر اور مارکس کے پیرو ہیں۔

(۲) مذہب کو فنا کرنے کے لئے محض پروپیگنڈا کافی نہیں بلکہ اسکے لئے عوام و خواص کے درمیان غریبی اور روٹی کے نام سے طبقاتی جنگ برپا کرنا نہایت ضروری ہے۔

(۳) ادنیٰ طبقہ کی روزمرہ کی زندگی میں اوسط طبقہ کے زور سے مذہب نے اسقدر گہری جڑ پکڑ لی ہے کہ مذہب کے خلاف نہایت احتیاط سے جنگ کرنی چاہئے ورنہ کھلے لفظوں میں مذہب کی

مخالفت سے وہ بھڑک اٹھیں گے اور کام خراب ہو جائے گا۔

(۴) مذہب کے لانیوالے خدا کی طرف سے کچھ برگزیدہ اور مقدس ہستیاں نہیں بلکہ بورژوا طبقہ کے خود غرض و دنیا دار تھے، اسلئے اشتراکی جدوجہد میں سب سے زیادہ اہم کام مذہب کی بیخکنی ہو۔

سٹر ادھیکاری کے اس بیان کی روشنی میں جو شخص یہ کہکر سوشلزم کی حمایت کرے کہ وہ مذہب کا مخالف نہیں وہ جھوٹا دغاباز یا کم از کم اتنا عیار و مکار ضرور ہو کہ مذہب سے کھلی بغاوت کرکے مذہب پرست ہندوستانیوں میں ننگو بنا نہیں چاہتا ورنہ مذہب سے زیادہ غریبوں کا غمخوار اور مسکینوں کا دستگیر اور کون ہو سکتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا ماہانہ رسالہ

دارالعلوم

مدت مدید سے مخلص اور دیندار مسلمان اپنے دینی و علمی مرکز دارالعلوم دیوبند کی طرف سے ایک علمی و مذہبی رسالہ کے اجراء پر مصر تھے۔ الحمد للہ کہ انکی یہ آرزو پوری ہو گئی اور بلا واسطہ دارالعلوم کی ملکیت و اکابر علمائے دیوبند کی سرپرستی و نگرانی میں رسالہ "دارالعلوم" جاری ہو گیا۔ رسالے کے معیار کی بلندی اور اسکی خوبیوں کا اندازہ صرف اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس میں جماعت دیوبند کے جلیل القدر علماء کے بیش قیمت مضامین مسلسل شائع ہوں گے۔ رسالہ "دارالعلوم" کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ مسلمان جس صحیح اور قابل اعتماد مذہبی رہنمائی کی امید اپنے مذہبی مرکز دارالعلوم دیوبند سے رکھتے ہیں اسے صرف یہی رسالہ پورا کر سکتا ہے۔ اس رسالہ کا کوئی تعلق کسی شخص کی ذات سے نہیں بلکہ براہ راست دارالعلوم سے ہے یہی اسکی ساکھ اور استحکام کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ مخلص اور دیندار مسلمانوں سے توقع ہے کہ وہ اس رسالہ کے معاونین میں شامل ہونا اپنا ایک ضروری جماعتی فریضہ تصور فرمائیں گے۔ کاغذ وغیرہ کی انتہائی گرانی کے باوجود سالانہ چندہ صرف دو روپیہ ہے، نمونہ مفت طلب فرمائیں۔ وی۔ پی طلب کرنیکے بجائے اپنا اور اپنے احباب کا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں۔ (عبد الوحید ناظم و مرتب رسالہ دارالعلوم دیوبند)

الندوہ کو پڑھکر

(از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی)

آپنے یہ ہمارے گم شدہ مخدوم و دوست مولوی ضیاء احسن علوی کو تو خوب ڈھونڈھ نکالا ان کا سلسلۂ مضمون ماشاء اللہ، اور سبحان اللہ! مغز و معلومات کے لحاظ سے خوب، اور زبان و انشاء کے لحاظ سے خوب تر! الندوہ دوبارہ جو نکلا، یہ کوئی اور خدمت بالغرض نہ بھی ہو، تو یہ خدمت بجائے خود کیا کم ہے! البتہ کتابت کی غلطیاں تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ مولانا ابوالکلام نے پرچہ کا نام لسان الصدق نہیں، یہ تو بہت بعد کو سہ ماہی کی صورت میں قاضی تلمذ حسین نے نکالا تھا، "لسان الصدق" تھا۔ قصبہ کرسی ہونہ سے تو ایسا قریب نہیں البتہ شرر مرحوم کا ننہیال غالباً کرسی میں تھا۔ بس اتنا سہارا اودھ پنچ کی ہجوگوئی کے لئے کافی تھا۔

اسی پرچہ میں مولانا اعزاز علی کا مضمون بھی ہم طالبعلموں کے بڑے کام کا ہے، کم سے کم میں تو اس سے بہت مستفید ہوا۔ یہ سلسلہ بھی آپ خوب نکال رہے ہیں اور بڑے بڑے چھپے رستموں کو گوشہ سے باہر لا رہے ہیں۔ والسلام

عبدالماجد

دریاباد۔ بارہ بنکی

۱۰ر اکتوبر ۴۱ء

حالات ندوہ

رمضان کی تعطیل کے بعد ۵ شوال (۲۷ اکتوبر) کو دار العلوم کھل گیا اور نئے تعلیمی سال کا آغاز ہو گیا، طلبہ تقریباً سب آگئے ہیں نئے داخلے بھی ہو رہے ہیں۔ دار العلوم میں تعلیم کی کوئی فیس نہیں لیجاتی البتہ جو طلبہ دار الاقامہ میں قیام و طعام کا انتظام چاہتے ہیں انھیں صرف ماہوار ادا کرنے پڑتے ہیں، مزید معلومات کے لئے مہتمم صاحب دار العلوم سے مفصل دستور العمل طلب کیا جائے۔

پہلے درجہ سے پانچویں تک کے نتائج تعطیل سے پہلے ہی شائع ہو گئے تھے، اوپر کی جماعتوں کے نتائج آخر رمضان میں شائع ہوئے۔ کامیابی کا تناسب حسب ذیل ہے۔

کامیاب	۹۷
ناکام	۲۴

امتحان کے بعد حسب معمول طلبا درجہ ہشتم کی الوداعی دعوت ہوئی، اس موقع پر متعدد وداعی تقریریں ہوئیں اور کئی پُر اثر نظمیں پڑھی گئیں، جنمیں نذیر علی متعلم دار العلوم کی نظم بہت پسند کی گئی، آخر میں ناظم ندوہ اور منتظمین دار العلوم کی جانب سے مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ نے ایک مختصر تقریر میں طلبہ کو بیش قیمت نصیحتیں فرمائیں۔

پچھلے دو مہینوں میں متعدد دوستوں اور بزرگوں نے اپنی مہمانی کا شرف بخشا جنمیں مولانا شاکر علی صاحب ندوی سیاح جاپان، مولانا ریاست علی صاحب ندوی سابق رفیق دار المصنفین و حال مدیر پیام

اور مولانا محمد عاصم صاحب ندوی کیٹلاگر اورینٹل لائبریری پٹنہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں شاکر علی صاحب ایک مدت کے بعد تشریف لائے تھے لیکن دل ندوہ کی محبت سے خالی نہ تھا، گوشہ گوشہ کی سیر کی، ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ندوی دوستوں سے ملاقات کی، طلبہ کے اصرار پر ایک دن انھیں جاپان کے سفر میں تجارتی تجربات سنائے۔ ریاست صاحب بھی عرصہ کے بعد آئے تھے مگر دل بدستور ندوہ کی محبت سے معمور تھا، گو بعض مجبوریوں کی بنا پر قیام مختصر رہا لیکن اسکی خوشگوار یاد ہنوز تازہ ہے۔

مسعود صاحب اپنے ساتھ ایک بڑی طویل تاریخ رکھتے ہیں جسکی یاد آج بھی وجہ اشتیاق ہے۔ بیت الزمان بعید وغالباً ۱۹۴۲ء کے اوائل میں وہ ندوہ آئے اور یہاں کی زندگی میں اسطرح گھل مل گئے کہ پچھلے دس بارہ برس کی تاریخ کا کوئی ورق ان کے ذکر سے خالی نہیں۔ الاصلاح، النادی العربی، بزم ادب، بزم جمالی، مجلس بزم لسان، مجلس اصلاح خیال، جماعت رفقائے خاص سبھی میں برابر کے شریک تھے۔ اس عرصہ میں مشکل سے کوئی تحریک ایسی ہوگی جسمیں وہ ندوہ کی پوری روح کے ساتھ شریک نہ ہوں، الضیاء کی ادارت اور دارالعلوم کی مدرسی تربیت بعد کی چیزیں ہیں انکی ندویت اسی دن سے آشکار تھی جب انھوں نے پہلی مرتبہ ندوہ میں قدم رکھا۔ ادھر تقریباً تین برس سے اورینٹل لائبریری پٹنہ میں کام کر رہے ہیں لیکن اس دوری کے باوجود ندوہ کی محبت میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ شاید بعد منزل نے آتش عشق کو اور فروزاں کر دیا ہے، یہاں کی انجمن طلباء قدیم اور حلقہ معین الندوہ اس کا تازہ ثبوت ہیں اس ہفت روزہ قیام نے پچھلی صحبتوں کی یاد تازہ کر دی، عہد ماضی کے بھولے ہوئے خواب یاد آنے لگے دوستوں کی رنگین محفلیں ایک بار پھر نگاہوں کے سامنے آگئیں اور بے اختیار جی چاہنے لگا کہ۔

اک بار ہوں پھر جمع وہ احباب پرانے
باتیں ہوں وہی پھر وہی قصے ہوں پرانے

Regd. No. A-596.

کیا آپ ترقی کرنا چاہتے ہیں؟

کیا آپ اپنی تجارت کو فروغ دینا چاہتے ہیں	کیا آپ اپنی آمدنی بڑھانا چاہتے ہیں

ان مسائل کے حل کے لئے یہ چند صفحات ضرور ملاحظہ کریں اس کا مطالعہ آپکے لئے بہت ہی نفع بخش ہوگا صدیوں کے تجربے اور ہزار ہا روپیہ کے خرچ سے بہترین دلوں اور دماغوں کی تدبیروں کا نچوڑ ہے؟

کامیاب زندگی بسر کرنے کا بھید	کاروباری لوگوں کے لئے کامیابی کی کلید ہے

نام و نمود شہرت اور عزت حاصل کرنے کے بے خطا نسخے

آپکو طلسم عمل نامی کتاب میں ملیں گے!

ملنے کا پتہ

صدیق بک ڈپو امین آباد لکھنؤ

پبلشر سید حامد علی، پرنٹر رانکے لال سکسینہ، مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

(11)

الندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتبہ

سید ابوالحسن علی ندوی

استاذ تفسیر و ادب

عبدالسلام قدوائی ندوی

استاذ تاریخ و اقتصادیات

الندوہ

زیر نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۲ شوال المکرم ۱۳۶۰ھ مطابق نومبر ۱۹۴۱ء نمبر ۱۱

قیمت فی پرچہ تین آنے سالانہ دو روپے

تمام خط وکتابت اور ترسیل زر منیجر رسالہ الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونی چاہئے

شذرات

ہم نے اپنی کسی گذشتہ اشاعت میں عربی مدارس کی اصلاح اور علماء کی از سر نو تنظیم کے متعلق لکھا جا چکا ہے، اس عرصہ میں پے در پے حالات کچھ ایسے پیش آتے رہے کہ یہ خیالات روز بروز پختہ ہوتے گئے زمانے کے رجحان کا تقاضا ہے کہ علماء اور منتظمین مدارس جلد سے جلد بیدار ہوں، گردوپیش کا جائزہ لیں اور اپنی اصلاح و تنظیم کے بعد آئندہ حوادث سے مقابلہ کے لئے تیار ہوں۔ یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ ہمارے یہ دینی مدارس اسلام کے قلعے اور اس کے مدافعتی مرکز ہیں، ان قلعوں کی رخنہ بندی اور ان مورچوں کی کمک بھی وقت کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔

عربی مدارس کے قیام کی سب سے بڑی غرض یہ تھی کہ یہاں دین و ملت کے ایسے سپاہی تیار کئے جائیں جو ہر حال میں اسلام کی حفاظت کر سکیں اور الحاد و بیدینی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکیں۔ آغاز کار کے وقت ان درسگاہوں نے اس زمانہ کے حالات کے مطابق مفید و مؤثر لائحہ عمل تیار کیا تھا۔ اور نصاب و نظام تعلیم کے ایسے خاکے بنائے تھے جو اس وقت کی ضرورت کے مطابق تھے جب تک وہ فضا قائم رہی یہ نظام تعلیم مفید اور کارگر ثابت ہوا لیکن اب جبکہ عرصہ سے حالات بدل چکے ہیں ضرورت ہے کہ ہماری درسگاہوں میں بھی انقلاب ہو، زمانہ کی نئی ضرورتوں کے مطابق پھر سے نصاب تعلیم مرتب ہو اور تعلیم و تربیت کے ایسے اسلوب اختیار کئے جائیں جو طلبہ کو وقت کی ضرورتوں کے مطابق زندگی کے نئے میدانوں کے لئے تیار کر سکیں، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آج کے طلبہ کل کے علماء ہوں گے، قوم کی باگیں ان کے ہاتھ میں ہوں گی اور یہی کشتی ملت کے ناخدا ہوں گے۔

اسلام دوسرے مذاہب کی طرح صرف چند دعاؤں اور عباداتوں تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے

تمام گوشوں پر محیط ہو۔ دین و دنیا کی راہبانہ تفریق کی اسلامی تعلیم میں کہیں گنجائش نہیں۔ ضرورت ہے کہ اسلامی تعلیم گاہوں کا نصاب و لائحۂ عمل ترتیب دیتے وقت یہ حقیقت پیش نظر رہے تاکہ آئندہ کوئی بنیادی غلطی نہ ہونے پائے اور ایسے تعلیمی مرکز قائم ہوسکیں جو دین و دنیا کی جامعیت کے نمونے ہوں۔ آج جو فتنے اٹھ رہے ہیں ان کا تدارک اگر ممکن ہے تو صرف اسی وقت جبکہ ہم اس بنیادی سوال کو حل کرلیں اور اس اصول کی روشنی میں اپنے مدارس پر ایک اصلاحی نظر ڈال لیں۔

یہ باتیں عرصہ سے ہو رہی ہیں اب شاید مشکل ہی سے کوئی حلقہ ایسا ہو جو حالات کی نزاکت کو محسوس نہ کرتا ہو اور اس کے تدارک کے لئے بیقرار نہ ہو۔ ضرورت ہے کہ یہ باتیں اب عمل کا قالب اختیار کریں اور خیالی خاکوں میں حقیقت کا رنگ بھرا جائے۔ دین و ملت کے خدمت گزار کسی جگہ جمع ہوں جزئی اور فروعی اختلافات نظر انداز کرکے مستقبل کی فکر کریں اور آنیوالے خطرات کے پیش نظر ایک نئی تنظیم اور ایک نئے اتحاد کی بنیاد ڈالیں، جہاں تک ندوہ کے خادموں کا تعلق ہے وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اتحاد و تعاون کے لئے تیار ہیں اور اپنی بساط کے مطابق خدمت کے لئے حاضر ہیں۔

عربی تعلیم کے سلسلہ میں عرصہ سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ کوئی ایسا نصابی سلسلہ مرتب ہو جس کی مدد سے ترجمہ و انشاء کی مشق آسانی سے کرائی جاسکے۔ کمپوزیشن کی بعض مصری ریڈریں ملتی ہیں لیکن وہ ہماری ضرورت کے لئے ناکافی ہیں، طلبہ اور معلمین کو یہ سنکر مسرت ہوگی۔ مولانا محمد ناظم ادیب دار العلوم ندوۃ العلماء ایک اسی قسم کا سلسلہ مرتب کررہے ہیں، پہلا حصہ پریس میں جاچکا ہے، دوسرے کا خاکہ تیار ہو رہا ہے۔

میری محسن کتابیں

از مولانا ... صاحب ... پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

پہلے جب میں کاٹھیا واڑ سے دہلی آیا تو چونکہ اردو اور فارسی دونوں سے نابلد تھا اس لئے تین سال ... ابتدائی تعلیم میں صرف ہوئے۔ اور شرح جامی تک پہونچا اس کے بعد یکایک توفیق الٰہی ... معلوم ہوا کہ میں غلط راستہ پر جا رہا ہوں۔ چنانچہ یہ سب میں نے چھوڑ دیا۔ اساتذہ کو بہت ... اپنی کاوش پر اعتماد کیا اور حسب ذیل کتابوں کو مع شروح کے بہت غائر نظر سے مطالعہ کیا۔ صرف میں شروح شافیہ۔ نحو میں شروح الفیہ اور مفصل الاشباہ والنظائر اور بعض قلمی ... مغنی اللبیب اور تسہیل الفوائد وغیرہ۔ الغرض فقہا اور منطقیین کی نحو سے نجات ملی کافیہ ... نے بعض ... مسائل سے نحو کو بیزار کیا۔ مثلاً اضافۃ موصوف الی صفتہ ولا صفتہ ... کو ... شاذ حالانکہ پوری عربی زبان ان اضافتوں سے لبریز ہے۔ نیز بعض اس قسم کی چیزیں جن میں تاویلات کا دروازہ کھولا گیا ہے اور ناحق ایک متعلم نحو کو فضول ... کاوش اور ... مصیبت میں پھنسایا ہے ان کتابوں سے بدظن کر دیا کہ طالب علم کا مقصد ... عربیت کی اصلاح ہے کسی نحو کی جنبہ داری۔

پھر مفصل اور کتاب سیبویہ کے مطالعہ نے ادب کی طرف متوجہ کیا۔ شواہد نحویہ کی تلاش نے ان دیوانوں اور ان کی شروح کی طرف پہونچایا۔ ادب کے سلسلہ میں معلوم یہ ہوا کہ ہم غلط راستہ کی طرف جا رہے ہیں ہم کو مفردات یاد کرنے چاہئیں۔ اور مفردات سے بھی پہلے ضرورت ہے کہ ثلاثی مجرد کے ابواب یاد کئے جائیں یہ سب سے مشکل کام ہے اس لئے کہ اس میں قیاس کوئی مدد نہیں کرتا۔ اس کے بعد پھر مفردات لغویہ کو یاد کرنے کے لئے ان ان کتابوں پر نظر کی اور یاد کیں کفایۃ التحفظ، فقہ اللغۃ ثعالبی، الفاظ الکتابیہ

ہمدانی، نظام الغریب وغیرہ، اور اس سے آگے بڑھ کر اصلاح المنطق اور تہذیب الالفاظ وغیرہ وغیرہ کسی زمانہ میں معلقات عشر اور پانچ سات اور قصیدے جن کو عربی میں بہترین کہا جاتا ہے اور معلقات کے درجہ کے سمجھے جاتے ہیں ان کو یاد کیا، علاوہ بریں مجامیع ادبیہ اور دواوین شعریہ جن کا بیشتر حصہ یاد کیا وہ حسب ذیل ہیں دیوان متنبی اور حماسہ (تقریباً مکمل حفظ) جمہرۃ اشعار العرب مفضلیات نوادر ابی زید، کامل مبرد، کتاب البیان والتبیین، ادب الکاتب مع اقتضاب۔

میں نے حماسہ، متنبی، مقامات اور سقط الزند، ڈپٹی نذیر احمد صاحب مرحوم سے پڑھی ڈپٹی صاحب کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ وہ ترجمہ اس قدر خوبصورت کرتے تھے کہ تعریف نہیں ہو سکتی، ان کو عربی نظم کا بہت عمدہ مذاق اور اس پر زبردست قدرت تھی، مگر ان کی ادبی قابلیت کچھ خداداد تھی، کتابوں کی چنداں منت نہیں معلوم ہوتی تھی، وہ میرے ساتھ بڑی تواضع سے پیش آتے، افسوس ہے کہ سقط الزند کے ایک شعر پر میری ان کی مفارقت ہو گئی سقط الزند میں تین شعر ہیں۔

وعلی الدھر من دماء الشھید   ین علی ونجلہ شاھدان
فھما فی اواخر اللیل فجرا   ن وفی اولیاتہ شفقان
ثبتا فی قمیصہ لیجئی الحشـ   ـر مستعدیا الی الرحمٰن

ثبتا فی قمیصہ مذکر غائب کو ڈپٹی صاحب نے ثبتا (مصدر) پڑھا میں نے کہا کہ یہ شعر نثر ہو گیا پھر میں نے تقطیع کر کے بتایا ڈپٹی صاحب نے فرمایا:

شعر می گویم بہ از آب حیات   من ندانم فاعلاتن فاعلات

میں نے کہا "لیکن من می دانم فاعلاتن فاعلات چہ کنم" [illegible] کی بات ہے پھر میں نے ڈپٹی صاحب کو تکلیف نہیں دی اگرچہ ان کی تواضع سے مجھے امید تھی کہ وہ مجھے استفادہ کا موقع دیں گے۔

ڈپٹی صاحب مرحوم کو عربی نظم پر جو قدرت تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ انگریزیہ

سنہ ۱۹۰۷ء میں جب دہلی میں امیر حبیب اللہ خان تشریف لانے والے تھے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے ایک عزیز صاحبزادہ ایف۔اے میں پڑھتے تھے اس وقت منتخب دیوان ابی العتاہیہ نصاب میں داخل تھا جس میں سے وہ قصیدہ امیر صاحب کے سامنے پڑھنے کے لئے انتخاب کیا گیا جس کا مطلع ہے۔

لا يذهبون بذلك الامل   حتى نقص في الاجل

طالب علم نے کہا کہ میں یہ ابیات تین منٹ میں ختم کر دوں گا آپ کچھ اشعار کا اضافہ فرما دیجئے چنانچہ ڈپٹی صاحب نے یہ گرہ لگائی اور حق یہ ہے کہ خوب لگائی

الله قدر في الازل   الا نجاة بلا عمل

النصر ليس بنا فعم   والسيف قد سبق العذل

في امر ما ليس يخالد   والعيش امر محتمل

كن حيث شئت من السهو   ل وفي البروج وفي القلل

يدركك موت في المنا   ن ولا يزيدك في الاجل

لذات دنيا كلها   سمٌّ مشوبٌ بالعسل

العمر فان فانتبها   والموت آت فاعجل

حتى م تقليد الهوى   والى م تجد يد الحيل

المبتلى بعلائق الدنيا   حائر في الوحل

ڈپٹی صاحب کی حاضر دماغی اور ادبیت کا اندازہ اس لطیفہ سے ہو سکتا ہے کہ وہ امیر حبیب اللہ خان سے ملے اتفاق سے عید کا دن تھا ڈپٹی صاحب نے متنبی کا عید اور وجہ حبیب والا مشہور شعر پڑھا۔

عید کے دن اور امیر صاحب کے نام کی مناسبت نے اس شعر میں خاص نکتہ پیدا کر دیا اور امیر صاحب

بہت محظوظ ہوئے۔

اب میں بعض مشہور ادبی کتابوں کے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کرتا ہوں،

میرے نزدیک الغریب المصنف ابن سلام اور اصلاح المنطق وہ کتابیں ہیں جن کا یاد ہونا ایک ادیب کے لئے نہایت ضروری ہے،

ہمارے ہاتھ میں اس وقت کوئی اتنی جامع کتاب نہیں ہے جس کے مصنف کو اتنے اصلی ماخذ ملے ہوں اور اس نے ہر نحوی مسئلہ کے متعلق جس کا تعلق کسی بیت سے ہو، نیز شعر و شاعری کے متعلق قدیم ترین ماخذوں سے انتہائی محنت کے ساتھ اتنا ضروری مواد فراہم کر دیا ہو جتنا کہ خزانۃ الادب میں ہے مصنف کو اولیں و آخریں نحویوں کے کلام پر اتنا عبور حاصل ہے اور اس کے پاس اتنا ذخیرہ موجود ہے جس کی مثال ہم کو نہیں ملتی، گویا ہنوز اس کے پیدا ہونے کا زمانہ نہیں آیا اس کو اکیسویں صدی میں پیدا ہونا چاہئے تھا،

حماسات میں انتخاب ابو تمام کا سب سے بہتر ہے لیکن ترتیب و تبویب اور گندگی سے پاک ہونے کے اعتبار سے بحتری کے حماسہ کو فوقیت ہے، نوادر کے اعتبار سے خود ابو تمام کا وحشیات جو الحماسۃ الصغریٰ کے نام سے مشہور ہے ممتاز ہے اور شعر و شاعری کی تنقید میں حماسۃ الخالدیین سے بہتر کوئی کتاب نہیں، حماسۃ البصریۃ اور حماسۃ مغربیہ بہت معمولی چیزیں ہیں، اول الذکر قسطنطنیہ کے کتبخانہ میں ہے اور آخرالذکر حیدرآباد میں اور میرے پاس بھی ان کے دو نسخے ہیں،

نقد الشعر کے موضوع پر قراضۃ الذھب ابن رشیق اور رسالۃ الانتکاس لابن شرف حماسۃ الخالدیین، شرح المختار من اشعار بشار، ہر مضمون کے متعدد شعروں کا مقابلہ کرنے کے لئے بہترین کتابیں ہیں اور بعض حیثیتیں جو نقد الشعر کی ہیں ان کے لئے ابن رشیق کی کتاب العمدہ بہترین کتاب ہے، الموشح فی مآخذ العلماء علی الشعراء للمرزبانی بھی اچھی کتاب ہے، فہم شعر کے لئے ر آ لی بہترین کتاب ہے،

ابن خلدون نے جن کتابوں کو اصولِ فنِ ادب قرار دیا ہے ان کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ کامل مبرد کیہ مبتدی کے لیے زیادہ مفید ہے۔ ادب الکاتب کو اقتضاب کے ساتھ پڑھا جائے تو انسان کو ایک خاص قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ کتاب البیان والتبیین میں فصیح نظم و نثر کے نمونے ان چاروں سے زیادہ ہیں اور نوادرِ عرب و شعر و ادب ابی علی القالی میں سب سے زیادہ ہیں۔

قرآن مجید سے استفادہ کے شرائط و موانع

از:- ابوالحسن علی ندوی

قرآن مجید کی مخاطب پوری نوع انسان ہو لیکن جس طرح زمین کے مختلف قطعے اپنی صلاحیت کے مراتب اور اپنی پیاس اور پانی کی طلب کے درجہ کے اعتبار سے اور پھر اُس سے فائدہ اُٹھانے کی قوت کے لحاظ سے اس باران رحمت سے فائدہ اُٹھانے میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، اور جس طرح صالح سے صالح غذا مختلف انسانی معدوں میں جا کر مختلف اثر کرتی ہے اسی طرح قرآن مجید کا خطاب سب سے یکساں ہو لیکن اسکو قبول کرنے اور اس سے مستفید ہونے کی صلاحیت سب کی یکساں نہیں ہوتی۔ چیز ایک ہو لیکن اسکے انسانی فکر اور عمل باہم متفاوت ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے اثر و نتائج کا یہ اختلاف قرآن میں خود بیان کیا ہے اور اسکے دو متضاد اثرات کو ساتھ ہی ساتھ ذکر کیا ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ۝ (اسراء)

اور ہم نازل کرتے ہیں قرآن کو جو شفا اور رحمت ہو ایمان والوں کے لئے اور ظالموں کیلئے وہ خسران ہی کا باعث ہوگا

قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۝

آپ کہہ دیجئے کہ وہ ایمان والوں کے لئے ہدایت اور شفا ہو۔ اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے انکے کانوں میں بوجھ ہو اور وہ ان کے لئے نابینائی اور گمراہی کا باعث ہے۔ ان کو دور سے آواز دی جا رہی ہے۔

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا

اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو انہیں سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسنے تم میں سے کس کے

فاما الذين آمنوا فزادتهم ايمانا وهم يستبشرون واما الذين في قلوبهم مرض فزادتهم رجسا الى رجسهم وماتوا وهم كافرون ○ (توبہ ۱۶)

ایمان میں زیادتی کی ؟ پس وہ لوگ جو ایمان لائے ان کے ایمان میں تو زیادتی ہوئی اور وہ خوش ہوں گے لیکن جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے تو ان کی نجاست ہی میں اضافہ ہوگا اور کفر ہی کی حالت میں مریں گے۔

ان الله لا يستحيي ان يضرب مثلا ما بعوضة فما فوقها فاما الذين آمنوا فيعلمون انه الحق من ربهم واما الذين كفروا فيقولون ماذا اراد الله بهذا مثلا يضل به كثيرا ويهدي به كثيرا وما يضل به الا الفاسقين (البقرہ ۳)

اللہ تعالیٰ کو اس بات سے شرم نہیں آتی کہ وہ کوئی مثال بیان کرے۔ مچھر کی یا اس سے بھی چھوٹی پس وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ یہی حق ہے ان کے پروردگار کی طرف سے اور کافر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس مثال سے کیا مراد لی ہے ؟ گمراہ کرتا ہے اس سے بہتوں کو اور ہدایت دیتا ہو بہتوں کو اور گمراہ صرف نافرمانوں ہی کو کرتا ہے۔

بعض آیات میں مومنین اور کفار پر قرآن مجید کے الگ الگ اثر کو بیان کیا ہو۔ مومنین کے متعلق۔

هدى للمتقين الذين يؤمنون بالغيب ويقيمون الصلوة ومما رزقنهم ينفقون (البقرہ ۱)

یہ قرآن ہدایت ہو اہل تقویٰ کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں غیب پر اور نماز کے پابند ہیں اور ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں۔

انما المؤمنون الذين اذا ذكر الله وجلت قلوبهم واذا تليت عليهم آيته

مسلمان تو صرف وہی ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا نام لیا جائے تو ان کے دل کانپ جائیں اور جب ان کے سامنے اسکی آیتیں تلاوت کی جائیں تو

زَادَتْهُمْ اِيمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ
يَتَوَكَّلُوْنَ (انفال ۲)

ان کا ایمان بڑھ جائے اور وہ اپنے خدا ہی پر بھروسہ
کرتے ہیں۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا
مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ
جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ
ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ
اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُدَى
اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاءُ
وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ
مِنْ هَادٍ ۝

اللہ نے بہترین کلام نازل کیا جسکی آیتیں ایک دوسرے
سے ملتی ہیں اور جو بار بار دہرائی جاتی ہیں رونگٹے
کھڑے ہو جاتے ہیں اس سے ان لوگوں کے جو اپنے
خدا سے ڈرتے ہیں، پھر نرم ہو جاتے ہیں ان کے
جسم اور دل اور وہ اللہ کی طرف راغب ہو جاتے
ہیں۔ یہ اللہ کی ہدایت ہو جسے چاہتا ہو راہ راست پر
لاتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے
اللہ گمراہ کر دے اُسے راہ راست پر لانے والا کوئی نہیں۔

کافروں کے متعلق:۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا
بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ
كَفَرُوا الْمُنْكَرَ يَكَادُوْنَ
يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ
عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا (حج ۹)

اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں صاف اور
واضح طریقہ پر پیش کی جاتی ہیں تو آپ کافروں
کے چہروں پر بُرائی محسوس کرتے ہیں وہ چاہتے
ہیں کہ ان لوگوں پر ٹوٹ پڑیں جو ان کے سامنے
ہماری آیتیں بیان کرتے ہیں۔

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ
اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ
لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (زمر ۶)

اور جب صرف اللہ کا ذکر کیا جاتا ہو تو جو لوگ
آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل تنگ
ہونے لگتے ہیں۔

وَإِذَا مَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ نَظَرَ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ هَلْ يَرَاكُمْ مِنْ أَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوا صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ

اور جب کوئی سورۃ نازل کی جاتی ہے تو وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کہنے لگتے ہیں کہ تمہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے، پھر چل دیتے ہیں، اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے کیونکہ یہ بے سمجھ لوگ ہیں۔

لیکن قرآن مجید نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مومنین کی اس اثر پذیری اور نفع اندوزی اور کفار کی اس بے اثری اور گمراہی میں ترقی کے ذکر کے موقع پر مومنین اور منکرین کے کچھ متقابل اخلاق و صفات اور عقائد و اعمال کا بھی ذکر کیا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان متقابل اوصاف کو مختلف نتائج میں بڑا دخل ہے۔ ان اوصاف کی روشنی میں ہم قرآن سے استفادہ کے شرائط اور قرآن سے استفادہ کے موانع مرتب کر سکتے ہیں اور یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کس قسم کے اخلاق اور کس قسم کی ذہنیت اور تربیت قرآن سے مناسبت رکھتی ہے اور اسکے سمجھنے اور فائدہ اٹھانے کے لئے معاون ہے، اور کس قسم کی ذہنیت اور سیرت قرآن کی منافی ہے، اسکے لئے حجاب بنتی ہے اور اسکے متوقع اصلاحی اور انقلابی نتائج پیدا کرنے میں مزاحم ہے۔ انکو مختلف عنوانوں کے ماتحت ذکر کیا جاتا ہے۔

وہ صفات جو قرآن کے فہم اور اس سے استفادہ کیلئے معاون ہیں

(۱) طلب: قرآن سے منتفع ہونیکی پہلی شرط یہ ہے کہ اسکی طلب پیدا ہو، جس کو سرے سے اس کی طلب نہیں اسکے لئے قرآن کیا مؤثر ہو سکتا ہے، اللہ کی سنت یہی ہے کہ وہ طلب پر دیتا ہے، اور طلب کی اسکے یہاں بڑی قیمت ہے، موجودہ حالت پر بے اطمینانی اور عدم قناعت، اصلاح حال کی کوشش اور راستہ کی تلاش، اسکے یہاں سعادت کا پہلا قدم ہے، پہلی چیز اضطراب ہے، دوسری چیز تغیر حال۔

وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ — اللہ لوگوں کو اپنی طرف ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع ہوں۔

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم

بیشک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جبتک وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں۔

دین میں استغنا اور بے نیازی محرومی اور بدبختی کی نشانی ہے۔

ومن یستغن فان اللہ غنی حمید

اور جو اللہ سے بے نیاز ہونا چاہیگا تو اللہ سب سے بڑھکر بے نیاز اور قابل تعریف ہے۔

یا ایہا الناس انتم الفقراء والله ہو الغنی الحمید

اے لوگو! تم ہی اللہ کے محتاج ہو اور اللہ ہی مستغنی اور لائق حمد ہے۔

جن لوگوں میں دین کی طلب نہیں اور دین کی صدا میں ان کے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہی ان کیلئے فرماتا ہے۔

افانت تسمع الصم ولو کانوا لا یعقلون

کیا آپ بہروں کو سنا سکتے ہیں خواہ وہ بے عقل ہوں

افانت تہدی العمی ولو کانوا لا یبصرون

کیا آپ ہدایت دے سکتے ہیں گمراہوں کو اگرچہ وہ دیکھتے نہ ہوں

فانک لا تسمع الموتی ولا تسمع الصم الدعاء اذا ولوا مدبرین وما انت بہادی العمی عن ضلالتہم ان تسمع الا من یؤمن بآیاتنا فہم مسلمون

آپ ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جن کے دل مردہ ہوچکے ہیں نہ آپ بہروں کو آواز سنا سکتے ہیں آپ انہیں لوگوں کو سنا سکتے ہیں جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ فرمانبردار ہیں

(۲) استماع و اتباع قرآن بہرحال ایک صحیفہ اور ایک تعلیم ہے اس سے نفع ہونیکا پہلا ذریعہ یہی ہے کہ اسکو غور سے سنے جو سرے سے کان لگا کر سنتا ہی نہیں اسکے بعد کے مراحل کیسے طے کرے گا۔

فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولئک

آپ بشارت دیدیجئے میرے ان بندوں کو جو کان لگا کر بات سنتے ہیں اور اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں

اولئك الذين هداهم الله واولئك — یہی وہ لوگ ہیں جنکو اللہ نے ہدایت دی اور یہی
هم اولوا الالباب (زمر ۱۸) — صاحب عقل ہیں۔

دینی مدعا تو رٹ سن لینا کافی نہیں جو حصہ عمل کے قابل ہو اسپر عمل کرنا ضروری ہے ورنہ علم بلا عمل ایک دماغی تعیش ہے اسلئے استماع کے بعد اتباع کا ذکر کیا۔

(۳) **خوف** قرآن کی بنیاد خدا کے خیال اور اسکے خوف پر ہے جس کا دل بالکل خدا کے خوف سے خالی ہو اور جس کے لئے خدا کے نام میں کوئی اثر اور کشش نہیں اسمیں درحقیقت دین کا مادہ نہیں اور وہ گویا دین کے حاسہ سے محروم ہے اور جب کسی کا کوئی حاسہ کم ہو تو اسکے محسوسات کا وہ کسی طرح حس اور ادراک نہیں کر سکتا۔ قرآن نے اپنے کو ان کے لئے مفید بتایا ہے جن کے دل پر خدا کے نام کا اثر ہوتا ہے اور ان کے نام سے ہی کوئی دبی ہوئی چنگاری موجود ہو باقی جن کے دل کی انگیٹھیاں بالکل سرد ہو چکی ہیں وہ قرآن ٹھنڈے دل سے سنتے ہیں اور ان میں کوئی گرمی نہیں پیدا ہوتی۔

فذكر بالقرآن من يخاف وعيد (ق) — آپ نصیحت کیجئے ان لوگوں کو جو میری وعید سے ڈرتے ہیں
انما تنذر من اتبع الذكر — آپ انہیں کو ڈرا سکتے ہیں جو قرآن کی پیروی کریں
وخشي الرحمن بالغيب (یٰس) — اور خدا سے بن دیکھے خوف کریں۔
سيذكر من يخشى (اعلیٰ) — عنقریب نصیحت حاصل کریں گے وہ لوگ جن کے دل میں خشیت الٰہی ہے۔

فويل للقاسية قلوبهم — پس تباہی ہو ان لوگوں کے لئے جن کے دل اللہ کے
من ذكر الله (زمر) — ذکر کی طرف سے سخت ہو چکے ہیں۔

(۴) **ایمان بالغیب** دین کا ایک بہت بڑا اور اہم حصہ وہ ہے جو انسان کے حواس خمسہ اور اسکی عقل کے حدود سے باہر ہے۔ یہ دین کے وہ بہت سے حقائق ہیں جن کا ادراک انسان اپنے حواس ظاہری کا

نہیں کرسکتا۔ نہ وہ چیزیں دیکھی جاسکتی ہیں نہ چھوئی جاسکتی ہیں، نہ سونگھی جاسکتی ہیں اور نہ چکھی جاسکتی ہیں اور نہ انہیں عقل کام دے سکتی ہے، اسلئے کہ عقل کا کام صرف یہ ہے کہ وہ محسوسات اور معلومات اور تجربات کے ذریعہ غیر محسوس اور غیر معلوم چیزوں کا علم حاصل کرے جن چیزوں کا علم حواس اور تجربات کے ذریعے ممکن ہو، اس کے مبادی تک حاصل نہ ہوں، اور وہاں قیاس کی بنیاد سرے سے موجود نہ ہو، وہاں عقل کیا کام دے سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات وحی، فرشتے، آخرت، جنت اور دوزخ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو خلاف عقل نہیں، لیکن ورائے عقل ضرور ہیں۔ یہ سب غیب میں شامل ہیں جس کے لئے انبیاؑ پر اعتماد کرنا، اور جو کچھ وہ کہیں اسکو قبول کرنا، یہی ایمان بالغیب ہے۔ جو لوگ اپنے یقین اور اعتقاد کے لئے مادیات اور محسوسات کے پابند ہیں اور جو چیز ان کے عقل و قیاس میں نہ آئے ان کا انکار کردیتے ہیں وہ حقیقت میں دین کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ اُن کے لئے دین کی سرحد میں داخل ہونا ہی مشکل ہے۔ وہ قرآن سے مستفیض نہیں ہوسکتے اور ان کے لئے قرآن مجید میں قدم قدم پر مشکلات ہیں۔ مگر جو لوگ حواس پرست نہیں ہیں اور ممکنات کے دائرے کو وسیع سمجھتے ہیں، موجودات اور محسوسات میں محصور نہیں سمجھتے، دین کی حقیقت سے آشنا ہیں، صحیح اور قطعی علم کا سرچشمہ ان کے لئے صرف وحی الٰہی ہے۔ وہ انبیاؑ کی اطلاع اور تعلیم پر پورا پورا بھروسہ رکھتے ہیں، اُن کیلئے کوئی مشکل نہیں، دین پورا اُن کے لئے ایک مفہوم حقیقت ہے، اور قرآن اُن کے لئے سراپا ہدایت ہے۔

هدًى للمتقين الذين يؤمنون بالغيب (البقرہ)

یہ قرآن ہدایت ہے پرہیزگاروں کیلئے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں

فاما الذين آمنوا فيعلمون انه الحق من ربهم واما الذين كفروا فيقولون ماذا اراد الله بهذا مثلا يضل به كثيرا ويهدي به كثيرا وما يضل به الا الفاسقين (البقرہ)

پس وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے ان کے پروردگار کی طرف سے اور کافر کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ کی کیا مراد ہے؟ بہتوں کو اسکے ذریعہ گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا اور گمراہ صرف نافرمانوں ہی کو کرتا ہے

وہ لوگ جو مادیت اور حیوانیت پر مطمئن ہو کر طاری ہوتی ہے اور ایمان بالغیب کے بغیر دین کے اعلیٰ معانی کی گہرائی کی کوشش کرتے ہیں ان کی کوشش اس شخص کی طرح ہوتی ہے جو بغیر کسی زینہ کے بلندی کی طرف چڑھنا چاہے یا بغیر پر کے ہوا میں اڑنا چاہے۔ وہ جس قدر اوپر جانے کی کوشش کرتا ہے اسکی مادیت اور تنگ نظری اسکو نیچے کی طرف لاتی ہے اور اسکا حال وہ ہوتا ہے جو قرآن مجید نے اپنے بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔

فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام ومن یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقا حرجا کانما یصعد فی السماء کذلک یجعل اللہ الرجس علی الذین لا یؤمنون (انعام)

جس کو اللہ ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے اور جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اسکا سینہ تنگ بنا دیتا ہے گویا کہ وہ آسمان پر چڑھا جا رہا ہے اسی طرح اللہ نجاست میں ڈال دیتا ہے ان لوگوں کو جو ایمان نہیں لاتے۔

(۵) تدبر — قرآن سے فائدہ اٹھانے کے لئے تدبر بھی شرط ہے۔ قرآن نے جا بجا تدبر کی ترغیب دی ہے اور مومنین کی تعریف کی ہے جو قرآن مجید کو صحیح سمجھ کر پڑھتے ہیں اور اس پر اندھے بہرے ہو کر نہیں گرتے۔

والذین اذا ذکروا بایات ربھم لم یخروا علیھا صما وعمیانا (فرقان)

اور وہ لوگ کہ جب ان کو اللہ کی آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گرتے۔

افلا یتدبرون القران ام علی قلوب اقفالھا (محمد)

یہ لوگ قرآن میں تدبر کیوں نہیں کرتے کیا ان کے دل بند ہو چکے ہیں؟

افلا یتدبرون القران ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا

یہ لوگ قرآن میں تدبر کیوں نہیں کرتے۔ اور اگر قرآن خدا کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو ان کو اس میں بہت بڑا اختلاف ملتا۔

(۹) **مجاہدہ** قرآن کے فہم اور تدبر میں اور اُسپر عمل کرنے میں مجاہدہ اور مشقت بہت مفید ہو۔ قرآن ان انسانی کتابوں میں سے نہیں ہو جنکے مضامین کا احاطہ اور ان کے مصنفین کا مقصد آدمی محض اپنی ذہانت یا علم کی بنا پر معلوم کرلیتا ہو۔ اللہ کا منشا معلوم کرنے کے لئے اللہ کی رضا اور اعانت کی ضرورت ہو۔ جب انسان اسکے لئے تکلیف اٹھاتا ہو۔ طہارت اخلاق، تزکیۂ نفس سے کام لیتا ہو تو اللہ کی رحمت بھی اسکی طرف متوجہ ہوتی ہے اور اللہ اپنی کتاب کے لئے اسکا سینہ کھول دیتا ہو اور اسکو فہم عطا کرتا ہو۔ قرآن چونکہ نہایت لطیف چیز ہے اسلئے جسقدر انسان کی مادی کثافت کم ہوتی ہو اُسی قدر قرآن سے مناسبت پیدا ہوتی ہے اور قرآن کا جمال اسکو بے نقاب نظر آتا ہے۔

دوسرا سبب یہ ہو کہ جب کوئی انسان کسی مقصد کے لئے تکلیف اُٹھاتا ہو اور قربانیاں کرتا ہو تو اسکی کیفیتیں اُسکے اوپر پوری طرح طاری ہوجاتی ہیں اور اسکو صحیح لذت و حلاوت ملتی ہے

تیسرے یہ کہ قرآن کا ایک بڑا حصہ عملی ہے وہ محض نظری طور پر سمجھ میں نہیں آسکتا۔ الفاظ و معانی کا علم تو حاصل ہوسکتا ہو لیکن صحیح تحقیق اور مشاہدہ، عمل اور کافی تجربہ کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ صحابہ کرامؓ کے فہم قرآن کا یہی ایک امتیاز تھا۔

قرآن سے استفادہ کے موانع

قرآن سے استفادہ اور ہدایت کے موانع کو قرآن نے کفار کی محرومی کے تذکرہ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ قرآن سے فائدہ اُٹھانے اور اسکے روحانی و اعتقادی انقلاب و اصلاح کے راستہ میں یہ اخلاق و عقائد سخت مزاحم ہیں۔ کفار کے علاوہ اگر مسلمانوں میں بھی یہ موانع پائے جائیں گے تو قرآن مجید سے فائدہ اُٹھانے میں مانع ہوں گے۔

(۱) **تکبر** انبیاء کرام کی تعلیم کو قبول کرنے اور انکی غلامی کی سعادت سے محرومی کا بڑا سبب اکثر تکبر، جھوٹی عزتِ نفس اور خودداری کا جاہلی جذبہ ہوتا ہو کبھی یہ انکار اور استکبار براہِ راست قبول حق سے ہوتا ہے، کیونکہ

اسکی وجہ سے اپنے جاہ واقتدار سے دست بردار ہونا پڑتا ہے جاہلی عادات ورسوم چھوڑنے پڑتے ہیں، بہت سے فوائد سے ہاتھ اٹھانا پڑتا ہے، آزادی اور خودسری کی زندگی کے بجائے پابندی اور قانون کی زندگی گزارنی پڑتی ہے، بہت سے لوگوں پر یہ انقلاب حال بہت شاق گزرتا ہے اور ان کا تکبر قرآن کے انکار پر ان کو آمادہ کرتا ہے۔ مندرجہ ذیل آیات میں انھیں کا تذکرہ ہے۔

سأصرف عن آياتي الذين يتكبرون في الأرض بغير الحق وإن يروا كل آية لا يؤمنوا بها وإن يروا سبيل الرشد لا يتخذوه سبيلا وإن يروا سبيل الغي يتخذوه سبيلا ذلك بأنهم كذبوا بآياتنا وكانوا عنها غافلين (اعراف)

میں عنقریب اپنی آیتوں سے ان لوگوں کے دل پھیر دوں گا جو بغیر حق کے زمین میں تکبر کیا کرتے ہیں اور اگر وہ تمام معجزات دیکھ لیں تب بھی ایمان نہ لائیں گے۔ اور اگر یہ بھلائی کی راہ دیکھتے ہیں تو اسے اپنا راستہ نہیں بناتے اور برائی کی راہ دیکھتے ہیں تو اسے اپنا راستہ بنا لیتے ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی اور ان سے غافل رہے۔

ويل لكل أفاك أثيم يسمع آيات الله تتلى عليه ثم يصر مستكبرا كأن لم يسمعها فبشره بعذاب أليم (جاثیہ)

ہلاکت ہو ہر بہتان تراش اور گنہگار کے لئے۔ جو اللہ کی آیتیں سنتا ہے پھر تکبر کرنے لگتا ہے گویا کہ اس نے سنا ہی نہیں آپ اسے بشارت دیدیجئے دردناک عذاب کی۔

ثم أدبر واستكبر فقال إن هذا إلا سحر يؤثر إن هذا إلا قول البشر (مدثر)

پھر اس نے پیٹھ پھیری اور تکبر کیا پھر کہا کہ یہ تو ایک جادو ہے جو چلا آرہا ہے اور یہ تو انسان ہی کا قول ہے۔

کبھی پیغمبر کی ظاہری حالت اور غربت کو دیکھکر وہ اسکے پیغام اور تعلیم سے انکار واستکبار کرتے ہیں اور اسکی پیروی میں اپنی اہانت محسوس کرتے ہیں فرعون نے کہا تھا۔

ام انا خیر من ھذا الذی ھو مھین — کیا میں بہتر نہیں ہوں اس شخص سے جو ذلیل ہے اور
ولا یکاد یبین فلو لا القی علیہ اسورۃ — اچھی طرح بات بھی نہیں کرسکتا ؟ پس کیوں نہ اُن پر
من ذھب او جاء معہ الملائکۃ مقترنین — سونے کے زیور اُتار دیے گئے یا ان کے ساتھ بہت سے
(زخرف) — فرشتے بھیجدیے جاتے۔

وقالوا لولا نزل ھذا القرآن علی رجل — اور ان کافروں نے کہا کہ یہ قرآن مکہ اور طائف کے
من القریتین عظیم (زخرف ع ۳) — کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا۔

کبھی محض انکی بشریت ان کے لئے عذر بنجاتی ہے۔

ذالک بانہ کانت تاتیھم رسلھم — یہ اسلئے کہ ان کے پاس پیغمبر معجزات لیکر آتے تھے
بالبینٰت فقالوا ابشر یھدوننا فکفروا — انھوں نے کہا کہ کیا کوئی انسان ہمیں ہدایت دیگا ؟
وتولوا واستغنی اللہ واللہ غنی — پس انھوں نے کفر کیا اور روگردانی کی اور اللہ بے نیاز
حمید (تغابن ۱) — ہوا ان سے بیشک وہ بے نیاز اور قابل ستائش ہے

وقالوا مال ھذا الرسول یاکل الطعام — اور ان کافروں نے کہا یہ پیغمبر کیا ہے جو کھانا کھاتا ہو
ویمشی فی الاسواق لولا انزل الیہ — اور بازاروں میں چلتا ہے کیوں نہ اسکے ساتھ کوئی
ملک فیکون معہ نذیرا (فرقان ع ۱) — فرشتہ بھیجا گیا جو لوگوں کو ڈرایا کرتا۔

کبھی رسولؐ کے پیرووں کی معاشی یعنی ان کے پیشوں کی حقارت انکی کم نسبی کا وہ عذر کرتے ہیں۔
اور جماعت میں شرکت کے لئے اُسی کو مانع بتلاتے ہیں:

قالوا انؤمن لک واتبعک — انھوں نے کہا کہ کیا ہم تم پر ایمان لائیں، حالانکہ
الارذلون — تمہاری پیروی صرف ادنیٰ لوگوں نے کی ہے۔

فقال الملا الذین کفروا من قومہ — انکی قوم کے کافروں کی ایک جماعت نے کہا کہ ہم تو

ما نراك الا بشرا مثلنا وما نراك اتبعك الا الذين هم اراذلنا بادى الراى وما نرى لكم علينا من فضل بل نظنكم كاذبين (ہود)

تم کو اپنے ہی جیسا ایک انسان دیکھتے ہیں اور تمہاری پیروی بھی انہی لوگوں نے کی جو ہم میں پست درجہ کے لوگ ہیں اور ہمارے خیال میں تمکو ہمپر کوئی فضیلت بھی نہیں بلکہ ہم تو تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔

کبھی یہ عداوت اس بنا پر ہوتی ہے کہ ان لوگوں نے اپنی دنیاوی اقبالمندی اور قسمت کی یاوری کی وجہ سے یہ فرض کر لیا ہوتا ہے کہ دنیا میں ہر اچھی چیز کے مستحق ہم ہیں اور وہ چیز خیر ہی نہیں جو پہلے ہمکو نہ ملے۔

وقال الذين كفروا للذين آمنوا لو كان خيرا ما سبقونا اليه واذ لم يهتدوا به فسيقولون هذا افك قديم (احقاف)

اور کافروں نے ایمان والوں کے متعلق کہا کہ اگر کوئی بھلائی ہوتی تو یہ ہمپر سبقت نہ کر پاتے اور چونکہ انکو اس سے ہدایت نہیں حاصل ہوئی اسلئے وہ کہیں گے کہ یہ تو پرانا بہتان ہے۔

یہی اسباب ہیں جنکی بنا پر بستی کے آسودہ حال اور فارغ البال لوگ انبیاء کی تکذیب اور ان کی دعوت و تحریک کی مخالفت میں سب سے پیش قدمی اور زبردستی کرتے ہیں۔

وما ارسلنا فى قرية من نذير الا قال مترفوها انا بما ارسلتم به كافرون (سبا)

اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی رسول بھیجا وہاں کے آسودہ حال لوگوں نے کہا کہ ہم تو تمہاری رسالت کے منکر ہیں۔

وكذلك جعلنا فى كل قرية اكابر مجرميها ليمكروا فيها (انعام)

اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں وہاں کے بڑے لوگوں کو مجرم بنایا تاکہ وہ فتنہ پردازی کرتے رہیں۔

بہرحال تکبر خواہ اسکی وجہ کچھ ہو اور اسکے مظاہر کتنے ہی مختلف ہوں قرآن مجید سے مکمل فائدہ اٹھانے میں سخت مزاحم ہوتا ہے قرآن مجید کی تعلیم قبول کرنے میں اسکو اپنے نفس پر جاری کرنے میں ا

اسکو اپنی زندگی کے معاملات میں حکم بنانے کے لئے اور انبیاء علیہم السلام کی رہنمائی قبول کرنے کے لئے تواضع تسلیم و رضا اور ایثار کی ضرورت ہو۔

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما (نساء ع ۹)

قسم ہے آپکے پروردگار کی کہ یہ لوگ اسوقت تک مومن نہیں ہوسکتے جبتک آپکو اپنے تمام تنازعات میں حکم نہ مان لیں اور اپنے دلوں میں آپکے فیصلے سے کوئی تنگی نہ محسوس کریں اور بالکل فرمانبردار ہو جائیں۔

(۲) مجادلہ — قرآن مجید کے بارہ میں بغیر کسی روشنی کے بحث و مباحثہ کرنا اسکو اپنی لسانی لفاظی سے مغلوب کرنیکی کوشش کرنا اسکے بارے میں قیاس آرائیاں کرنا قرآن کی ہدایت سے محروم رکھتا ہو اور سینہ کے چھپے ہوئے تکبر کا پتہ دیتا ہو۔

ان الذین یجادلون فی آیت اللہ بغیر سلطن اتٰھم ان فی صدورھم الا کبر ما ھم ببالغیہ فاستعذ باللہ انہ ھو السمیع البصیر ۰

بیشک وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں میں بغیر کسی دلیل کے جھگڑا کیا کرتے ہیں ان کے دلوں میں کبر ہے اور وہ اس میں کامیاب نہیں ہوسکتے بس اللہ سے پناہ مانگئے وہ سمیع و بصیر ہے۔

والذین سعوا فی آیتنا معٰجزین اولئک لھم عذاب من رجز الیم ۰

اور جو لوگ ہماری آیتوں میں ہرانے کے لئے دوڑ دھوپ کرتے ہیں ان کے لئے بڑا دردناک عذاب ہو

الذین یجادلون فی آیت اللہ بغیر سلطن اتٰھم کبر مقتا عند اللہ و عند الذین آمنوا کذلک یطبع اللہ علی کل قلب متکبر جبار (مومن ع ۴)

جو لوگ اللہ کی آیتوں میں بغیر کسی حجت کے جو انکو ملی ہو جدال کرتے ہیں یہ چیز اللہ اور ایمان والوں کے نزدیک بہت مبغوض ہے اسی طرح اللہ ہر سرکش اور متکبر کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

وكذلك جعلنا لكل نبي عدوا شياطين الإنس والجن يوحي بعضهم إلى بعض زخرف القول غرورا

اور اسی طرح ہم نے ہر پیغمبر کے لئے جن وانس کے شیطانوں میں سے دشمن بنائے جو ایک دوسرے سے دھوکہ دینے کے لئے ملمع باتیں کیا کرتے ہیں۔

(۳) انکار آخرت و دنیا پرستی عقائد کفر میں سے آخرت کا انکار قرآن سے متاثر ہونے اور اس سے فائدہ اٹھانے سے بہت مانع ہوتا ہے۔ اسلئے کہ قرآن مجید کی ترغیب و ترہیب اور وعظ و اصلاح کی بنیاد ہی آخرت پر ہے، وہ آخرت سے ڈراتا ہے، آخرت کے ثواب کی امید دلاتا ہے اور اس اہم سفر کے تمام ضروری معلومات اور اسکی منتہا تک کی منزلوں کی صحیح اطلاع اور ضروری ہدایت دیتا ہے، اسلئے جو لوگ آخرت کے متوقع ہیں وہ قرآن مجید سے کسی حال میں مستغنی نہیں ہو سکتے، اسلئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

والذين يؤمنون بالآخرة يؤمنون به وهم على صلاتهم يحافظون (انعام ۹۲)

اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ قرآن پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور وہ اپنی نماز کے محافظ ہیں۔

لیکن جو لوگ آخرت کے منکر ہیں، یا عقیدۃً منکر نہیں ہیں مگر عملاً ان پر دنیا پرستی اور دنیا غالب ہو اور زندگی کے تمام مسائل میں ان کا نقطۂ نظر بالکل مادی ہو، ان کے لئے قرآن بے اثر یا کم اثر ہے۔

وإذا قرأت القرآن جعلنا بينك وبين الذين لا يؤمنون بالآخرة حجابا مستورا وجعلنا على قلوبهم أكنة أن يفقهوه وفي آذانهم وقرا وإذا ذكرت ربك في القرآن وحده ولوا على أدبارهم نفورا

اور جب آپ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں تو ہم آپ کے اور منکرین آخرت کے درمیان ایک حجاب قائم کر دیتے ہیں اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے کہ وہ اسے سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں میں ایک بوجھ ڈال دیا اور جب آپ قرآن میں توحید کے ساتھ اپنے خدا کا ذکر کرتے ہیں تو یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگتے ہیں۔

إن الذين لا يؤمنون بالآخرة

بیشک جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اللہ

لا یجلیہم اللہ ولہم عذاب الیم	انہیں ہدایت نہیں دیتا اور انکے لئے دردناک عذاب ہو.
فالذین لا یؤمنون بالاخرۃ قلوبہم	جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے دل منکر
منکرۃ وہم مستکبرون	ہیں اور انہیں تکبر ہے.
فاعرض عن من تولّٰی عن ذکرنا	آپ اپنی توجہ ان لوگوں سے ہٹا لیجئے جنھوں نے
ولم یرد الا الحیوۃ الدنیا ذلک	ہمارے ذکر سے توجہ ہٹالی ہے اور انہیں صرف
مبلغہم من العلم ان ربک ھو	دنیاوی زندگی کی طلب ہو یہ انکی مقدار علم ہو بیشک آپکا
اعلم بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم	خدا ان لوگوں سے خوب واقف ہو جو اسکی راہ سے بہک
بمن اھتدی (النجم ۳)	گئے ہیں اور وہی ان لوگوں سے بھی واقف ہو جو راہ پر ہیں

مادیت کا غلبہ انہیں ایسی بلادت اور غباوت پیدا کردیتا ہو کہ غیر مادی چیزوں کے بارہ میں ان کا دماغ کام ہی نہیں کرسکتا، اور وہ ان چیزوں کا انکار کردیتے ہیں.

ان الذین لا یرجون لقاءنا ورضوا	جو لوگ ہم سے ملنے کی خواہش نہیں رکھتے اور انہوں نے
بالحیوۃ الدنیا واطمانّوا بہا	دنیاوی زندگی کو پسند کرلیا اور اسی پر مطمئن
والذین ہم عن اٰیٰتنا غفلون (یونس ۱)	ہوگئے وہ ہماری آیتوں سے غافل ہوگئے ہیں.
بل ادّٰرک علمہم فی الاخرۃ بل	بلکہ آخرت کے بارے میں ان کا علم تھک کر رہ گیا ہو
ہم فی شک منہا بل	اور وہ اسکی طرف سے شبہ میں ہیں بلکہ وہ اسکی طرف
ہم منہا عمون	سے اندھے ہیں.

ایک چیز جو کفار سے مخصوص نہیں وہ قرآن کی آیات متشابہات سے اپنے اغراض کے لئے استدلال کرنا اور لوگوں کو تحریف اور غلط تاویل سے گمراہ کرنا جس کا سبب دلوں کی کجی اور بدنیتی ہو

منه آيات محكمات هن ام الكتاب	کچھ اس میں محکمات ہیں جو اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہ
واخر متشابهات فاما الذين في	ہیں۔ پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہو وہ متشابہات
قلوبهم زيغ فيتبعون ما تشابه منه	کی راہ میں لگ جاتے ہیں فتنہ کے لئے اور ان کی حقیقت
ابتغاء الفتنة وابتغاء تاويله (آل عمران)	جاننے کے لئے۔

عربی زبان کے طریق تعلیم پر ایک ماہر فن کی رائے

ترجمہ

از مولوی عبداللہ صاحب پھلواروی متعلم دارالعلوم ندوۃ العلماء

"الضیاء مرحوم میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق استاذ ادب مولانا شیخ تقی الدین الہلالی مراکشی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں موصوف نے زبان کی تعلیم پر اپنا خاص نظریہ پیش کیا تھا استاذ تقی الدین الہلالی عربی کے مستند ادیب اور زبان کے تجربہ کار معلم تھے جن کی قابلیت کا اعتراف ممالک یورپ میں بھی کیا جاتا ہے ان کو عربی زبان کی تعلیم کا وسیع اور عملی تجربہ تھا امید ہے کہ عربی مدارس کے حلقہ میں اس مسئلہ پر ان کے خیالات توجہ اور غور سے پڑھے جائیں گے۔ (مدیر)

عربی ہی زبان پر منحصر نہیں بلکہ ہر اجنبی زبان انگریزی ہو یا جرمنی، ترکی ہو یا ایرانی جو بھی ہو اس کے سیکھنے کا صحیح اصول کیا ہے، ایک تو طریقہ مروجہ ہے یعنی پہلے صرف و نحو کی مکمل تعلیم اور اس کے بعد بتدریج ادب کی دوسری کتابیں ترجمہ کے ساتھ، لیکن تجربے نے ثابت کر دیا کہ زبان کی تعلیم کے لئے یہ طریقہ مفید نہیں، مفید ہی نہیں بلکہ بے فائدہ اور نقصان رساں ہے، طالب علم اس طریقہ پر ادب کی انتہائی کتابیں پڑھ جاتا ہے لیکن جیسی کہ چاہیے صلاحیت مفقود ہوتی ہے، بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایسے طلبہ چند صحیح جملے بولنے یا چند سطریں لکھنے پر بھی قادر نہیں ہوتے۔ یہ افسوسناک نتائج اسی بے اصول تعلیم کا نتیجہ ہیں جو ہمارے عربی مدارس میں (خصوصاً) رائج ہے، ورنہ آج ہمارے پیش نظر انگریزی مدارس ہیں جہاں انگریزی لٹریچر نے کافی ترقی کی اور وہاں ابتدائی درجوں ہی سے یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ طالب علم لکھ بول سکے،

اب سوال یہ ہے کہ وہ صحیح اصول کیا ہے جس سے طالب علم کم وقت میں ایک اجنبی زبان سمجھ اور بول سکے یا محنت کر کے اس زبان کا ادیب بن سکے ۔۔۔؟ جواب یہ ہے کہ زبان کی تعلیم کا طریقہ فطری ہونا چاہیے، اور اس میں ترجمہ کی مدد بالکل نہ لی جائے مثلاً اگر عربی زبان سکھانا ہے تو ہندی کو عربی ہی میں بولنے

کا سبق ہو یا حدیث پڑھاتے وقت (خصوصاً) ایک لفظ بھی اردو یا فارسی کا نہ آئے،

بعض لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی بلکہ اکثر حضرات تصور بھی شاید نہ کر سکیں کہ اجنبی زبانوں کی تعلیم میں ترجمہ کے بغیر کیونکر چارہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ہماری ان دلیلوں پر غور کیا جائے تو شاید مسئلہ بہت جلد واضح ہو جائے، فطری طریقۂ تعلیم یہی ہے کہ زبان بغیر کسی دوسری لغت کی مدد کے حاصل کی جائے۔ چنانچہ بچہ ایامِ رضاعت ہی سے افہام و تفہیم کے لئے جو الفاظ استعمال کرتا ہے وہ مادری ہوتے ہیں۔ جو بلاواسطہ کسی زبان کے اپنی ماں سے سیکھتا ہے، اگر اس کے علاوہ کوئی سہل طریقہ اقرب وقت میں ممکن ہوتا تو وہ بھی یقیناً ذریعۂ فطرت ہوتا یا اربابِ حل و عقد ایجاد کرتے۔

(۳) یہاں پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ طریقہ صرف بچوں ہی کے لئے فطری طریقہ ہے ورنہ وہ لوگ جن کی مادری زبان پہلے سے پختہ ہو چکی ہے ان کے لئے بلا ترجمہ کسی زبان کا حاصل کرنا عبث ہے، اس کے جواب میں ہم ان لوگوں کی مثال پیش کریں گے جو ایک ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں چلے جاتے ہیں پھر تھوڑے ہی عرصہ میں وہاں کی زبان بلاواسطہ کسی لغت کے حاصل کر لیتے ہیں اور بسا اوقات اس زبان کے ادیب بن جاتے ہیں۔ حضرت بلال، صہیب، سلمان رضی اللہ عنہم عجمی ہی تو تھے لیکن ان کی زبان آج ہمارے لئے معیار ہے، حالانکہ انھوں نے عربی کو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے نہیں سیکھا تھا۔

یہ اور بات ہے کہ کوئی انسان کسی حرف کے ادا کرنے سے قاصر ہو جیسے حضرت بلال شین کے بجائے سین کہتے تھے اور اذان میں اسھد کہتے جس کے متعلق حدیث مرفوع میں ہے سین بلال عند اللہ شین، تو یہ بات اجنبیت کی وجہ سے نہ تھی ۔۔۔ انھیں پر کیا موقوف واصل بن عطا مشہور شاعر و مقرر تھا جس کا خطبہ بے رائیہ مشہور ہے، حرف را کا تلفظ نہیں ادا کر سکتا تھا، حالانکہ اس کی مادری زبان عربی ہی تھی، اسی طرح مراکش میں ایک شخص تھا جو را کا تلفظ ادا کرنے سے قاصر تھا اس سے کسی نے کہا کہ یہ کہو: امرك الامير ان تحفر بئرا على الطريق المراكشي يشرب منها الراكب على فرسه وغیرہ۔

اس نے فی البدیہ یہ کہا۔ اذن الملک ان تبتدع جیا فی المضاجع العباسی یستقی منہ الجائع علی جوادہ ومن سواہ،

(۳) ترجمہ کرتے وقت مفہوم کے بجائے الفاظ کا ترجمہ ذہن میں آتا ہے، اور یہ بالکل قدرتی بات ہے، اس میں دیکھا گیا ہے کہ بعض اوقات چند مضحکہ خیز صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو جہل تبیع کے مرادف ہیں مثلاً کسی نے "اس کو" کا ترجمہ کرانا چاہا تو پہلے وہ "اس سے" کا ترجمہ " منہ " کریگا پھر "کہو" کا " قل " اس طرح پورا جملہ قل لہ کے بجائے قل منہ ہوا اور اسی بنیاد پر سلہ کے بجائے سال منہ اور رافقہ کے بجائے "!" انت بعرف ترجمہ کر دیا جاتا ہے پھر اس سے بھی دو قدم آگے بڑھئے تو قرأت الصلوٰۃ وغسلت الوضوء کی مثال سامنے آئے گی، افسوس تو یہ ہے کہ ایسی فاش غلطیاں طلبہ کی کاپیوں پر ہی نہیں بلکہ علماء درس و تدریس کے یہاں بھی نظر آئیں گی۔

(۴) اسی طرح ترجمہ کرتے وقت طلبہ پر عربی کی ترکیبیں بہت گراں گزرتی ہیں اور اس کا سبب بھی یہی ہے کہ طالب علم چاہتا ہے کہ ترکیب بالکل اسی طرح ہو جس طرح اردو یا فارسی میں ہے مثلاً "میں نے تم کو دیکھا" کے ترجمہ کے لئے میں نے انا تم کو ایاک دیکھا رایٔ ان سب الفاظ کا جملہ میں استعمال ضروری معلوم ہوگا۔ حالانکہ ترجمہ اس کا صرف رأیتک ہوگا، اگرچہ یہ آسان ترین ترکیب ہے لیکن طالب علم اس کو مغلق سمجھے گا۔ اور اس سے الجھن پیدا ہونا لازمی ہے، کیا یہ تعلیم بالترجمہ کا نقصان نہیں ہے؟

(۵) بعض ایسے الفاظ ہیں جن کا صحیح ترجمہ جو پورے مفہوم کو حاوی ہے اردو میں نہیں ہے مثلاً إن، أن بلی، کلا، الا، ھلا، لبیک، واضح رہے کہ ان کا ترجمہ جو کیا جاتا ہے وہ پورے مفہوم کو ادا کرنے سے قاصر ہے،

(۶) طلبہ کا بہت سا وقت لغت و معاجم کی تلاش و جستجو میں بے کار صرف ہوتا ہے چنانچہ جب انھوں نے کوئی لفظ سمجھنے کے لئے لغت کی طرف مراجعت کی، وہاں ان کو ایک لفظ کے کئی معنی نظر آئے، پھر کافی دیر سر گرداں

سمجھنے پر بھی شاید ہی وہ اپنے معنی و مطالب تک پہونچ سکیں اور اس میں عجیب عجیب الجھنیں ہوتی ہیں جن کو طلبہ ہی جانتے ہیں مثلاً ان کا ترجمہ اسم جامد کی، الحدیث، النقدین، الجامعہ

(۷) دیکھا گیا ہے کہ وہ لوگ جو اپنی عمریں عربی علوم پر صرف کر دیتے ہیں اگر ان کو بوقت ضرورت کوئی مختصر عربی تقریر یا گفتگو کرنا ہو تو ایک عجیب الجھن اور ایک خاص پریشانی محسوس کرتے ہیں، اور جہاں اس سے فرصت پائی تو گویا انہوں نے ایک مہم سر کرلی یا کسی بڑی مصیبت سے نجات حاصل کرلی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ اس کو ایک غیر طبعی امر سمجھتے ہیں اور طریقہ تعلیم بالترجمہ جیسے غیر فطری طریقہ تعلیم کا لازماً یہی اثر ہوگا۔

(۸) زبان کی تعلیم کا یہی طریقہ ابتدائے تعلیم سے ہونا چاہئے، ورنہ جنھوں نے کچھ عرصہ تک کچی کتابیں ترجمہ کرکے پڑھی ہیں نہ ان کی زبان اس لغت پر لوٹنے کی نہ ان کا قلم رواں ہوگا، جیسا کہ ایک طبعی زباندان کیلئے ہونا چاہئے اگر کسی نے دو سال تک بھی کتابیں ترجمہ کی مدد سے پڑھی ہیں اور اس کے بعد صحیح نہج پر تعلیم حاصل کرنا چاہے تو اس میں بہت دشواریاں پیش آئیں گی، اس لئے کہ اکثر الفاظ کے تراجم اس کے ذہن نشین ہونگے وہ بھی بہت سی غلطیوں کے مرتکب ہونے کا سبب ہوگا۔ اس لئے ابتدائے درس ہی سے تعلیم کا طریقہ درست ہونا چاہئے خشت اول چوں نہد معمار کج تا ثریا می رود دیوار کج (ترجمہ)

(۹) ترجمہ کا سب سے بڑا نقصان تضییع اوقات ہے اس کے علاوہ طالب علم کو جو الجھن اس سے پیدا ہوتی ہے وہ اسے یہ سمجھنے پر مجبور کرتی ہے کہ زبان بہت ہی دشوار اور ثقیل ترین ہے، اور یہ اعتقاد جازم تحصیل علم کے لئے کہاں تک مفید ہوسکتا ہے ظاہر ہے۔ یہی سبب ہے کہ علمائے ادب نے اپنی عمریں صرف کرنے کے بعد جو تجربہ حاصل کیا وہ یہ ہے کہ زبان کی تعلیم کا دارومدار صرف سماعت و تکلم پر ہے جس سے آسان اور کم وقت کوئی دوسرا طریقہ نہیں۔

(۱۰) یہ صرف خیال ہی نہیں بلکہ آج دوسری ترقی یافتہ زبانیں اسی طرح سیکھی ہیں۔ زبان کی تعلیم کا یہ ناقص طریقہ صرف ہندوستان کے لئے مخصوص ہے۔

حالات ندوہ

دارالعلوم کو کھلے ہوئے بیس پچیس دن ہو گئے ہیں تمام شعبے پوری سرگرمی سے کام کر رہے ہیں مہتمم صاحب دارالعلوم کی رہنمائی میں اساتذہ اور نگران ہائے دار الاقامہ تعلیم و تربیت کی جانب خاص توجہ کر رہے ہیں اسباق تیزی سے ہو رہے ہیں طلبہ کا معیار بلند کرنے کے لئے بعض اہم اصلاحات عمل میں آرہی ہیں جن سے مستقبل میں بہترین نتائج کی توقع ہے۔

اس مرتبہ مدرسین کی جماعت میں مولانا حمید الدین صاحب کا اضافہ ہوا ہے آپ کو فن حدیث سے خاص ذوق ہے حضرت مولانا انور شاہ مرحوم سے تلمذ کی نسبت ہے عرصہ سے مدرسۂ نور العلوم بہرائچ میں حدیث و تفسیر کی اعلیٰ کتابوں کا درس دیتے تھے مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کی نظر دوربیں نے آپ کو ندوہ کے لئے منتخب فرمایا شروع شوال سے آپ یہاں آگئے ہیں اور حدیث و تفسیر کی کتابوں کا درس دے رہے ہیں۔

سال کے آغاز میں حسب دستور مجلس نقباء کا نیا انتخاب ہوا اس مرتبہ حسب ذیل طلبہ اس خدمت کیلئے منتخب ہوئے ہیں۔

نقیب عام	نجم الدین بری	نقیب صحت	محمد منظور، خالد، عبدالسلام کوہاٹی
نقیب شرقی	عبداللہ پھلواروی	نقیب تعلیم	ابوالعرفان، صدر الدین
نقیب غربی	معین اللہ	نقیب صلوٰۃ	مجیب اللہ، اسمٰعیل راندیری

۸ر نومبر کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مدیر ترجمان القرآن اور مولانا صبغۃ اللہ بختیاری استاذ تفسیر

مولانا سلام عمرآبادی ندوہ میں لکھنؤ تشریف لائے کئی دن دارالعلوم میں قیام رہا شہر میں متعدد تقریروں کے علاوہ "انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل" کے عنوان سے لکھنؤ یونیورسٹی یونین میں ایک مدلل و مؤثر مقالہ پڑھا ۱۰ نومبر کو مولانا ابوالحسن علی ندوی ندوہ میں طلباء دارالعلوم کی انجمن الاصلاح کے زیر اہتمام ایک جلسہ ہوا جس میں متعلقین ندوہ کے علاوہ معززین شہر کی بھی بہت کافی تعداد موجود تھی اس موقع پر مسعود ندوی صاحب نے اسلامی نظام جماعت کی ضرورت و اہمیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا آخر میں علی صاحب نے زمانہ کے انقلاب انگیز حالات کی طرف اشارہ کیا اور مسلمانوں کو ان کے فرائض یاد دلائے اور کہا

مسلمانم باز بہ تعمیر حرم خیز　　　از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

---

۱۰ نومبر کو الکزنڈرا ہائی اسکول بھوپال اور ندوہ کی ٹیم کے درمیان ایک فٹ بال میچ ہوا طرفین کی جانب سے مقابلہ میں بڑی تندہی اور جانفشانی سے کام لیا گیا لیکن ندوہ ٹیم کامیاب ہوئی اور الکزنڈرا ہائی اسکول کو دو گولوں سے شکست ہوئی طلباء دارالعلوم نے مہمانوں کی ضیافت کی شب میں ایک پرتکلف دعوت دی اور کھیل کے میوہ جات اور انعامات سے تواضع کی۔

طلباء قدیم کا سالانہ اجتماع قریب آ رہا ہے پچھلے سال دسمبر کے آخری ہفتہ میں جلسہ ہوا تھا اب کی بعض اصحاب سردی کے خیال سے مارچ کا مہینہ پسند کر رہے ہیں مجلس عاملہ اور مجلس منتظمہ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا جا رہا ہے ان کے فیصلہ پر انعقاد جلسہ کی صحیح تاریخ سے اطلاع دی جائے گی،

نقد و نظر

خطوطِ غالب غالب کے خطوط اُردو ادبیات میں جو حیثیت رکھتے ہیں، اس سے اہلِ علم اور اہلِ ذوق ناواقف نہیں، لیکن افسوس ہو کہ انکی شان کے مطابق انکی علمی خدمت نہیں کیگئی تھی، جناب مہیش پرشاد صاحب (مولوی فاضل) صدر شعبۂ اردو و فارسی بنارس یونیورسٹی تمام اُردو داں طبقہ کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پہلی مرتبہ بڑی تحقیق و جستجو اور بڑی محنت و قابلیت سے ان خطوط کو فراہم اور مرتب کرکے ملک کے سامنے پیش کیا۔ ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی صدر شعبۂ عربی الٰہ آباد یونیورسٹی کی امداد و مشورہ سے کتاب میں تصحیح، رسم خط، اور طباعت کی وہ خصوصیات موجود ہیں، جو ایک بلند پایہ علمی تصانیف کی اشاعت کے شایانِ شان ہیں، اردو مطبوعات میں غالبًا بہت کم کتابیں اس دیدہ ریزی باریک بینی اور احتیاط کے ساتھ شائع ہوئی ہوں گی، جیسے خطوطِ غالب کا یہ اڈیشن شائع ہوا ہے۔ کتاب میں غالب کی دستی تحریر کا فوٹو بھی شامل ہو۔ کتاب اہلِ ذوق کی قدردانی کی مستحق اور مرتب و ناشر تمام اہلِ علم کی طرف سے لائقِ ستائش ہیں۔ قیمت غیر مجلد للعہ مجلد صہ

ملنے کا پتہ:۔ ہندوستانی اکیڈمی صوبۂ متحدہ الٰہ آباد

ندائے حرم مدرسۂ صولتیہ مکۂ معظمہ میں قدیم تعلیمی اور دینی مرکز اور مشہور ہندوستانی عالم اور مناظرِ اسلام مولانا رحمت اللہ صاحب اظہار الحق وغیرہ کی یادگار ہو، اس مرکز کا تعلق عالمِ اسلام کے مرکز میں ہونیکی وجہ سے تمام دُنیائے اسلام سے ہو، لیکن ہندوستان سے اس کا خاص تعلق ہو، اس تعلق کی بنا پر ہندوستان کے مسلمانوں کے اسکے حالات سے مطلع رکھنے کی ضرورت تھی۔ ندائے حرم اسی خدمت کو انجام دیتا ہو اور ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے اس قابلِ فخر ادارہ کی خدمت کی طرف متوجہ کرتا رہتا ہو۔ رسالہ مولانا محمد سلیم صاحب کیرانوی کی رہنمائی میں سلیقہ اور خوش اسلوبی سے نکلتا ہو اور اسکی امداد

ایک دینی خدمت ہو. سالانہ اشتراک ہے (۔۔۔)

پتہ۔ صدر دفتر مدرسہ صولتیہ (مکۂ معظمہ) قرول باغ ، نئی دہلی

ایمان، تمدن اسلام کا پیام بیسویں صدی کے نام، محمد عقائد، سائنس اور اسلام، اسلامی عکوسے طوع قائم ہوتی ہے

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں کچھ عرصے سے ایک مجلس انجمن اسلامی تاریخ و تمدن کے نام سے قائم ہو. اس انجمن کے ماتحت سال میں ایک مرتبہ اسلامی ہفتہ منایا جاتا ہو جس میں ملک کے مشہور صاحب فکر اور اہل نظر علماء کو دعوت دیجاتی ہو کہ وہ مختلف مسائل اور عنوانات پر اپنے خیالات اہل مجلس کے سامنے پیش کریں، یہ تقریریں بعد کو کتابی شکل میں انجمن کی طرف سے شائع کیجاتی ہیں تاکہ حاضرین کے علاوہ غائبین بھی ان سے مستفید ہو سکیں. مذکورۂ بالا رسائل جناب مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی، مولانا قاری محمد طاہر صاحب، مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند، اور مولانا ابو الاعلیٰ صاحب مودودی کی ان تقریروں پر مشتمل ہیں جو ان حضرات نے انجمن اسلامی تاریخ و تمدن کی دعوت پر اسلامی ہفتہ کے سلسلہ میں کی تھیں، اب انجمن نے ان تقریروں کو کتابی شکل میں علٰحدہ علٰحدہ شائع کر دیا ہو تاکہ ان کے افادہ کا دائرہ وسیع اور دیرپا ہوسکے.

اصلاح مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ کسی تعارف کا محتاج نہیں. تقریباً تیس برس پہلے مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین فراہی مرحوم کی کوششوں سے یہ درسگاہ قائم ہوئی تھی تاکہ کم مصارف اور سادہ ماحول میں، زمانہ کے حالات کے پیش نظر اسلامی تعلیم اور دینی تربیت کا انتظام کیا جائے رسالۂ اصلاح اسی مدرسۃ الاصلاح کا آرگن ہے پہلے اس نام سے ماہوار علمی رسالہ نکلتا تھا لیکن موجودہ بدمذاقی کے دور میں کسی علمی رسالہ کا جاری رہنا جس قدر دشوار ہے ظاہر ہے نتیجہ یہ ہوا کہ اس ماہوار رسالہ کو بند کرکے عام فہم زبان میں سہ ماہی رسالہ نکالا گیا ہے چندہ بھی صرف عہ رکھا گیا ہے خدا کرے اس تخفیف کے بعد یہ رسالہ چل جائے۔ (ع - ق)

Regd. No. A-606.

کیا آپ ترقی کرنا چاہتے ہیں؟

کیا آپ اپنی تجارت
کو فروغ دینا چاہتے ہیں

کیا آپ اپنی آمدنی
بڑھانا چاہتے ہیں

ان مسائل کے حل کے لئے یہ چند صفحات ضرور ملاحظہ کریں اس کا مطالعہ آپ کے لئے بہت ہی نفع بخش ہوگا صدیوں کے تجربے اور ہزار ہا روپیہ کے خرچ سے بہترین دماغوں اور دماغوں کی تدبیروں کا نچوڑ ہے۔

کامیاب زندگی
بسر کرنے کا بیمہ

کاروباری لوگوں کے لئے
کامیابی کی کلید ہے

نام و نمود شہرت اور عزت
حاصل کرنے کے بے خطا نسخے

آپ کو طلسم عمل نامی کتاب میں ملیں گے!

ملنے کا پتہ

صدیق بک ڈپو امین آباد لکھنؤ

2(12)

مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار رسالہ

الندوہ

جس کا مقصد

مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت ہے

مرتبہ

سید ابوالحسن علی ندوی

استاذ تفسیر و ادب

عبدالسلام قدوائی ندوی

استاذ تاریخ و اقتصادیات

الندوہ

زیرِ نگرانی

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ

جلد ۲　　　نمبر ۱۲

ذی الحجہ ۱۳۶۰ھ مطابق دسمبر ۱۹۴۱ء

قیمت فی پرچہ تین آنے　　سالانہ دو روپے

تمام خط وکتابت و ترسیل زر منیجر رسالہ الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ کے پتہ پر ہونا چاہئے

شذرات

الندوہ کے صفحات میں مولانا محمد الیاس صاحب کی تبلیغی تحریک کا ذکر کئی بار آچکا ہے میوات کے علاقہ میں (جو اس تحریک کا مرکز ہو) اس کے جو اصلاحی اثرات ظاہر ہوئے ہیں الندوہ کے ناظرین ان سے بھی بے خبر نہ ہوں گے۔ یہ تحریک اتنی نازک اور گہری اور اتنے دقیق اصولوں اور طریقوں پر حاوی ہو کہ تحریراً اس کا تعارف نہیں کرایا جاسکتا، البتہ حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے الفاظ میں اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہ سلوک راہِ نبوت ہو۔

ان تمام لوگوں کے لئے جو دین کا ذوق اور فہم رکھتے ہیں اور اس زمانہ کی ہنگامہ آرائیوں سے اُکتا چکے ہیں اور جن کے نزدیک طریقِ نبوت ہی عمل کا صحیح راستہ ہو، نیز ان لوگوں کے لئے جو اپنے زمانہ کی دینی ویرانی پہ حسرت کرتے ہیں، مخلصانہ مشورہ ہو کہ وہ دہلی بستی نظام الدینؒ میں مولانا محمد الیاس صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں اور ان کے ساتھ کچھ وقت صرف کریں اور میوات میں جا کر تبلیغ کا کام اور اس کا نظام بھی دیکھیں اور اس کے اثرات ملاحظہ فرمائیں، تعجب ہو کہ لوگ تاریخ کے آثار قدیمہ، بادشاہوں کی منہدم عمارتیں اور شکستہ مقبرے دیکھنے دُور دُور جاتے ہیں، لیکن قرنِ اول کے زندہ نمونے اور اسلام کی جیتی جاگتی تصویریں دیکھنے کا شوق نہیں ہوتا اور اس کے لئے سفر کی زحمت گوارا کرنے والے بہت کم ہیں، حقیقت یہ ہو کہ معاصرت بڑا حجاب ہے۔

نومبر کی آخری تاریخوں میں میوات کے علاقہ تحصیل نوح (ضلع گوڑگانوہ) میں ایک عظیم الشان تبلیغی جلسہ ہوا۔ میوات کے علاوہ ملک کے مشاہیر علما شریک ہوئے۔ دارالعلوم ندوۃ العلما

بھی تیس آدمیوں کی ایک جماعت نے جو مدرسہ کے طلباء اور بعض مدرسین پر مشتمل تھی شرکت کی، یہ جلسہ اپنی خصوصیتوں کے اعتبار سے بالکل منفرد تھا۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ میں تیس برس سے جلسوں میں شرکت کرتا ہوں اور اس طویل مدت میں میں نے سیکڑوں جلسے دیکھے لیکن یہ جلسہ اپنی شان کا بالکل نرالا جلسہ ہے میں نے ایسا جلسہ نہیں دیکھا۔

اس جلسہ میں وہ چیزیں نہ تھیں جو عموماً جلسوں میں ہوا کرتی ہیں اور جو جلسوں کی کامیابی کی علامت سمجھی جاتی ہیں آٹھ دس ہزار آدمیوں کا یہ اجتماع (جس میں کثرت تیس اور چالیس کوس سے پیدل چل کر آنے والے تھے) کسی جلسہ سے زیادہ ایک زندہ خانقاہ معلوم ہوتا تھا جس میں عبادت و ذکر نمازوں کی پابندی اور نوافل کے ساتھ چستی و مستعدی، جفاکشی و مجاہدہ، سادگی و بے تکلفی، تواضع و خدمت اور اسلامی اخلاق کے نمونے بکثرت دیکھنے میں آتے تھے اور بغیر کسی دعوے اور مطالبے کے ایک حقیقی دار الاسلام کا نمونہ تھا۔ جلسہ کی کامیابی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ڈیڑھ ہزار آدمیوں نے چار چار مہینہ کے لئے یو۔پی وغیرہ میں پیدل چل کر اپنا خرچ کر کے گاؤں اور قصبوں میں اور جگہ جگہ خدا کا پیغام پہونچانے کا ذمہ لیا۔ اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرمائے اور ان کی کوششوں میں برکت دے۔ ناظرین کو غور کرنا چاہیے کہ ہمارا فرض کیا ہے اور اس کام میں ہم کیا مدد کر سکتے ہیں۔

افسوس ہے کہ ۔۔ دسمبر سنہ ۴۲ء کو حافظ محمد الیاس خاں صاحب نے ایک طویل علالت کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں انتقال کیا۔ جناب حافظ صاحب مرحوم بڑے باوضع اور بزرگانہ صفات کے بزرگ اور قدیم تہذیب کا نمونہ تھے۔ آپ عرصہ دراز تک ریاست بھوپال میں صاحب اوقاف اور مناصب کے مہتمم رہے۔ اگست سنہ ۴۲ء میں آپ اپنے عہدہ سے بڑی نیکنامی کے ساتھ سبکدوش ہوئے۔ ندوۃ العلماء کے کاموں سے آپ کو بڑی دلچسپی تھی۔ بھوپال میں معین الندوہ کا قیام آپ ہی کی توجہ اور کوشش کا نتیجہ تھا۔ عرصہ تک آپ معین ندوہ بھوپال کی نظامت کرتے رہے۔ اپنے صاحبزادہ مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب قائم مقام مہتمم دار العلوم کی خواہش پر غرض علاج لکھنؤ تشریف لائے اور دار العلوم میں قیام فرمایا اور وہیں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی۔

میری محسن کتابیں

از مولانا عبدالسلام صاحب ندوی دار المصنفین اعظم گڈھ

میں اپنے باپ اور بلکہ ان سے زیادہ اپنے دادا کی سب سے لاڈلی اولاد ہوں، میرے باپ اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے، ان کے علاوہ ان کی سات لڑکیاں تھیں جن میں ایک کے سوا سب میرے والد کے بعد پیدا ہوئیں اس لئے قدرتی طور پر وہ میرے والد اور میرے والد کی اولاد سے انتہائی محبت رکھتے تھے، اتفاق سے میرے والد کی اولاد کا سلسلہ لڑکیوں سے شروع ہوا اور چند سال کے عرصے میں پے در پے تین لڑکیاں پیدا ہوئیں، اس کے بعد میری ولادت ہوئی، اب غور کیجئے کہ جس شخص کے گھر میں پے در پے سات لڑکیاں پیدا ہو چکی ہوں، اور اس کے بعد اس کے محبوب لڑکے کی صلب سے بھی مسلسل تین لڑکیاں پیدا ہوں وہ اس کی اولاد نرینہ کی پیدائش کا کس قدر مشتاق اور خواہشمند ہوگا؟ ایسی حالت میں میری ولادت نے میرے دادا کی اشتیاق آمیز مسرت میں غیر معمولی اضافہ کیا، خوش قسمتی سے اسوقت خاندان فارغ البال تھا، کاشتکاری اور زراعت کے علاوہ جو آبائی پیشہ تھا نیل اور شکر کی تجارت ہوتی تھی اس لئے دیہاتی نقطۂ نظر سے گاؤں میں ہمارا خاندان ایک دولتمند خاندان شمار کیا جاتا تھا، اس کے ساتھ میرے دادا ایک باحوصلہ اور فیاض شخص تھے اس لئے انھوں نے میری ولادت پر غیر معمولی مسرت کا اظہار کیا، غربا اور دعاگو دیہاتی برہمنوں پر روپئے پیسے اور کپڑے تقسیم کئے، اور گاؤں بھر کی دعوت کی، اس سے اتنا نتیجہ تو ہر شخص نکال سکتا ہے کہ میں اپنے بھائی بہنوں میں اپنے باپ دادا کی سب سے محبوب اور سب سے خوش قسمت اولاد ہوں، میری اس خوش قسمتی کا آغاز یوم ولادت ہی سے ہوا اور الحمدللہ کہ اب بھی مختلف حیثیتوں سے اپنے بھائی بہنوں میں سب سے زیادہ خوش قسمت ممتاز ہوں، اس پر خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور دل میں یہ حسرت رکھتا ہوں کہ میرے اور بھائی بہن کم از کم میرے برابر خوش قسمت کیوں نہ ہوئے؟ گذشتہ اور موجودہ خوش قسمتی کو اگر صغریٰ کبریٰ بنایا جائے تو کم از کم شاعرانہ طور پر اس سے یہ نتیجہ بھی نکلے گا کہ اگر توفیق الٰہی نے مدد کی اور ابر رحمت کی چادر نے اپنے سائے کو پورے طور پر پھیلایا

فانشاء اللہ آخرت میں بھی خوش نصیب ہی رہوں گا۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

لیکن اس خوش نصیبی کے ساتھ یہ افسوس ہے کہ میری پیدائش کے چند ہی سال بعد میرے دادا کا انتقال ہوگیا، اس وقت مجھکو صرف اس قدر ہوش تھا کہ ابتک اونکی صورت مجھے یاد ہے، باتیں یاد نہیں، ان کی وفات کے بعد کا ایک اور واقعہ یاد ہے، میرے دادا کی قبر ایک مختصر سے باغ میں ہے جو ہمارا خاندانی قبرستان ہے، خاص میرے دادا کی قبر پر آم کا ایک درخت سایہ فگن ہے، ایک بار اپنے بچپن میں آموں کی فصل میں اس قبرستان میں گیا تو اپنے دادا کی قبر پر ایک پختہ آم گرا ہوا دیکھا، ساتھ میں ایک عزیز تھے، انھوں نے آم اٹھا کر مجھکو دیا اور کہا کہ لو اس کو تمھارے دادا نے تم کو دیا ہے، اس پر مجھے انتہائی مسرت ہوئی، اور آج اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو مسرت کے ساتھ حسرت بھی ہوتی ہے، غرض میری تعلیم کا سلسلہ میرے دادا کی زندگی میں شروع نہ ہو سکا بلکہ میرے والد نے میری تعلیم کا انتظام کیا، اس موقع پر صداقت کے ساتھ مجھکو یہ بتا دینا چاہئے کہ میرے دادا ایک دیہاتی ان پڑھ شخص تھے، صرف زراعت و تجارت کے ذریعہ سے دولت پیدا کی تھی، ملازمت اور دوسرے علمی ذرائع معاش سے ہمارا خاندان ناآشنا تھا، لیکن میرے والد نے کسی قدر ترقی کی، اور قدیم مکاتب میں فارسی زبان کی تعلیم حاصل کی، تجارتی اغراض سے ہندی بھی پڑھی، اور قدیم ہندوانہ حساب سیکھا جس کے وہ بڑے ماہر تھے، اونکو اس سے بڑی چڑھ تھی کہ کوئی شخص کاغذ قلم دوات، اور پنسل سے حساب لگائے، وہ ہر چیز کا حساب زبانی کرتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ اس دیہاتی سادہ تعلیم سے کوئی سرکاری اور قومی ملازمت نہیں مل سکتی تھی، اس لئے وہ بھی اپنے قدیم پیشہ زراعت و تجارت میں مشغول رہے، اس لئے اس مختصر تعلیم کے بعد بھی ہمارا خاندان ملازمت سے ناآشنا رہا، میرے چچا نے جو میرے دادا کے بھائی کی اولاد تھے، تعلیم میں اس سے بھی زیادہ ترقی کی اور غالباً شرح جامی تک عربی پڑھی، اور چونکہ اہلحدیث تھے، اس لئے حدیثوں کے شروح و ترجمے سے اپنی استعداد زیادہ بڑھائی، اور چھوٹے چھوٹے مذہبی رسالے لکھنے لگے، جن کے قلمی مسودات اب تک موجود ہیں، اس طرح رفتہ رفتہ ہمارا خاندان علم سے آشنا ہوا اور یہ آشنائی فارسی اور عربی زبان کے ذریعہ سے ہوئی جس کا اس زمانے میں بڑا چرچا تھا، اس لئے میرے والد نے

میری تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا، خود تو دو دو کوس کے فاصلے پر جا جا کر دوسرے گاؤں کے مکاتب میں تعلیم حاصل کی تھی لیکن میرے لئے اتفاق سے اپنے دروازہ پر ایک مکتب قائم کیا اور ایک فارسی خواں معلم کو میری تعلیم کے لئے مقرر کیا، جس کو بطور مشاہرہ ساڑھے دو روپیہ ماہوار تنخواہ دیا کرتا تھا، اس کے علاوہ گاؤں اور آس پاس کے دیہاتوں کے لڑکے تعلیم حاصل کرتے تھے اور وہ دو دو پیسہ ماہوار دیتے تھے، اس طرح میرے گاؤں اور آس پاس کے دیہاتوں کے بہت سے لوگ خواندہ ہو گئے اور مجھے مسرت ہے کہ میری وجہ سے اس زمانے میں ابتدائی تعلیم کی تھوڑی سی اشاعت ہو گئی، اس حیثیت سے میں بوجہ خواندگی سنانے والوں سے اپنے آپ کو زیادہ خوش قسمت سمجھتا ہوں، غرض میں نے فارسی کی ابتدائی کتابیں بجائے کسی عالم دین کے ایک ایسے معلم سے پڑھیں جس کو اس زمانے کی اصطلاح کے موافق ہم لوگ میاں صاحب کہتے تھے، میں بذات خود اس زمانے میں نصاب تعلیم کے لوازمات سے ناآشنا تھا، البتہ اس زمانے کے رواج کے مطابق پہلے آمد نامہ، صفوۃ المصادر، کریما، مامقیماں، انشاء خدائی، بوستاں، گلستاں، اخلاق محسنی اپنے میاں صاحب سے پڑھیں۔ اس کے بعد ان کا سرمایۂ علم ختم ہو گیا اور ان سے بہتر معلم کی تلاش ہوئی، اس وقت میرا سن تیرہ چودہ سال کا تھا اور اس زمانے کے رواج کے مطابق میری شادی اسی سن میں ہو گئی تھی خوش قسمتی سے میرے خسر صاحب ایک سند یافتہ عالم تھے، اور مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلی سے علوم درسی کتابیں پڑھی تھیں، انھوں نے مختلف مقامات پر درس و تدریس کی خدمت بھی انجام دی تھی، لیکن اس وقت بیکار تھے، اور خود اپنے دروازہ پر ایک مکتب قائم کر کے حسبۃً للہ اپنے گاؤں اور اپنے خاندان کے بچوں کو تعلیم دیتے تھے، اس لئے میں نے دو برس تک اپنی سسرال میں رہ کر ان سے فارسی کی انتہائی کتابیں مثلاً انوار سہیلی، سکندر نامہ، بہار دانش، مینا بازار، شبنم شاداب، دیوان غنی اور دیوان طالی وغیرہ پڑھیں، اس کے بعد عربی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا اگرچہ میں خود اپنی سسرال میں رہ کر اپنے خسر سے عربی تعلیم حاصل کر سکتا تھا، تاہم گھر سے باہر نکل کر تعلیم حاصل کرنے کے بعض ذرائع پیدا ہو گئے، میرے بہنوئی مولوی محبوب الرحمٰن حکیم بی اے، کانپور کے مشن کالج میں ایف اے کلاس میں پڑھتے تھے، اس وقت کانپور عربی تعلیم کا مرکز تھا، اور جامع العلوم اور فیض عام کی شہرت مولانا اشرف علی صاحب اور مولانا احمد حسن صاحب کی ذات کی وجہ سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی، میں یا میرے والد بذات خود کانپور کی اس

علوم مروجہ سے بالکل ناواقف تھے، البتہ مولوی محبوب الرحمان تعلیم کے ساتھ کی وجہ سے میرے والد نے مجھکو ان کے ہمراہ کردیا، لیکن میں نے بجائے خود کانپور کے کسی مدرسے میں تعلیم نہیں حاصل کی، بلکہ خود ہمارے ہم وطن مولوی بخشش احمد صاحب جو اسوقت مدرسہ اصلاح المسلمین سرائے میرمیں مدرس ہیں، کانپور مشن اسکول میں مدرس تھے، اور مولوی محبوب الرحمان کے ساتھ رہتے تھے، سے عربی کی ابتدائی کتابیں مثلاً میزان منشعب، زبدہ، پنج گنج، صرف میر، نحو میر، ہدایۃ النحو، قال اقول، صغری، کبری، میزان منطق، شرح تہذیب وغیرہ ان سے اور فیض عام اور جامع العلوم کے بعض فارغ التحصیل طلبہ سے پڑھیں، اور جو کتاب پڑھی پوری پڑھی، اور بعض کتابوں کو ازبر یاد کیا، لیکن انٹرنس پاس کرنے کے بعد مولوی محبوب الرحمان صاحب آگرہ سینٹ جانس کالج میں داخل ہوگئے، اور میں بھی ان کے ساتھ گیا، آگرہ کی جامع مسجد میں ایک بڑا نامی عربی کا مدرسہ قائم تھا، اور مولوی محمد رمضان مدرس تھے، میں نے ان سے کافیہ، شرح جامی، اور قدوری وغیرہ پڑھیں، اسکے بعد مولوی محبوب الرحمان صاحب بی، اے، پاس کرکے علی گڑھ چلے گئے، اور میں نے غازی پور کا رخ کیا، جہاں مدرسہ چشمۂ رحمت مدت سے قائم تھا، اور اعظم گڈھ کے عربی خواں طلبہ کا قرب مسافت کی وجہ سے سب سے بڑا مرکز تھا. خوش قسمتی سے اس وقت ہمارے عزیز و برادر محترم مولوی شبلی صاحب جو اس وقت دارالعلوم ندوہ کے فقیہ ہیں، مدرسہ چشمۂ رحمت میں مدرس تھے، میں نے ان سے قطبی، میر قطبی، شرح وقایہ، میبذی، نورالانوار، رشیدیہ اور ملاحسن وغیرہ پڑھیں اور ہر کتاب پوری پڑھی، اور میں نے اپنے اساتذہ میں ان کو سب سے بہتر پایا، لیکن اس وقت بھی میں مدرسہ میں داخل نہ تھا بلکہ ان سے گھر پر پڑھتا تھا، ان کے علاوہ چشمۂ رحمت میں ہمارے ضلع کے ایک اور عالم مولوی لعل محمد صاحب مدرس اول تھے، ان کے اسباق میں بقاعدہ شریک ہوتا رہا اور اسی طرح میرزاہد وغیرہ کے جستہ جستہ مقامات سنے، ان واقعات سے معلوم ہوا ہوگا کہ میری تعلیم مدرسہ کی چار دیواری سے باہر قدیم طرز پر ہوئی، اور اب بھی میں خانگی تعلیم کو مدرسوں کی تعلیم سے بہتر سمجھتا ہوں، اور میرے نزدیک کتابوں کے انتخابات کا درس تعلیمی قابلیت کے لئے سم قاتل ہے، ہر کتاب پوری پڑھنا چاہئے۔

کانپور، آگرہ اور غازی پور میں تعلیمی سلسلے کے علاوہ کچھ ادبی مشاغل بھی جاری تھے، ہمارے عزیز مولوی

محبوب الرحمان کلیم شاعر تھے، اس لئے ان کی صحبت میں رہ کر میں نے بھی شاعری شروع کی اور انہی کے تخلص کی مناسبت سے شمیم تخلص اختیار کیا، اس وقت پیام یار، پیام عاشق، اور دامن گلچیں وغیرہ متعدد شاعرانہ رسالے نکلتے تھے جن میں بہت سے شعراء کی ہر طرح منتخب غزلیں شائع ہوتی تھیں میں ان رسالوں کو بشوق پڑھتا تھا اور انہیں اپنی غزلیں اشاعت کے لئے بھیجتا تھا، پہلے مولوی محبوب الرحمان سے اصلاح لیتا تھا، غازیپور آیا تو مدرسہ چشمۂ رحمت [illegible]، غازیپور کے سب سے بڑے شاعر مولوی عبد الاحد شمشاد مہتمم مدرسہ چشمۂ رحمت سے اصلاح لینے لگا، مولوی عبد الاحد صاحب شمشاد نے فارسی اور اردو کی کتابوں کا ایک بڑا کتب خانہ بھی جمع کیا تھا اور وہ اپنے تلامذہ کو نہایت فیاضی کے ساتھ کتابیں دیکھنے کو دیتے تھے، اور میں ان کے یہاں سے اردو اور فارسی کے دواوین لاکر بشوق ان کا مطالعہ کرتا تھا، اس وقت تک تو مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میری محسن کتابیں کون کون سی ہیں، ایسے کہ مجھکو کسی زمانے میں اس موضوع پر لکھنے کی تکلیف و دعوت دی جائیگی، لیکن اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری محسن کتابیں سکندر نامہ، دیوان غنی، دیوان طالب اور اخلاق محسنی وغیرہ تھیں، کیونکہ فارسی دواوین کے سمجھنے میں مجھے ان سے بڑی مدد ملی اور شاعرانہ تلمیحات، تشبیہات، استعارات، اور صنائع و بدائع کے سمجھنے اور ان سے لطف اٹھانے میں انھوں نے بے ساختہ خاموش احسان کیا، اس وقت تک میں نے نثر کی کتابوں کا بہت کم مطالعہ کیا تھا، لیکن میرے عزیز مولوی محبوب الرحمان کلیم مضمون نگار بھی تھے، اور ان کی صحبت میں سر سید، مولانا حالی، مولوی عبد الحلیم شرر وغیرہ کا نام اکثر سنتا رہتا تھا، اور مولانا شبلی مرحوم تو ہمارے ہم وطن ہی تھے، ان سے میں پہلے ہی سے واقف تھا اور ان کی شکل و صورت دیکھنے کا اشتیاق تھا، خوش قسمتی سے کانپور میں انکی صورت دیکھی اور انکی ایک مختصر سی تقریر بھی سنی لیکن اب تک میں نے ان ادیبانِ ہند کی کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا تھا، لیکن جب آگرہ میں تھا تو اسی زمانے میں الفاروق نکلی اور آگرہ اخبار کے اڈیٹر نے مولوی محبوب الرحمان صاحب کو ریویو لکھنے کی غرض سے وہ کتاب دی، وہ اس کو گھر لائے تو میں نے اس کو بغور پڑھا اور یہ پہلا دن تھا کہ دور جدید کی تصنیفات میں ہندوستان کے سب سے بڑے مورخ اور ادیب کی ایک ممتاز تصنیف میری نظر سے گذری اسی زمانے میں رسائل شبلی کا مجموعہ بھی شائع ہوا،

اور میں نے ان کو بھی بشوق پڑھا، اس کے بعد مجھے ایک عجیب قسم کی بدقسمتی سے از خود عربی زبان کی کتابوں کے مطالعہ کا موقع باہمہ حالات میں طاعون نمودار ہوا، اور بہرجگہ شدت کے ساتھ پھیلا، میں طاعون کے خوف سے سلسلۂ تعلیم کو چھوڑ کر گھر بیٹھ گیا، لیکن یہ بیکاری میرے لئے مفید ثابت ہوئی، اعزہ و اقارب میں چند لوگ عالم تھے، اور کچھ کتابیں جن میں زیادہ حصہ درسی کتابوں کا تھا جمع کر لی تھیں، میں ان کے اس مختصر کتب خانہ سے منطق و فلسفہ کی کتابیں، مثلاً شرح مطالع، ملا جلال، حمد اللہ، میر زاہد، امور عامہ وغیرہ مانگ لاتا تھا، اور ان کا تفریحاً مطالعہ کرتا تھا، زیادہ تر کتابوں پر مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے حاشیے ہوتے تھے، اور وہ اپنے تبحر علمی اور طرز تحریر سے مطالب کو نہایت آسان کر دیتے تھے اس لئے میں ان کتابوں کو بہت اچھی طرح سمجھ لیتا تھا، اسی زمانے میں تفسیر کبیر بھی پوری پڑھ ڈالی، اور چونکہ امام رازی بھی پیچیدہ مسائل کو نہایت آسان عبارت میں لکھتے ہیں اس لئے اس کو بھی میں بآسانی سمجھ جاتا تھا، ان کتابوں کے مطالعہ کا یہ اثر اور یہ احسان ہوا کہ مجھکو عقلیات سے دلچسپی ہو گئی، اور صرف وہی کتابیں پسند آنے لگیں جو عقلی اصول کے مطابق لکھی گئی ہوں یعنی دعوی، دلیل، اور علل و اسباب سب پر بحث ہو، میرا یہ ذوق اب تک قائم ہے، تاریخی، ادبی، مذہبی ہر کتاب میں ان چیزوں کی جستجو کرتا ہوں،

دو برس میں طاعون کا خوف کم ہوا اور اپنی تضییع اوقات پر افسوس ہونے لگا تو ندوہ میں چونکہ زیادہ تر اپنے ہم وطن لوگ رہتے تھے، بالخصوص اعلیٰ عہدہ دار مثلاً مولانا حفیظ اللہ صاحب مہتمم دارالعلوم اور مولانا شبلی نعمانی معتمد دارالعلوم اپنے وطن اور برادری کے لوگ تھے اس لئے دارالعلوم ندوہ کی طرف رجحان پیدا ہوا، مولانا حفیظ اللہ صاحب کو خط لکھا اور انھوں نے نہایت مہربانی کے ساتھ بلا لیا، وہاں پہونچ کر پانچویں درجہ میں داخل ہوا، اگرچہ مولانا شبلی کے آنے کے بعد نصاب تعلیم بدل گیا تھا تاہم پانچویں درجہ سے لیکر آٹھویں درجہ تک جو کتابیں داخل درس تھیں وہ میرے عقلی اور ادبی ذوق کے بالکل مطابق تھیں، شرح حکمۃ العین، شرح حکمت الاشراق، توضیح تلویح، ہدایہ، حماسہ، سبعہ معلقہ، متنبی، فقہ اللغہ، دلائل الاعجاز وغیرہ میرے عقلی اور ادبی معیار پر پوری اتریں، اس لئے میں نے ان کو بشوق پڑھا، کبھی کبھی مولانا حفیظ اللہ صاحب کی قدیم تعلیمی صحبت میں ہیجان پیدا ہو جاتا تھا تو حمد اللہ، قاضی مبارک

اور صدرا کے اسباق بھی ہو جاتے تھے، ان کتابوں کے اثر سے عقلی اور ادبی ذوق میں اور ترقی ہوئی اور کتب فلاسفہ
سے شرح مقاصد، شرح مواقف اور شرح تجرید وغیرہ مستعار لیکر بااستیعاب مطالعہ کرنے لگا، اردو کتابوں میں اس
زمانے میں مولانا شبلی کی علم الکلام اور الکلام شائع ہو چکی تھیں، چونکہ یہ دونوں کتابیں عقلی اصول پر لکھی گئی تھیں
اس لئے میں نے نہایت شوق سے ان کو پڑھا، مجھے غلط یا صحیح طور پر طرز تحریر میں مولانا شبلی کا مقلد کامل خیال کیا جاتا ہے
غالبًا انکی تصنیفات کے ابتدائی مطالعہ کا یہ احسان ہوگا، بہرحال میں انکی تصنیفات کو اپنا محسن اور اپنا رہبر سمجھتا
ہوں، مولانا شبلی کے علاوہ اور مصنفین کی کتابیں مجھے بالکل پسند نہ آئیں، مولانا نذیر احمد اور مولانا عبد الحلیم شرر کی
تصنیفات کو تو میں نے بالکل ناپسند کیا، سرسید کی تصنیفات کا معیار بھی میرے نزدیک بلند نہیں، اردو طرز تحریر پر انکا
یہ احسان ضرور ہے کہ انھوں نے قدیم مقفی اور مولویانہ طرز تحریر کو چھوڑ کر ایک سادہ، سلیس اور رواں طرز تحریر پیدا کیا
لیکن میرے نزدیک انکی انشا پردازی میں رنگینی اور بانکپن نہیں، مضامین بھی زیادہ تر مناظرانہ اور ملایانہ ہیں،
بعض مقامات پر ابتذال اور بھدا پن بھی ہے، بہرحال مجھ پر انکی تصنیفات کا کچھ اچھا اثر نہیں پڑا، مولانا حالی
میں بھی وہ نوک جھونک، رنگینی اور بلندی نہیں، البتہ وہ نقاد بہت بڑے ہیں اور انکی تصنیفات میں مقدمۂ
شعر و شاعری، حیات سعدی، اور یادگار غالب کا مجھ پر اس حیثیت سے خاص طور پر احسان ہے اور میں تنقیدی
حیثیت سے انکی ان کتابوں کو اپنا محسن اور رہنما سمجھتا ہوں، میں نے ناول بہت کم پڑھے ہیں البتہ ہردوئی کے حکیم محمد علی
کے چند ناول پڑھے تو انکی رنگیں بیانی کا مجھ پر خاص اثر ہوا، مولانا محمد حسین آزاد کی انشا پردازی کو اگرچہ میں پسند
کرتا ہوں لیکن انکی تصنیفات کو بہت زیادہ بلند پایہ، متین اور سنجیدہ نہیں سمجھتا، مولانا عبد الماجد دریابادی کی تصنیفات
میں مجھکو فلسفۂ اجتماع، فلسفۂ جذبات، تاریخ اخلاق یورپ باعتبار مضامین اور باعتبار طرز تحریر کے بہت زیادہ
پسند ہیں، یہ کتابیں معنوی اور صوری دونوں کے لحاظ سے مولانا شبلی کی تصنیفات کا مکمل عکس ہیں اس لئے ہم اور وہ دونوں
ایک ہی چراغ کے پروانے ہیں، روحانی اور ادبی حیثیت سے مجھ پر صحیح بخاری کا نہایت عمدہ اثر ہوا لیکن اسی نسبت
سے میں فقہی کتابوں کو بالکل بے اثر اور بے کیف پاتا ہوں،

اعجاز القرآن

(سلسلۂ مضامین قرآنی)

از ابو الحسن علی ندوی

قرآن مجید نے اپنے معجزہ ہونے کا خود دعویٰ کیا ہے اور ان انسانوں کو جن کو اس کے کتاب الٰہی ہونے میں شبہ ہے مقابلہ کی دعوت دی ہے سب سے پہلے ان آیتوں کو جمع کرکے پڑھئے۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (البقرہ ع ۳)

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِثْلِهِ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (یونس ع ۴)

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ

فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَنْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ (ہود ع ۲)

قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا (بنی اسرائیل ع ۱۰)

قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا أَتَّبِعْهُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ

فَإِنْ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (قصص ع ۵)

اعجاز قرآن کا دائرہ مندرجہ بالا آیتوں میں مخاطبین و مشرکین کو قرآن کا مطلق مثل لانے کی دعوت دی گئی ہے [illegible] کلام اللہ کتاب قرآن کی کسی سورت تک مثل نہیں ہو سکتی جب تک اس کے اعجاز کے تمام شعبوں پر اور اس کی تمام خصوصیات

یہ حاصل نہ ہوا تو قرآن صرف اپنے الفاظ و ترکیب اور فصاحت و بلاغت ہی کے اعتبار سے معجزہ نہیں ہے بلکہ وہ اپنے الفاظ اور ترکیب میں بھی معجزہ ہے۔ اپنی معنی و مضامین میں بھی اپنے اعلیٰ علوم و معارف میں معلومات غیبی اور حقائق ابدی میں بھی اپنے پیش کئے ہوئے مذہبی و اخلاقی و معاشرتی اور ملکی نظام میں بھی اپنے اثرات و انقلاب میں بھی اپنی ہی پیشینگوئیاں اور اخبار میں بھی مگر جب صرف الفاظ میں جو اس کے اعجاز کا صرف ایک پہلو اور گوشہ ہے کوئی مقابلہ نہیں ہو سکا تو اس کے اعجاز کامل میں کیا مماثلت ہو سکتی ہے۔

سورۂ ہود (ع ۲) کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا امتیاز خصوصیت اور اس کے اعجاز کا راز یہ ہے کہ وہ خدا کے علم سے اتارا گیا ہے اور حقیقت میں وہ اس کے علم خاص کا ایک مظہر ہے اس لئے اس میں انسان اپنے ظنی و مشتبہ ناقص محدود اور خود خدا کے بخشے ہوئے علم کے ساتھ کیا مقابلہ کر سکتے ہیں جس طرح خدا کی اور صفات میں انسان مماثلت نہیں کر سکتا اسی طرح وہ خدا کے علم میں بھی کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

فَإِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَنْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ

کا نکتہ بتاتا ہے کہ اللہ جس طرح تمام صفات و الوہیت میں یکتا ہے اسی طرح اپنے علم میں بھی اور جب اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے تو کتاب الٰہی کا جواب کیا ہو سکتا ہے۔

وَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (اعراف ع ۶)

علم اللہ کا تعلق صرف الفاظ و ترکیب سے نہیں بلکہ معانی و حقائق سے بھی ہے۔

لفظی فصاحت کے لئے قرآن نے جا بجا اپنے کو قرآن عربی کتاب مبین اور لسان عربی مبین کہا ہے جس میں اس کے لفظی محاسن اور لسانی فنون کی طرف اشارہ ہے۔

الر تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ. إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (یوسف ع ۱)

لِسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَهَٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُبِينٌ

سورہ قصص (ع ۵) کی آیت میں قرآن کے کسی ایسے جواب کا مطالبہ کیا گیا ہے جو ہدایت و اصلاح میں

من صاحب المعانی کی کتاب بعوا اعلنا بی مثما التبینہ پس قرآن کی فصاحت وبلاغت اور اس کا لفظی اعجاز درحقیقت قرآن کے اعجاز کا ایک گوشہ ہے اور قرآن کا اعجاز اسی میں منحصر نہیں متقدمین نے جب قرآن کے اعجاز پر غور کیا یا اس موضوع پر قلم اٹھایا تو زمانہ کے رجحان عام اور عربوں کے ادبی ذوق اور زبان کی اہمیت کی وجہ سے ان کی نظر کے سامنے قرآن کے اعجاز کا یہی گوشہ رہا اور کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے اس دائرے کے اندر کمال نکتہ دانی اور نکتہ آفرینی کا ثبوت دیا۔ اور بڑی دماغ سوزی سے کام لیکر اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کر دیا۔ اس علمی ذخیرہ میں اضافہ مشکل ہے اس لئے اس باب میں انہیں تالیفات کی طرف رجوع کرنا چاہئے[1]۔

قرآن مجید کا سب سے پہلا اور بڑا معجزہ اسلام ہے

قرآن مجید نے دنیا میں مذہب وعقائد کا ایک آخری نظام پیش کیا جس سے زیادہ محکم اور مفصل مذہبی نظام دنیا میں آج تک پیش نہیں ہوا اس سے پہلے کے مذاہب بھی ہو چونکہ وہ اپنے اپنے وقت کے لئے تھے اس لئے اس کے مقابلے میں ناقص ہیں اور چونکہ آسمان کا آخری صحیفہ زمین پر آچکا ہے اس لئے یہ آخری نظام ہے اس سے زیادہ انسان کو اپنے خالق سے مربوط کرنے والا اور اس کی زندگی میں للّٰہیت وروحانیت پیدا کرنے والا ان تمام گمراہیوں اور بے اعتدالیوں سے دور رکھنے والا جس میں مذہبی قومیں مبتلا ہوئیں دنیا میں کوئی مذہبی نظام انسانی تصور کی گرفت میں نہیں آسکتا اسی طرح اس نے انسان کی اس زندگی کے لئے ایک آسمانی اخلاقی قانونی دستور عطا کیا جو دنیا میں بہترین اخلاقی واجتماعی نتائج پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے اور اس نے پیدا کر کے دکھلائے جو کسی اور طریقہ پر آج تک ظہور میں نہیں آئے وہ اجتماع انسانی کے ان تمام مسائل ومشکلات کو جو آج تک پیش آئے یا قیامت تک پیش آسکتے ہیں اپنے معجزانہ طریق پر ذرا ذرا سے اشارات سے حل کرتا ہے وہ ایسے اصول وکلیات عطا کرتا ہے جن کی بنیاد پر ہر زمانے میں دنیا کا بہترین معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے اور ہر جگہ حیات انسانی کی نئی تنظیم ہو سکتی ہے۔ وہ چونکہ الٰہی ہے اس لئے

---

[1] تفصیلی طور پر باقلانی اور ابن عربی کی اعجاز القرآن اور مختصر رمانی کا رسالہ النکت فی اعجاز القرآن اور بلاغت وبیان کی کتابیں قدیم کتابوں میں سے جرجانی کی دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغہ اور متاخرین میں سے امیر المومنین یحییٰ یمنی کی کتاب الطراز نیز تفاسیر میں زمخشری کی کشاف اور نحو ومعانی اور بیان میں ابن قیم کی الفوائد المشوق الی علوم القرآن اس باب میں اچھے ماخذ ہیں۔

نظامِ انسانی غلطیوں، قانون سازی کے نقائص اور تبادلات سے پاک ہے ۔ وہ چونکہ آخری ہے اس لئے ہر قسم کی تکمیل و اضافے سے مستغنی ہے ۔ وہ چونکہ عالمگیر ہے اس لئے قومی و مقامی خصوصیات سے منزہ ہے ۔ وہ چونکہ دائمی ہے اس لئے ہر قسم کے تغیر و تنسیخ سے آزاد ہے ۔ وہ چونکہ کامل ہے اس لئے اس کے ساتھ کسی ضمیمہ کے الحاق کی ضرورت نہیں ۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (مائدہ ۱)

اس کے نفاذ کی حالت میں وہ مسائل و مباحث پیش ہی نہیں آتے جنہوں نے ہزاروں برس سے نوعِ انسانی کے مفکرین اور علم الاجتماع کے ماہرین کے دماغوں کو مشغول رکھا ہے اور جن کا آخری حل کبھی بھی پیش نہیں ہوا ۔ اور کتنے معاشی و سیاسی مسائل ہیں جو اس اصول میں پیدا نہیں ہوتے ۔ ہزاروں برس کی غلطیوں اور تجربہ کے بعد دنیا کے مفکر جس نتیجے پر پہونچے ہیں قرآن نے تیرہ سو برس پہلے ایک امی کی زبان سے پہلے ہی بیان کر دیا ۔ یہ نظام اور یہ دستور جس کا نام اسلام ہے خدا کی کاریگری اور حکمت کا اعلیٰ نمونہ ہے ۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ

اور چونکہ اس اسلام کے اصول و کلیات قرآن سے ماخوذ ہیں اور قرآن ہی نے ان کو دنیا کے سامنے پیش کیا اس لئے وہ اسی کا پیش کیا ہوا ایک معجزہ ہے ۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔ (جمعہ ۱۶)

قرآن کے اس معجزے کی تشریح اور اس کے وجوہِ اعجاز کو نمایاں کرنا درحقیقت اسلام کی پوری تشریح ہے جس کے لئے کتب خانے بھی کافی نہیں ۔ ان میں بعض چیزیں اپنے اپنے محل پر بھی آئیں گی عقائد کے باب میں اس کے عقائد کے معجزانہ ساخت اور ان کی معجزانہ تکمیل اخلاق و معاشرت کے ضمن میں قرآن کی معجزانہ جامعیت و حکمت کی طرف انشاء اللہ کچھ اشارات آئینگے لیکن ان نکات و اسرار کا استقصاء اور ان کے محاسن کا احاطہ کسی انسان سے کسی زمانہ میں بھی ممکن نہیں ۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ

اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ (نمل ۵)

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (کہف ۱۰۹)

قرآن کا دوسرا معجزہ اسکے علوم و معارف ہیں

قرآن کا دوسرا معجزہ اس کے وہ بے پایاں علوم و معارف اور حقائق و اسرار ہیں جو اس کتاب میں پھیلے ہوئے ہیں اور جن میں سے ہر ایک ایک مستقل معجزہ ہے انسان کا علم جتنا ترقی کرے گا اور اس کی آنکھوں سے جتنے پردے اٹھتے جائیں گے قرآن کا جمال اس کو بے نقاب نظر آئے گا۔

درحقیقت انسانی فہم کا ظرف، تنگ ہے قرآن کی وسعتوں کا متحمل نہیں اس لئے جو کچھ حصہ میں آئے غنیمت ہے۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا (رعد ۱۷)

ان معجزات میں اعجاز کے کئی پہلو ہیں ایک پہلو قرآنی حقائق کی ابدیت اور قطعیت ہے یہ ابدیت اور قطعیت حقیقت میں علم الٰہی اور کتب الٰہیہ کا خاصہ ہے تغیر اور اشتباہ انسانی علم اور انسانی معلومات کے لوازم میں سے ہیں چونکہ قرآن مجید پورے طور پر محفوظ ہے اس لئے اس کے حقائق کی ابدیت اور قطعیت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

مذہب اور مذہبی کتابوں میں جب انسانی دستبرد اور مداخلت شروع ہوجاتی ہے تو اس میں بہت سی ایسی چیزیں داخل ہوجاتی ہیں جن کی صحت کی ضمانت خدا کی طرف سے نہیں ہوگی۔ اس وقت اس میں انسانی علوم اور نظریات داخل ہوجاتے ہیں۔ اور چونکہ انسانی علم غیر معصوم غیر قطعی اور محدود ہے اس لئے ان صحیفوں کی قطعیت اور ان کے حقائق کی ابدیت قائم نہیں رہتی۔

قرآن مجید اول سے لیکر آخر تک ابدی اور قطعی ہے اس میں انسانوں کے تغیر پذیر نظریات اور ان کے تحقیقات و تجارب شامل نہیں، دنیا کے علوم و فنون جس قدر ترقی کریں طبیعیات اور فلکیات میں انسانوں کے نظریات جو شکل بھی اختیار کریں، زمین مرکز کائنات ثابت ہو یا آفتاب، زمین مسطح ثابت ہو یا کروی اصل اسیاری

آبادی اور عوالم کا تصور ثابت ہو یا نہ ہو قرآن کے حقائق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ بطلیموسی نظام نہیں ہے جو نظام کوپرنیکی سے باطل ہو جائے۔

لیکن اس کے برعکس بائبل انسانی تحریف و اجتہاد سے نہ بچ سکی اس میں عوام کے مشہور اور مقبول عقائد اور نظریات شامل ہو گئے اس کی رو سے دنیا کی عمر چھ ہزار سال ہے، زمین ایک چپٹی سطح ہے سورج چاند اور ستارے متحرک ہیں زمین مرکز کائنات ہے، باقی تمام اجرام فلکی اور غیر فلکی اس کے تابع ہیں زمین کی دوسری طرف آبادی کا ہونا محال ہے اس لئے کہ بقول سینٹ آگسٹائن "حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے کوئی اس قسم کی جیل نہیں کی گئی۔ زمین کی کروی شکل ہونے کے خلاف سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس طرف کے باشندوں کو حشر کے دن خداوند خدا کا ہوا سے زمین پر اترنا کس طرح نظر آئے گا۔

یہ ابحاث تاریخ و سائنس ممکن ہے مؤلفین و شارحین کتب مقدسہ کے زمانے کے تصورات یا مسلمات کے مطابق ہوں لیکن اس کا حقیقت کے مطابق ہونا ضروری نہ تھا۔ یہ انسانی علم کی ایک خاص منزل ہو گی مگر انسان کا علم مسافر ہے مقیم نہیں، وہ جتنا آگے بڑھتا گیا اس منزل کو پیچھے چھوڑتا گیا یہاں تک کہ ایک وقت آیا کہ مذہب و عقل کا ساتھ چلنا محال ہو گیا۔ یہ مذہب و سائنس کے تصادم کا دور یورپ میں مذہب کے زوال کا پہلا دن تھا لیکن اسلام کی تاریخ میں واقعی طور پر یہ دن کبھی پیش نہیں آ سکتا انسانوں کے علوم آپس میں ٹکرائیں گے اور ٹکرا سکتے ہیں ان میں سے ایک غلط ہو گا اور ایک صحیح اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں غلط ہوں لیکن خدا کی محفوظ کتاب کے حقائق اور بیانات اور صحیح علم میں کوئی تصادم ممکن نہیں، جو علم اس سے ٹکرائے گا وہ صحیح علم نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح قرآن مجید پر انسانوں کے وقتی، معاشی، اجتماعی، اور سیاسی رجحانات کا کوئی اثر نہیں اس کا نظام ان مسائل میں بھی ابدی اور دائمی ہے،

قرآن مجید کا تیسرا معجزہ غیبی واقعات ہیں

قرآن مجید میں انبیاء سابقین اور گزشتہ قوموں کے متعلق جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ قرآن کا ایک مستقل معجزہ ہے جس میں اعجاز کا پہلو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان اطلاعات کا سرچشمہ اور ان روایات کا ماخذ علم الٰہی کے فیض اور غیب کی اطلاع وحی کے سوا کچھ نہیں، آنحضرت

ان قصص و متعلقہ قصص بنیادہ تر بلکہ تمام تر مکی سورتوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ اور وہاں باتفاق مورخین کوئی یہودی اور عیسائی دستاویز جن تک نقل جو انجیل کا علم رکھتے تھے کچھ روایات کے مطابق نبوت کے پہلے ہی سال پہلی وحی کے بعد ہی منتقل کر گئے تھے۔ [1]

ہجرت سے پہلے دو عیسائیوں سے آپ کا ملنا بیان کیا جاتا ہے ایک بحیرہ راہب[2] دوسرا عداس اول الذکر سے شام کے شہر بصریٰ میں اور دوسرا الذکر سے حجاز کے شہر طائف میں ملنا مذکور ہے لیکن پہلی ملاقات چند گھنٹوں اور دوسری ملاقات چند منٹوں سے زیادہ نہیں۔ پہلی ملاقات کے وقت آپ کی عمر تیرہ سال کی تھی اس عمر میں اور اتنی چھوٹی عمر میں اور اتنی مختصر ملاقاتوں میں کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا کہ آپ نے وہ تمام علوم حاصل کر لئے جو نبوت کے تیئس سال میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ اس صحت و اتقان کے ساتھ جس سے خود یہودی اور مسیحی صحیفے قاصر ہیں بیان فرمایا بعد اس کوئی عالم نہ تھا وہ خود آپ کا معتقد ہوا اس لئے اتنی کمزور روایتی اور غیر روایتی بنیاد پر کسی طرح اس قیاس کی عمارت نہیں اٹھتی کہ آپ کے علوم غیبیہ جن کا ایک ایک حرف اور نقطہ تمام تحقیقات اور انکشافات کے بعد صحیح ثابت ہوا۔ ان لوگوں کے علم سے ماخوذ ہیں جن کی شخصیت ہر طرح سے مشتبہ ہے اور جن کا افسانہ ان کی اصل سے زیادہ ہے جس چراغ میں خود نور نہ ہو اس سے دوسری شمع کس طرح جل سکتی ہے ان غریب عیسائیوں کے پاس جن سے آپ کے تلمذ اور استفادہ کی نسبت کی جاتی ہے خود کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کو علم کہا جا سکے۔

پس اس سے ثابت ہو گیا کہ ان واقعات کا کم سے کم آپ کے لئے کوئی ذریعہ اطلاع موجود نہ تھا تو یہ تمام تر واقعات محض وحی الٰہی کا کرشمہ ہیں اور اعجاز کا یہی پہلو ہے جس کی طرف قرآن نے بار بار توجہ دلائی ہے حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کے واقعات اور حضرت مریم کے واقعات کی بعض جزئیات بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے۔

ذَٰلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ (آل عمران ۴۴)

[1] [illegible] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

حضرت نوح کے طوفان کا واقعہ بیان کرکے فرماتا ہے۔

تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ ۔ (ہود ع ۴)

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ بیان کرکے فرماتا ہے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْآنَ وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ ۔ (یوسف ع ۱)

پھر ان واقعات کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ ۔ (یوسف ع ۱۱)

اسی سورت میں فرماتا ہے کہ یہ واقعات موضوع نہیں ہیں بلکہ ان سے کتب سابقہ کی تصدیق اور تفصیل ہوتی ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلٰكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۔ (یوسف ع ۱۲)

ایک جگہ کفار کے اس قول کی تردید کرتے ہوئے کہ یہ واقعات آپ کی پرانی یا قلمی یادداشت سے ماخوذ ہیں ان کا صحیح ماخذ بیان کیا ہے۔

وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۔ قُلْ أَنْزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا (فرقان ع ۱)

دوسری جگہ اس سورت میں کفار کے اس بیان کی پرزور تردید کی ہے کہ آپ ان قرآنی واقعات کو کچھ لوگوں کی امداد سے اور سازش سے بیان کرتے تھے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هٰذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرَاهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ

لَقَدْ جَاءُوا ظُلْمًا وَّزُوْرًا (فرقان ۴)

سورۂ قصص میں ان واقعات کے ظہور کے موقع پر آنحضرتؐ کی غیر موجودگی اور ان سے آپ کی لاعلمی بتائی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ان اطلاعات کا سرچشمہ محض وحی الٰہی ہے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَا إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشَّاهِدِينَ ٥ وَلَٰكِنَّا أَنْشَأْنَا قُرُونًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِي أَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَلَٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا وَلَٰكِنْ رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَا أَتَاهُمْ مِنْ نَذِيرٍ مِنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (قصص ۵)

سورۂ عنکبوت میں آپ کی ان چیزوں سے بیگانگی اور آپ کی امیت کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ اس ماحول سے قطعاً ناآشنا اور علم کے سامان و لوازم سے بھی بے گانہ تھے اب متکلمین کے لئے اس علم کے ماخذ کے متعلق شبہ کی کیا گنجائش ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُو مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ (عنکبوت ۵)

حضور نبوت میں یا اس کے بعد جن لوگوں کا خیال تھا کہ قرآن مجید کے علوم و واقعات تورات و انجیل سے ماخوذ ہیں وہ تورات و انجیل سے سرے سے بے خبر معلوم ہوتے ہیں، قرآن مجید اور تورات و انجیل آج بھی دنیا میں موجود ہیں اور یہودیوں و عیسائیوں کے عام عقیدہ کے مطابق ان کے صحیفے محفوظ بھی ہیں، آج بھی نہایت آسانی کے ساتھ قرآن اور ان صحیفوں کا تقابل کیا جا سکتا ہے، اور اس دعوے کی علمی تنقید کی جا سکتی ہے، انبیاء علیہم السلام کے جو واقعات قرآن اور عہد عتیق کے صحیفوں میں مشترک ہیں ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے ماخوذ نہیں بلاشبہ واقعات کے بعض اجزا ان صحیفوں میں اس طرح مشترک و متحد ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کا اصلی سرچشمہ ایک ہی ہے اور وہ وحی ہے لیکن واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک چیز محفوظ رہی اور دوسری چیز انسانی دستبرد (ر

ماخلت سے محفوظ رہ سکی۔ ان صحیفوں کے اسلوب بیان مضامین کی اہمیت کے مباحث اور مرکز میں جو فرق معلوم ہوتا ہے دونوں کا انداز بالکل جدا ہے ایک میں وحی کی تاثیر کتاب الٰہی کی اہمیت کی شان اور وحی کے انوار نظر آتے ہیں اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان واقعات کا موضوع تاریخ نہیں ہے بلکہ ہدایت اور عبرت و موعظت ہے، اس میں سنین نہیں ہیں اس میں اعداد نہیں، اشخاص کی تعداد اور ہر قسم کی وہ تفصیلات جن کا تعلق تاریخ اور انساب سے ہے اس میں نہایت مناسبت اور حسن کے ساتھ حذف ہیں۔ واقعات کے سلسلہ کی وہی کڑیاں منتخب کی گئی ہیں جو ہر زمانے میں انسانوں کے لئے ہدایت اور عبرت کا سبق بن سکیں۔

سورۂ یوسفؑ کے آخر میں خدا فرماتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِنْ تَصْدِيقَ
الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (یوسف ۱۲)

انبیاء اور امم سابقہ کے واقعات میں دعوت و تبلیغ کی یہی روح اور کلام الٰہی کی یہی شان ملے گی کلام الٰہی کی یہی خصوصیت اور اس کے اعجاز کی ایک دلیل ہے پیغمبر خود اس خصوصیت کا حامل ہوتا ہے۔ وہ تمام غیر متعلق مباحث اور دور از کار تاریخی تفصیلات سے دامن بچاتا ہے اور انہیں چیزوں کا ذکر کرتا ہے جو انسانوں کی نجات اور ہدایت کے لئے مفید ہیں فرعون نے حضرت موسیٰ کو ایک تاریخی بحث میں الجھانا چاہا لیکن انھوں نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ اس بحث کا دروازہ بند کر دیا اور اپنی دعوت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، فرعون نے کہا تھا فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَىٰ حضرت موسیٰ نے فرمایا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتَابٍ لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنْسَى اس کے مقابل میں تورات میں سلاطین تواریخ اور کتاب پیدائش کا مطالعہ کیجئے، ان پر تاریخیت کا رنگ غالب ہے کثرت سے سنین ہیں، اشخاص و قبائل کی گنتیاں ہیں اور عماروں کی مفصل تشریح، اس میں بھی کہیں کہیں وحی کی روشنی نظر آتی ہے اور انسان کا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ خدا کے کلام کا ترجمہ ہو سکتا ہے۔

ہم تورات و قرآن کا فرق سمجھانے کے لئے مثال کے طور پر حضرت یوسف کا قصہ انتخاب کرتے ہیں جو قرآن اور تورات

میں پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

تورات میں واقعہ کے بہت سے اجزاء قرآن سے زائد ہیں لیکن عموماً یہ وہ اجزاء ہیں جن میں ناموں کی تعیین ہے اور جزئی تفصیلات ہیں۔ رنگ ایسی بیہودہ کا ایک ایسا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ جس کو پڑھ کر تہذیب کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں۔ وہ حضرت یعقوبؑ کے گھرانے کے کسی طرح شایان شان نہیں بعض ایسی چیزیں مذکور ہیں جو حضرت یوسفؑ کی شان نبوت کے منافی ہیں (دیکھو)

قرآن مجید میں ان واقعات کے بعض ایسے اہم اجزاء مذکور ہیں جو تورات میں بالکل محذوف ہیں۔

(۱) تعبیر خواب کے سلسلہ میں حضرت یوسفؑ کا دل پذیر اور دل نشیں توحید کا وعظ جو حکیمانہ تبلیغ و دعوت اور پیغمبرانہ حکمت و موعظت کا بہترین نمونہ ہے۔ اور جس میں حضرت یوسف کا اجمال پوری طرح عیاں ہے تورات میں مطلقاً مذکور نہیں ہے (سورہ یوسف ع ۵)

قرآن کہتا ہے کہ شاہ مصر نے جب خواب دیکھا اور حضرت یوسفؑ کی بتلائی ہوئی تعبیر سنی تو اس کو آپ سے ملنے کا اشتیاق ہوا اور اس نے آپ کو لانے کے لئے قاصد بھیجا آپ نے اس موقع پر جیل خانے سے نکلنے میں عجلت نہیں کی بلکہ یہ ضروری سمجھا کہ آپ کے رہا ہونے سے پہلے اس واقعہ کی تحقیق کر لی جائے جس کے غلط الزام میں آپ کو جیل خانہ میں رہنا پڑا تھا تاکہ جس طرح اس الزام کی شہرت ہوئی ہے اس بے گناہی اور پاکدامنی کی بھی شہرت ہو جائے اور آپ کی رہائی محض بادشاہ کا کرم نہ سمجھا جائے بلکہ آپ کی برأت اور صفائی کا نتیجہ۔ یہ واقعہ حضرت یوسفؑ کی شان نبوت آپ کی خاندانی غیرت و خودداری اور آپ کے فہم و فراست کے عین مناسب ہے لیکن یہ پورا واقعہ تورات میں مذکور نہیں، تورات میں یہ عبارت ہے:

یہ بات فرعون کی نگاہ میں اور اس کے سب نوکروں کی نظر میں اچھی معلوم ہوئی فرعون نے اپنے نوکروں کو کہا کیا ہم ایسا جیسا یہ مرد ہے کہ جس میں خدا کی روح ہے پا سکتے ہیں؟ اور فرعون نے یوسف سے کہا از بس کہ خدا نے تجھے اس سب میں سمجھائی دی ہے سو کوئی تجھ سا عاقل اور دانشمند نہیں ہے۔ تو میرے گھر کا مختار ہو اپنا حکم میری سب رعیت پر جاری کر فقط تخت نشینی میں میں تجھ سے بزرگ

تر ہوں گا (کتاب پیدائش ۴۲: ۲۰)

(۲) قرآن کہتا ہے

فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ (یوسف)

اور جب خود عزیز نے جس کے الزام پر آپ جیل خانے گئے تھے، اپنی زبان سے آپ کی برأت کا اعلان کیا تو آپ نے اس تاخیر کا اور اس تحقیق کے مطالبہ کا سبب بتلایا۔

ذَٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ

پھر خودی کے شبہ کو دور کرنے کے لئے آپ نے پیغمبرانہ انابت کے ساتھ فرمایا۔

وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ (یوسف)

یہ صاف نبوت کا کلام ہوتا ہے اور اس میں حضرت یوسف کی سیرت اور کردار کا جلوہ صاف نظر آتا ہے تورات سے یہ اہم اور موثر حصہ بالکل حذف ہے۔

(۳) حضرت یعقوبؑ کی گفتگو میں جو تورات میں منقول ہے نبوت کی جھلک اور للٰہیت کا وہ نور نہیں ہے جو قرآن میں نظر آتا ہے تورات کتاب پیدائش اور قرآن سورہ یوسف کا مقابلہ کرکے دیکھئے قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ متوکل علی اللہ بزرگ ہیں ہر واقعہ میں ان کو خدا کی قدرت کا ہاتھ نظر آتا ہے بات بات پر وہ اللہ کا نام لیتے ہیں اور اس کی بڑائی بیان کرتے ہیں لیکن تورات میں وہ ایک دردمند صاحب اولاد اور ایک سن رسیدہ تجربہ کار کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ بنیامین کے رہ جانے کے بعد بھائیوں کا حضرت یعقوبؑ کے پاس واپس جانا اور حضرت یعقوبؑ کی دردمندانہ پرسوز گفتگو جس میں متوکلانہ شان بھی جھلکتی ہے تورات سے بالکل حذف ہے (دیکھو کتاب پیدائش باب ۴۲ و ۴۳)

(۴) قرآن مجید میں ہے کہ حضرت یوسفؑ اپنے چھوٹتے ہوئے باپ اور بچھڑے ہوئے بھائیوں سے

قوت کا ان شکریہ ادا کرنے کی وجہ سے لبریز ہو گیا۔ شہنشاہی کی آرائشوں میں ان کی خاندانی دینداری اور نبوت کی روشنی چمکی اور بادشاہت کی سرفرازی میں بندگی کا جوہر نمایاں ہوا اور انھوں نے خدا کا شکریہ اس طرح ادا کیا اور اس سے اس طرح دعا کی۔

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ أَنْتَ وَلِيِّي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ ع (یوسف)

یہ شکر اور مکالمہ بھی تورات سے محذوف ہے (دیکھو کتاب پیدائش ب۴۷ و ب۴۸)

قرآن مجید اور تورات کے درمیان ایک بڑا عظیم الشان فرق یہ ہے کہ قرآن نے انبیاء کی سیرت بالکل بے داغ اور ایسی پاکیزہ پیش کی ہے جو ان کے منصب و مقام کے بالکل مطابق ہے، بلکہ اس نے ان تمام الزامات اور تہمتوں کی تردید کی ہے جو ان کے دشمنوں اور دوستوں میں مشہور تھیں، لیکن عہد عتیق کے صحیفوں میں ان انبیاء کے متعلق ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جن کو پڑھ کر تہذیب کی آنکھیں جھک جاتی ہیں اور حیا کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ ان پر کہیں کفر کے الزامات لگائے گئے اور کہیں فسق کے۔ کتاب پیدائش کے باب ۹ میں حضرت نوحؑ کے متعلق، کتاب پیدائش کے ب۱۹ میں حضرت لوطؑ کے متعلق، کتاب خروج کے ب۳۲ میں حضرت ہارونؑ کے متعلق اور حضرت سلیمانؑ کے متعلق کتاب سلاطین کے ب۱۱ میں صاف صاف کفر و شرک اور فسق و فجور کی شہادتیں موجود ہیں۔

لیکن قرآن مجید میں حضرت نوحؑ کو رسول امین کہا گیا ہے (سورۂ شعراء) اور ان پر سلامتی اور برکات بھیجے گئے (ہود ۴)، حضرت لوطؑ کے متعلق فرمایا گیا ہے۔

وَلُوطًا آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ تَعْمَلُ الْخَبَائِثَ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمَ سَوْءٍ فَاسِقِينَ ۔

وَأَدْخَلْنَا فِي رَحْمَتِنَا أَخَاهُ هَارُونَ نَبِيًّا (مریم ۴)

تورات میں حضرت ہارون پر گوسالہ پرستی کا جو صاف صاف الزام لگایا گیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"بنی اسرائیل کے کہنے سے موسیٰ کی غیبت میں ہارون نے زیور کا ایک بت بنایا اور تمام بنی اسرائیل سے اس کو پجوایا اور

میں کہ کے لئے قربانیاں گذرانے کا حکم دیا اور یہ کہا کہ یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں مصر کی زمین سے نکال لایا ہے۔

قرآن اس کی صاف تردید کرتا ہے اور اس کے بالکل برعکس ان کی دعوتِ توحید کا ذکر کرتا ہے۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هَارُونُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ إِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُونِي وَأَطِيعُوٓا أَمْرِي (۲۰:۹۰)

حضرت سلیمان کے متعلق تورات کے الفاظ یہ ہیں۔

کیونکہ ایسا ہوا جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا، اور اس کا دل خداوند اپنے خدا کی طرف کامل نہ تھا جیسا کہ اس کے باپ داؤد کا تھا سو سلیمان صیدانیوں کی دیوی اشتارات اور بنی عمون کے نفرتی ملکوم کی پیروی کی اور سلیمان نے خداوند کی نظر میں بدی کی اور اس نے خداوند کی پوری پیروی اپنے باپ داؤد کی طرح نہ کی۔

آگے چل کر کہا گیا ہے

سو خداوند کا اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے جو اسے دو بار دکھائی دیا برگشتہ ہوا اس سے خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا کہ اس نے اس کو حکم دیا کہ وہ اجنبی معبودوں کی پیروی نہ کرے پر اس نے خداوند کے حکم کو یاد

ذکیا، ۲

سورۂ ص میں ان کے اخلاص و عبدیت کا اور ان کے قرب اور وجاہت کو بیان کیا گیا۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهٗٓ أَوَّابٌ

آگے چل کر فرماتا ہے

وَإِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ۔ (ص ۲۶)

اسی طرح حضرت مسیح اور ان کی والدہ پر یہودیوں نے جو کچھ الزامات لگائے تھے اور ان کی طرف جن باتوں کی نسبت کرتے تھے قرآن مجید نے ان کی صاف صاف تردید کی ہے اور حضرت مسیح کو خدا کے ایک مکرم اور وجیہ اور مبارک پیغمبر کی

تفصیل سے بحث کی گئی ہے (ملاحظہ ہو سورۂ آل عمران سورۂ مائدہ سورۂ مریم وغیرہ)

ان مضامین میں جو قرآن اور صحف سابقہ کے درمیان مشترک ہیں قرآن مجید اور ان صحیفوں کے درمیان بالاصل فرق ہائے اصولی بھی ہیں جن کے متعلق ان کے ماننے والے کہہ سکتے ہیں کہ یہ محفوظ ہیں یہ اصولی فرق ہے باقی وہ مضامین اور تعلیمات جو ان میں قرآن میں مذکور ہیں اس کے علاوہ ہیں اس کے بعد یہ کہنا کہ قرآن مجید ان قدیم معلومات میں صحف سابقہ کا خوشہ چیں ہے تو قرآن مجید نیز انہی مذہبی کتابوں سے ناواقفیت کی دلیل ہے قرآن مجید کے مضامین براہ راست علم الٰہی سے ماخوذ ہیں اور ان کی اطلاع کا سرچشمہ وحی آسمانی ہے اس لئے وہ حقیقت کے بالکل مطابق بے داغ اور ہر قسم کے شک و اشتباہ سے پاک ہے وہ صحف سابقہ کی انسانی تحریفات اور یہودیوں کے انبیاء مقدسین کے متعلق ہر قسم کی غلط بیانیوں اور بہتان تراشیوں کی تردید کرنے والا اور ان کتابوں کا مصدق و مہیمن ہے۔

قرآن مجید کے اعجاز کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس نے یہودیوں اور عیسائیوں کے مختلف مذہبی فرقوں کے اخلاقی عقائد اور خیالات کو جن سے عام آدمی واقف نہیں ہیں بڑی صحت اور پختگی کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان کے مختلف مذہبی خیالات و اختلافات کے سلسلے میں بڑی نازک باریک باتوں کا خیال رکھا ہے قرآن نے تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ ان کے جو عقائد و اختلافات بیان کئے ہیں ان کے مذہبی لٹریچر کے وسیع اور گہرے مطالعے سے اس کے لفظ لفظ کی تصدیق ہوتی ہے جس قدر ان مذاہب کی گہری واقفیت اور ان کی کتابوں کا ذخیرہ جو اب کثرت سے شائع ہوتی جا رہی ہیں، گہرا مطالعہ کیا جاتا ہے قرآن کے بیانات کی تصدیق ہوتی جاتی ہے اور عجیب عجیب حقائق کا انکشاف ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا ان کے بارے میں کوئی لفظ ضائع و بیکار نہیں اور اس کے الفاظ و تعبیر کا کوئی فرق بے محل نہیں۔

اسی طرح اشخاص و واقعات کے سلسلے میں قرآن نے جن چیزوں پر زور دیا یا جن چیزوں کی نفی کی ہے وہ اس وجہ سے کہ یہودی و عیسائی ان چیزوں کو نہیں مانتے تھے اور ان کے بعض الزامات و روایات کی تردید مقصود ہے۔

یہ علمی دقیق باتیں اور یہ معجزانہ پہلو کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی، جس کو یہودیوں اور عیسائیوں کے اندرونی اور گہرے واقعات و خیالات کا پورا علم نہیں تھا۔ یہ عالم الغیب کا صحیفہ ہے جس میں کوئی شک و اشتباہ اور اس کے علم میں

کوئی نقصان نہیں۔

فَاِنَّهٗ لَكِتَابٌ عَزِيْزٌ لَا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ
حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (حم السجدہ ۱۰)

گذارش

جن حضرات کا چندہ خریداری ختم ہو چکا ہے، ان سے استدعا ہے کہ وہ نئے سال کے لئے
چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما کر مشکور فرمائیں   وی۔پی بھیجنے پر ان کا ۴؎ کا نقصان ہوگا۔

"مینیجر"

روسو کا نظریۂ تعلیم

مسٹر محمد سمیع صاحب ایم اے بی ٹی صدر شعبۂ انگریزی مدرسۃ العلوم

اٹھارھویں صدی عیسوی یورپ کے لئے وہ زمانہ ہے جبکہ ہر شعبۂ زندگی میں انقلاب عظیم برپا ہوا۔ پاپائیت اور مطلق العنان آزاد شخصی حکومت کا خاتمہ انقلاب فرانس کی شکل میں ظاہر ہوا۔ صنعتی زندگی کو عروج اور جمہوریت کے اصول عام ہوئے۔ لاک اور ہیوم نے انگلستان میں اور والٹیر نے فرانس میں عقلیات پر رسالے اور کتابیں لکھیں۔ دماغی قوتوں کی آبیاری شروع ہوئی۔ فکر میں آزادی اور کائنات کا مطالعہ آزادانہ ہونے لگا۔ مگر نظام تعلیم پرانی وضع پر قائم تھا۔ روسو نے اسکی طرف توجہ کی اور جمہوریت کے نقارہ پر یورپ کے جگانے کے لئے پہلی چوٹ لگائی۔ تعلیم کو فطرت انسانی کے ہمدوش چلنے پر ایک نیا نظریہ پیش کیا۔ اس کی بحث میں روسو کے نظریات پیش کئے جاتے ہیں۔

روسو ۱۷۱۲ء سے ۱۷۷۸ء (ROUSSEAU) جنیوا میں پیدا ہوا جو سوئٹزرلینڈ میں ایک جھیل کے کنارہ واقع ہے اور مشہور سیرگاہ ہے۔ یہ ایک گھڑی ساز کا بیٹا تھا۔ ماں ایک کلیسا کے پادری کی بیٹی تھی۔ ماں پیدائش کے وقت ہی دنیا سے رخصت ہو گئی۔ خالہ نے پرورش اور تربیت کی۔ روسو ایک آزاد منش انسان تھا۔ جذبات اور تخیل کی دنیا میں زندگی بسر کرتا تھا۔ اس نے پلوٹارک (PLUTARCH) کی سوانح حیات اور دیگر تاریخوں کا مطالعہ کیا جو اسکے کیرکٹر کی تشکیل میں معین ہوئیں۔ اور اس میں بطولیت کا احساس پیدا کیا جس کو وہ خود یوں تعبیر کرتا ہے: "وہ جمہوری جذبہ اور آزادی کی وہ پرغرور اور ناقابل شکست طبیعت جس نے مجھے ہر رکاوٹ اور مانع کے ڈھانے کے لئے اکسایا۔" اسکی انتہا طبیعت نے جس پر اسے خود قابو نہ تھا، اسے انقلابی قالب میں ڈھالا اور سوسائٹی کے نظام کے خلاف جو راسخ تھا جہاد پر آمادہ کیا۔

وہ ایسے ماحول میں پلا تھا کہ اسے فطرت سے محبت تھی۔ وہ خیال کرتا تھا کہ بندش اور سخت گیری سے انسانی احساسات اور جذبات کے ساتھ جو کام لیا گیا ہے حقیقتاً یہ فطرت سے بغاوت ہے۔ نوع انسان کے اندر فساد کا باعث ہوا ہے۔

بچپن میں وہ مدرسہ میں داخل کیا گیا جہاں سے تعلیم حاصل کی۔ طبیعت کی آزادی نے قیود کو توڑ پھینکا۔ سزا ملی اور آوارہ گردی اختیار کی۔ صحبت بھی اچھے لوگوں کی نہ ملی۔ ذلیل کاموں میں مبتلا ہوا۔ پھر جینوا واپس ہوا اور بیکاری کیساتھ جذباتی حالت میں بسر کرتا رہا۔ انیس سال کی عمر میں سوائے (SAVOY) کے مقام پر میڈیم ڈی ویرنس کیساتھ اقامت اختیار کی۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھتا تھا لیکن فطرت کے ساتھ عشق رکھتا تھا۔ اس آوارہ گردی نے اس پر واضح کر دیا۔ مظلوموں کے طبقہ سے ہمدردی پیدا ہو گئی جس کا احساس اس وقت عام طریقہ پر پیدا ہو چلا تھا لیکن کسی اقدام کا محتاج تھا۔

استبدادی شہنشاہیت کا دور دورہ تھا لیکن نظام حکومت برائے نام بادشاہ کے زیر نگیں ہوتا تھا بلکہ خود غرض درباریوں کی داد و دہش اور سازشوں کا نتیجہ ہوتا تھا۔ کسان ٹیکسوں سے تباہ حال اور جائز حقوق سے محروم تھے۔ عیش پرست طبقہ کی ناز برداری اور ان کے لئے سامان تعیش کی بہم رسانی ان کا کام تھا۔ قدرت نے روسو کو منتخب کیا کہ سوئے ہوئے جذبہ کو جگائے۔ انقلاب کا نعرہ بلند کرے۔ اور عوام کی دبی چنگاری کو شعلہ کی طرح بھڑکا دے اسکے لئے اس نے اپنی تصنیفات سے کام لیا۔ اس کے مقالات سوشل کنٹریکٹ (SOCIAL CONTRACT) اور ایمیل (EMILE) اشتہار عام پا گئے۔ (THE PROGRESS SEIENCES AND ARTS. فلسفہ ۱۷۵۰ء میں اس نے ایک مصنف کی حیثیت سے شہرت حاصل کر لی تین سال بعد (INEQUALITY) لکھی جس میں دکھایا کہ غیر مساویانہ حالت تمدن کے آنے سے پیدا ہوئی۔ اور طبقات انسانی نے انسانیت سوز رنگ اختیار کیا، ذاتی انفرادی میراث کا قانون جاری ہوا۔ ابتدائی زندگی کے ابتدائی مدارج میں مشکل سے وراثت کی مثال ملتی ہے۔ وہ اس اول شخص کے متعلق جس نے ایک قطعہ اراضی پر قبضہ کیا اور کہا کہ "یہ میرا ہے" کہتا ہے

"اس غاصب سے ہوشیار ہو اس کی آواز پر کان نہ دو اگر تم نے یہ بھلا دیا کہ زمین کسی کی ملک نہیں۔ اور اس کے پھل عام استعمال کے لئے ہیں تو تباہی کے سوا کچھ نہیں"

۱۷۶۲ء تک اس کی اور تصانیف شائع ہوئیں۔ ایمیل (THE EMILE) اس زمانے کا

مجبوری طرز تعلیم کے خلاف اعتراض ہے۔ وہ فطری طریقہ تعلیم پر زور دیتا ہے۔ ساتھ ہی واضح کرتا ہے کہ یہی تعلیم تمدن کی خرابیوں کو دور کر سکتی ہے اور انسان کو فطرت کے قریب تر لا سکتی ہے۔ رٹی اور تقلیدی تعلیم کو برا سمجھتا ہے، ذہنی تربیت کا سوال محض جدید پر مبنی تھی اس کے بجائے اس نے فطری اصول کو پیش کیا۔ ایمل کی تعلیم اور تربیت کا نقشہ پیش کرتا ہوا بچپن کا تعلق کرتا ہے۔ فطرت کے کارفرما کی طرف سے ہر چیز مناسب اور اچھی ملتی ہے۔ انسان کے ہاتھ میں پڑ کر کم مایہ اور خراب ہو جاتی ہے۔ تین قسم کے استاد ہوتے ہیں (۱) فطرت (۲) انسان (۳) اشیاء۔ تعلیم فطرت پر مبنی ہونی چاہئے شہری حقوق اور دولت کے لئے نہیں بلکہ ایسی نوجوانی کی نشو و نما ہو جو حیات انسانی کے فرائض کو انجام دے سکے اس کا قول ہے: اگر عادات بچے میں پیدا کرانے ہیں تو کوشش یہ ہو کہ کوئی عادت نہ اختیار کرے۔ ایمل کی تعلیم کیلئے وہ بچپن میں محض جسمانی تعلیم پر انحصار رکھتا ہے۔ اس کے فطری جذبات کو برائی کی آلودگی سے پاک رکھتا ہے اور ذہن کو غلطیوں سے دور۔ لڑکپن۔ پانچ سے بارہ سال کی عمر تک وہ کوئی اخلاقی تعلیم نہیں دیتا بلکہ افعال کے نتائج سے علم میں اضافہ کرنا پسند کرتا ہے اس عمر میں دماغی تعلیم پر جسمانی تعلیم کو ترجیح دیتا ہے۔ مثلاً سردی اور گرمی کی برداشت۔ بارہ سے پندرہ سال کی عمر کے لئے مفید مطالعہ کی طرف توجہ دلاتا ہے وہ بھی کتاب کے ذریعہ نہیں۔ اگر کوئی کتاب تجویز کرتا ہے تو وہ رابن سن کروسو ROBINSON CRUSOE ہے۔ وہ تمام نصابی کتب کو ترک کرتا ہے صرف نیچرل سائنس کو تعلیم کیلئے ضروری سمجھتا ہے کتابی علم نہیں بلکہ اس کو دریافت کرنے پر زور دیتا ہے۔

نوجوانی۔ پندرہ کے بعد جبکہ لڑکے کو اخلاقی اور مذہبی پیکر بنتا ہے اسے تعلیم عملی دیجائے یعنی مفلسوں کی تباہ حالی کا مطالعہ حس کا استعمال اور کائنات کے پس منظر سے ایک خدا کا یقین پیدا کرنا چاہئے اب تک تعلیم کا مقصد نفس کی ترقی اور اس کا فائدہ تھا اب معاشرتی تعلقات کی بھی تربیت ہونی چاہئے۔ اور ایک دوسرے سے محبت اخلاق اور مذہب کے اصول پر چلانا چاہئے۔

اپنے ہیرو ایمل کو اب نوجوان پاتا ہے۔ اس کے لئے رفیقہ حیات جو اعلیٰ تربیت یافتہ ہو تلاش کرتا ہے تعلیم نسواں کے بارے میں انفرادی تعلیم کے اصول سے انحراف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ عورت کی تعلیم صرف مرد کی خاطر ہونی چاہئے

جسمانی تربیت ہو تاکہ حسن ظاہری اور تناسب اعضاء پیدا ہو اور نسل انسانی میں اچھے قویٰ کے بچے پیدا ہوں۔ اس کے سوا اور کوئی معیار ضروری نہیں۔

روسو کی تصنیف سیاسی اور کلیسائی پیشواؤں کے نزدیک ایک جرم قرار دی گئی اور اس نے موت تک جلاوطنی کی زندگی بسر کی۔ لیکن اس نے تعلیمی نظریات اور عملیات میں انقلاب عظیم پیدا کیا۔ تعلیمی نظام، طرز تعلیم اور نصاب تعلیم کو بدل ڈالا اور تمام تقلیدی، مذہبی اور غیر فطری نظام جو مدارس میں جاری تھے ختم ہو گئے اور انسان کی فطرت عامہ پر سارا نظام بنا۔ یہ اسی کا اثر تھا کہ تعلیم پر تعمیر انسانی سے وابستہ ہوئی۔ آج جو نظریہ تعلیم کا قائم ہے کہ اخلاقی عمرانی اور منطقی تعلیم دی جائے اس کے لئے تصنیف ایمیل خشت اول بنی۔ طرز تعلیم اور نصاب تعلیم کا بنیادی اصول بچہ کا مطالعہ کرنا ٹھہرا۔ اور جو بھی کل اور تعلیم بہم پہونچائی جائے بچہ کی ترقی کے مدارج کا لحاظ رکھا جائے۔ اسے آزادی دی جائے اور بچہ کی نفسیاتی ترقی کے مدارج کا گہرا مطالعہ کیا جائے۔ بچہ کو بچہ نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اس میں اور نوجوان کی تعلیم میں کوئی فرق اگر تھا بھی تو زیادتی اور کمی کا۔ ان کے فکری احساساتی اور عملی زندگی کے لئے کوئی معیار نہ تھا۔ ایمیل کی تعلیم ہی تھی جس نے پیش کیا کہ فطرت اور ماحول فطرت ہی انسانی غلط رو کو صحیح بنا سکتی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں نے طبیعیات کا مطالعہ نصاب میں داخل کیا، نباتاتی اور حیوانی زندگی کے لئے ڈپارٹمنٹ کھولے گئے اور مختلف کتابیں لکھی گئیں۔ انگلینڈ میں پہلے تو کوئی خاص اثر نہیں پڑا البتہ امریکہ میں پبلک ابتدائی اسکول کی بنیاد پڑی۔ اس اصول پر عملی تعلیم جرمنی میں شروع ہوئی اور جو نظریہ تھا چودھویں صدی عیسوی سے بتدریج تاریخ اصلاحی، مذہبی اور ذہنی تغیرات یکے بعد دیگرے ارتقائی طور پر رونما ہوتے چلے آتے تھے اٹھارہویں صدی کے اواخر میں۔ روسو کے نظریہ نے ایک ضرب کاری لگائی۔ ارتقائی طرز نے انقلابی شکل اختیار کر لی اور ایک نیا راستہ تعمیر نو کے لئے اختیار کیا گیا۔ روسو کے افکار کے بہترین نتائج پسٹالوزی اور نو[illegible] کے ذریعہ پایہ تکمیل کو پہونچے۔ روسو نے اٹھارہویں صدی کے استبدادی شخصی حکومت کی عمارت کو ڈھایا۔ ان اختیارات خصوصی پر جو ضرب کاری لگائی اور منافقت اور فریب کے قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی لیکن اس کھنڈر پر پائدار عمارت کا اٹھانا پسٹالوزی کے ہاتھ پورا ہوا۔ (باقی)

حالاتِ ندوہ

از عبدالکلیم گورکھپوری متعلم دارالعلوم

اس مہینے میں متعدد بزرگوں اور دوستوں نے پذیرائی کا شرف بخشا، انمیں حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، مولانا عبدالسلام صاحب ندوی، خواجہ عبدالوحید صاحب سکریٹری اسلامک ریسرچ انسٹیوٹ لاہور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان، مولانا رئیس احمد صاحب جعفری مدیر ہندوستان بمبئی، خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ خواجہ عبدالوحید صاحب نے ایک مقالہ فرد و ملت کے تعلقات کا قرآنی تصور کے عنوان سے انجمن الاصلاح میں پڑھا، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے اس اجتماع کی صدارت فرمائی۔

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے "اسلام کی تبلیغ واشاعت کی ضرورت پر" اپنے خیالات پیش کئے۔

اس موقع پر حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ نے طلبائے دارالعلوم کو مخاطب کرکے ایک پُر اثر دلنشین دلولہ آفریں اور وجد انگیز تقریر فرمائی جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

"آپ اسلئے نہیں تعلیم حاصل کر رہے ہیں کہ اس تعلیم کے بعد کوئی بڑی ملازمت یا کوئی اہم منصب حاصل کرسکیں گے۔ درحقیقت جو مسلمان اس پُر آشوب زمانہ میں اپنے بچوں کو دینی تعلیم کے لئے بھیجتے ہیں، وہ دین کی خدمت کے لئے ایک نذر پیش کرتے ہیں، پس ان کے بچوں کا فرض ہوکہ وہ اپنے والدین کی نذر اسی طرح پوری کریں جیسے حضرت اسمٰعیلؑ نے اپنے والد حضرت ابراہیمؑ کی نذر پوری کی تھی۔

آپنے فرمایا کہ اس تعلیم کے ذریعہ آپ دنیاوی حکومت میں تو کوئی بڑا منصب نہ حاصل کرسکیں گے لیکن دلوں پر حکومت کرنے کیلئے آپ راہیں کھلی پائیں گے اور حقیقی بادشاہ وہی ہو جو دلوں پر حکومت کرے۔ اس سلسلہ میں آپنے حضرت عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ پُر اثر واقعہ بیان کیا کہ وہ ایک بار کسی شہر سے گذر رہے تھے اتفاقا

ہارون الرشید بھی وہاں موجود تھا، لوگ عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف پروانوں کی طرح ٹوٹ رہے تھے، یہ منظر دیکھ کر ہارون الرشید کی لونڈی بولی کہ اصلی بادشاہت یہ ہے۔

مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کئی برس کے بعد دارالعلوم تشریف لائے تھے، آپنے انجمن الاصلاح میں ایک پُرازمعلومات مقالہ جس کا عنوان تھا "انشاپردازی کے اصول" پڑھا، آپنے الاصلاح اور دیگر طلباء سے متعلق شعبوں کا معائنہ فرمایا۔

ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور محتاج تعارف نہیں، اسلامی علوم و فنون کی تحقیق اس ادارہ کا مقصد ہے، اسکی دارالمصنفین اور ندوہ کے طلبائے قدیم کی دعوت پر اسکا اجلاس لکھنؤ میں ہوا تھا، ابتدائی مشورہ کی غرض سے حضرت الاستاد مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہٗ کی دعوت پر شہر کے سرآوردہ ذی اثر و علم دوست اصحاب ۱۰ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو دارالعلوم میں جمع ہوئے، غور و بحث کے بعد مجلس استقبالیہ کی تشکیل ہوئی، مجلس کے سکریٹری جناب حکیم شمس الدین صاحب اور ورکنگ سکریٹری مولانا محمد عمران خاں صاحب مہتمم دارالعلوم منتخب ہوئے، صدارت کا مسئلہ ابھی زیر غور ہے، عنقریب مجلس استقبالیہ کا دوسرا اجتماع پھر ہوگا۔ اسوقت صدارت کا مسئلہ آخری طور پر طے پا جائیگا۔ ادارہ کا اصل اجلاس ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ مارچ ۱۹۴۲ء کو دارالعلوم کی عمارت میں منعقد ہوگا جلسۂ عام کی صدارت کیلئے لاہور کے مرکزی دفتر اور مجلس استقبالیہ کے مشورہ کے بعد کوئی نام منتخب کیا جائے گا۔

طلبائے دارالعلوم کی انجمن الاصلاح کا ذکر ان صفحات میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہا ہے ابھی حال میں نئے سال کے عہدیداروں کا انتخاب ہوا، ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

(۱) صدر۔ مرزا صدرالدین (۲) ناظم۔ ابوالعرفان (نائب ناظم) بدرالحق (۳) مددگار ناظم میاں لئیق صاحب۔ عبدالسمیع قدوائی۔ معتمد مالیات۔ عبداللہ پھلواروی۔ معتمد صحافت۔ وحیدالرحمٰن۔ معتمد خطابت مجیب الخیر معتمد بزم ادب۔ سراج الحسن۔ معتمد دارالکتب کالان۔ احمد خالد۔ معتمد دارالکتب خورد۔ اسمٰعیل راندیری۔ معتمد دارالاخبار۔ محمد یوسف

Regd. No. A-596.

کتبخانے اور لائبریری

رکھنے والوں کے لئے

ہماری فہرستیں

نایاب تحفہ ہیں

جن میں دو ہزار سے زیادہ مؤلفین و مصنفین اردو کی کتابیں حروف تہجی کی ترتیب سے درج ہیں اور ہر کتاب کے متعلق نوٹ بھی ہے۔

قیمت کلاں سائز مجلد مع محصول ڈاک۔ ایک روپیہ

قیمت خورد سائز مجلد مع محصول ڈاک۔ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ

صدیق بک ڈپو لکھنؤ

[illegible] مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ